جہاں آباد کی گلیاں

(ناول)

اصغر ندیم سید

جہاں آباد کی گلیاں

(ناول)

اصغر ندیم سید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Syed, Asghar Nadeem
Jahan Abad Ki Gallian/ Asghar
Nadeem Syed.- Lahore: Sang-e-Meel
Publications, 2023.
296pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2023ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3478-6
ISBN-13: 978-969-35-3478-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

کہیں مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہاں آباد کی گلیاں
(میرزا رفیع سودا)

انتساب

اُن کے نام

جو تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ تین اپریل 1978ء کی ایک اُداس شام تھی۔ یہ اُداسی شاید میری وجہ سے تھی۔ نسبتاً حبس کی کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ اگر چہ موسم بہار بظاہر شروع ہو چکا تھا مگر ہمارے ہاں بہار کا موسم کبھی ہوتا تھا جب باغوں میں جھولے پڑتے تھے۔ اگر چہ وہ ساون سے منسوب تھے پھر بھی یہ موسم کم سے کم لاہور کے لارنس گارڈن میں جسے کسی مصلحت کے تحت ''باغ جناح'' تو کر دیا گیا مگر لاہور کے لوگوں نے لارنس گارڈن ہی کے نام سے ہی اُسے یاد رکھا ہوا ہے۔ وجہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ کیا غلامی کی یادگار ہے یا کچھ اور طرح کے جذبات تھے، کہہ نہیں سکتا۔ بس اُس شام کی یاد دُھندلی سی اتنی ہے کہ آسمان پر چیلیں کوے اور معلوم نہیں کون سے پرندے ہوا کی تلاش میں آسمان پر تھے۔ بہار کے موسم کا نشان تھا بھی کہ نہیں، کیا وہ موسم گزر چکا تھا، آنے والا تھا، کبھی کبھی موسموں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ اس شام بھی ایسا ہی ہوا۔ فضا میں ایک انجانی سی آہٹ تھی جو سعادت حسن منٹو کے افسانے ''تماشا'' میں تھی کہ فضا میں جہاز گزرنے کی آواز سے بچہ ڈر جاتا تھا۔ میں بھی ڈر گیا تھا۔ میرے ڈرنے کی وجوہات بہت تھیں۔ میں کہ ایک سرکاری کالج کا لیکچرر تھا اور میرا کُل آسرا وہ تنخواہ تھی جو مجھے ہر پہلی تاریخ کو مل جاتی تھی۔ وہ کیا تھی، ایک ہزار روپے جس میں سے اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم کے لئے والد کو چار سو روپے منی آرڈر کر دیا کرتا تھا اور باقی کی رقم پر لاہور میں میری بیوی کڑھتی تھی۔ وہ ٹھیک کڑھتی تھی کہ اس کے پیٹ میں ایک بچہ پل رہا تھا اور اس نے لاہور ہی میں جنم لینا تھا۔ میں شاید بھٹک گیا ہوں۔ تو اُس شام تشویش ایسے پھیلی ہوئی تھی جیسے منٹو کے پہلے افسانے ''تماشا'' میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ محض اتفاق کیوں ہے کہ ایک انسان کا کسی دوسرے انسان سے تعلق بن جاتا ہے۔ میں پہلے بچے کا باپ بننے والا تھا۔ یہ کیسا تجربہ ہوگا؟

ایک سرکاری ہسپتال میں محکمہ تعلیم کے سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے میرے پہلے بچے کی پیدائش کا بل بھی سرکاری خزانے سے جائے گا البتہ جس سرکاری ڈاکٹر کو میں نے اپنی بیوی کی حفاظت کے

لئے منتخب کیا تھا اس کی چیک اپ کی فیسیں میں اپنی جیب سے دے رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ ملتان کے ایک امیر ترین گھرانے کی بہو کے پہلے بچے کی پیدائش پر وہ اس کی بہو کو نہ بچاسکی تھی اور اسے ملتان سے لاہور سزا کے طور پر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اس ڈاکٹر کو کیوں منتخب کیا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ اس کا نام میری ماں جیسا تھا۔ توہمات کا میں قائل رہا ہوں۔ معلوم نہیں مجھ سے کیوں چوک ہوگئی۔ کوئی قدرت کا اشارہ ہو سکتا ہے۔ میری ساری زندگی قدرت کے اشاروں سے عبارت ہے البتہ معلوم بہت بعد میں ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ تو مل گیا تھا، تو ہی ناداں اسے سمجھ نہ سکا۔

وقت رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل......

مجھے اس شام یہ شعر تو یاد آیا مگر عابد علی عابد کا اپنی شاگرد سے دوسری شادی کا واقعہ شاید ہضم نہیں ہو سکا تھا۔ اس شام کا کاجل بہت پھیل رہا تھا کہ اچانک میری بیوی نے مجھے آواز دی کہ اسے درد محسوس ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے جو تاریخ دی تھی وہ بھی تقریباً آس پاس تھی۔ میں سمجھ گیا۔ فوراً اسی لیڈی ڈاکٹر کے ہسپتال میں کہ وہ سرکاری تھا، میں اسے لے کر گیا۔ تین اپریل کی شام اب رات میں بدل رہی تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھا یہ رات جو آج اُتر رہی ہے یہ کتنی طویل ہوگی۔ کم سے کم مجھے تو اس وقت سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہماری شامیں اور ہماری راتیں ہمیشہ کہیں اور طے ہوتی ہیں۔ انہیں کس حد تک جانا ہے، یہ فیصلہ اس شام نہیں ہو سکتا تھا۔

میں بیوی کو لے کر سرکاری ہسپتال پہنچا۔ شام رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ فضا بوجھل تھی۔ میری زندگی کی فضا بھی بوجھل تھی۔ رات بڑھ رہی تھی۔ مجھے ہسپتال کے برآمدوں میں بچوں کی پہلی پکار کی آواز سنائی دے جاتی تھی مگر میری توجہ تین اپریل کی شام کی طرف تھی جو بہت بے دردی سے میری طرف بڑھتی آرہی تھی۔ ہسپتال کے برآمدے اور اس کے کمرے میرے لئے ایک قیدی کی جیل کے مختلف علاقے تھے۔ رات گزر بھی رہی تھی اور پھیل بھی رہی تھی اور میں ایک بچے کا باپ بننے کی جدوجہد میں تھا۔ اصل میں تو جدوجہد میری بیوی کر رہی تھی لیکن باپ کو بھی جدوجہد ایک اور طرح سے کرنی ہوتی ہے۔ ہسپتال اور جیل میں کیا فرق ہوتا ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ کہاں مماثلت ہے کہاں نہیں ہے، اس کا پتہ مجھے آنے والے وقت میں ہونے والا تھا۔

جب آدھی رات اِدھر ہوئی اور آدھی رات اُدھر ہوئی، ایسا مجھے میر امن نے ''باغ و بہار'' میں بتایا

تھا تو میں چونکا کہ یہاں میرا من کا کیا کام۔ مگر واقعی آدھی رات اِدھر سے اُدھر ہو چکی تھی۔ تو میں کہ رات کا جاگا ہوا ایک بینچ پر نیم دراز تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی جسم سے نکلی عورت ایک نوزائیدہ ننگے منگنے بچے کو جس کی نال کٹ چکی تھی، جو بے تحاشا رو رہا تھا، جس کی کوئی شکل وصورت نہیں تھی، کو ہاتھوں میں تھام کے آ گئی اور کہا ''مبارک ہو، بیٹا ہوا ہے، انعام دو۔'' مجھے تب بھی پتہ نہ چلا کہ یہ ظالم عورت محض انعام لینے کے لئے بچے کو یہاں لے آنے کی بجائے وہاں لے جائے جہاں ایسے بچوں کو شروع کی حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ کسی اور نے کہ جو اس نرس کی ساتھی تھی، نے بتایا کہ اس کو اور ہمیں انعام دو، بیٹا ہوا ہے۔'' میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر بیٹی ہوتی تو کیا اسی طرح انعام مانگتیں تم دونوں۔ مگر یہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میری خوشی ایک طرف رہ گئی اور میں نے اسے جو جیب میں تھا، دے دیا۔ رات جلد ہی آنکھوں سے نکل گئی۔ صبح ہوتے ہی روشنی میں گھر کے لئے نکلا کہ ناشتہ کر کے کچھ آرام کر کے نوازئیدہ بچے اور بیوی کے لئے کچھ ضروری چیزیں لے کر دس بجے تک آ جاؤں گا اور ڈھنگ سے بیٹے کو دیکھ سکوں گا۔ باہر نکلا تو دھواں دھواں سی فضا میں بے اعتباری نمایاں تھی۔ سورج ابھی بس کہیں نکلا ہو گا۔ مجھے تو روشنی ہی دکھائی دی۔ جونہی سڑک پر آیا، کوئی دودھ کی گڑوی تو کوئی کھانے پینے کا برتن لے کر نکلا ہوا تھا۔ کوئی مسواک منہ میں دبائے، تولیہ کندھے پر رکھے اپنے دھیان میں گم تھا۔ یہ ہسپتال جو صرف بچوں کی پیدائش کے لئے مخصوص تھا، اندرون لاہور کے کنارے پر واقع تھا۔ اچانک ایک بزرگ نما شخص زور زور سے چیخ رہا تھا اور سر پر دو ہتڑ مار کر بین کرتا جا رہا تھا ''بھٹو کو پھانسی ہو گئی، بی بی سی کی خبر ہے، ظالموں نے بھٹو کو مار دیا۔''

مجھے تین اپریل کی شام یاد آ رہی تھی۔ مجھے یقین آ گیا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ معجزوں کی تلاش میں ہماری قوم ہمیشہ کی طرح اسی انتظار میں تھی کہ کسی عرب ملک سے رات کو ہیلی کاپٹر اڈیالہ جیل کی چھت پر اترے گا اور بھٹو صاحب کو لے جائے گا یا جیل سے کوئی سرنگ راولپنڈی چکلالہ ایئرپورٹ پر نکلے گی اور ایک جہاز اسے لے کر روانہ ہو جائے گا۔ یا جیل کی دیوار شق ہو گی اور سفید لباسوں میں فرشتے اسے لے کر سعودی عرب روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے پورا دن ہسپتال میں گزارا۔ میں نے دیکھا دن بھر لوگ مختلف جگہوں پر ٹکڑیوں میں کھڑے تھے۔ مکمل خاموشی تھی۔ بس ٹریفک کا ہلکا سا شور تھا۔ اس روز کوئی بھی گھر سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ میں خود اس منظرنامے کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا کہ عین وہ وقت جو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا وقت تھا، اس کے اِدھر یا اُدھر میرا پہلا بیٹا اور پھر اکلوتا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ میں بیٹے کی خوشی میں ضرور تھا لیکن ایک ملال جو بھٹو صاحب کے جانے کا نہیں تھا کہ میں تو ان سے صرف دو بار ملا تھا۔ ملال ان کے بعد

کے زمانے کا تھا۔ میں شاعر تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں اٹھتا بیٹھتا تھا مگر ابھی میں کسی نام ونمود کی خواہش سے الگ تھلگ تھا۔ بس ایک گھر آباد کرنے والا نوجوان لیکچرر تھا۔ میرے جیسے کئی میرے ساتھی ٹی ہاؤس کی زینت بنے ہوئے تھے۔ میں ان میں سے ایک تھا اور ہم سب کسی نئی ادبی تحریک کے نتیجے میں راتوں رات شہرت پانے کے خواب دیکھ رہے تھے اور یہ خواب بے بنیاد بھی نہیں تھا کہ ان دنوں انقلابی ترقی پسند ہمیں فرانز فینن، مارکس، پابلو نرودا، ناظم حکمت اور بریخت پڑھا چکے تھے اور ہمیں لگتا تھا پاکستان میں بھی ویسے ہی انقلاب آئے گا جیسے دنیا کے اور ملکوں میں آیا ہے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ لاکھوں لاشوں پر انقلاب کا پھریرا لہراتا ہے۔ یہ حقیقت نہ ہم سننا چاہتے تھے نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ فیض احمد فیض تو ہمارے لئے ایک رومانوی شاعر سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ تو بعد میں ان کی بیٹیوں، دامادوں اور اہل خانہ کے ساتھ متمول لاہور کی اشرافیہ انے اپنے ضمیر کا کفارہ ادا کرنے کے لئے انقلاب کا استعارہ بنا دیا ورنہ فیض صاحب تو معصوم، بس دو گھونٹ لے کر اپنی شاعری سنا کر بس اتنا کہتے تھے کہ ''بھئی ہم سے نہ انقلاب کی توقع رکھیں نہ ہم سے جدوجہد کی مشقت طلب کریں۔ بوڑھا جسم اب مار نہیں کھا سکتا۔'' یہ انہوں نے انگریزی میں کہا تھا جب ضیاء الحق کے زمانے میں لندن جانے سے پہلے ضیاء الحق سے ملاقات کر کے واپس آئے تھے۔

اب جو میں نے سوچا کہ اپنے بیٹے کا کیا نام رکھوں، ایک تو اس کی ماں نے سوچ رکھا تھا، دوسرا حالات نے مجھے نام دے دیا کہ ہو نہ ہو یہ تو ذوالفقار علی بھٹو کا دوسرا جنم ہے، کیوں نہ ذوالفقار علی نام رکھ دوں۔ اگرچہ بعد میں بھٹو صاحب کے بیٹے نے اپنے بیٹے کا نام ذوالفقار علی جونیئر رکھ دیا تھا۔ میرا حق زیادہ فائق تھا کہ یہ جنم بھٹو صاحب کی پھانسی کے وقت ہوا تھا۔ کیا مجھے اپنے بیٹے کا نام ذوالفقار علی رکھنا چاہئے یا نہیں۔ جب میں نے غور کیا تو میں نے سوچا پورے ہندوستان کی تاریخ اور اس تاریخ کی غلطیوں کا بوجھ میں اس ننھی جان پر ڈال کر زیادتی کروں گا۔ بوجھ بہت زیادہ ہے۔ دوسرا یہ خیال آیا کہ جونہی یہ بات پاک ٹی ہاؤس پہنچے گی تو کوئی نہ کوئی رپورٹر اور صحافی اس خبر کو اُچک لے گا اور وہ کہیں نہ کہیں اسے چپکا دے گا۔ ہو سکتا ہے یہ کوٹھوں چڑھے اور مجھے جیالا تصور کر لیا جائے۔ میں جیالا نہیں تھا ایک شاعر تھا جو مزاحمتی شاعری کا ہنر جانتا تھا۔ اس کے بعد وہ صرف لیکچرار تھا جسے ہزار گیارہ سو کی تنخواہ چاہئے تھی۔ ہم جو انقلاب کو اپنی شہ رگ سے قریب دیکھ رہے تھے اس میں حالات سے زیادہ ہمارے فکری اور جدوجہد پر آمادہ انقلابیوں کا ہاتھ تھا۔ ایک ترقی پسند انقلابی پی ٹی وی میں تھا۔ اس کے واقعے نے میرے جیسے رومان پرست انقلابی شاعرں جو نکمے ہونے کو اپنی شعری عظمت کی دلیل میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں، کو بہت متاثر کر رکھا

تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ نوجوان ترقی پسند اس ریلی میں شریک تھا جو فیصل آباد میں مزدوروں کے شہر سے نکلی تھی۔ ایشیا سرخ ہے کے نعرے زوروں پر تھے کہ لاہور کے مشہور انقلابی مدبر دانشور ڈاکٹر عزیز الحق نے اپنی محبوبہ جو فیصل آباد کے بڑے صنعت کار گھرانے سے تھی کے ساتھ شاید معمولی یا کسی بات پر جھگڑا ہوا اور ریلی ایشیا سرخ ہے سے شروع ہو کر اس خون کی سرخی پر ختم ہوئی جو ڈاکٹر عزیز الحق کی خودکشی سے اس ریلی میں بہہ گیا۔ اس کے بعد وہ خاتون انگلینڈ چلی گئیں ہمیشہ کے لئے اور وہ ترقی پسند انقلابی جب جلاوطن ہو کر وہاں پہنچا تو دونوں نے شادی کر لی۔ بہت دیر تک یہ شادی چلی۔ ان کی اولاد بھی ہوئی۔ اس واقعے نے ہر انقلابی نوجوان کو ایک خواب دے دیا جو انقلاب سے زیادہ خوش کن تھا۔ وہ اس رومان میں مبتلا ہو گئے کہ ان کے اس انقلابی کردار پر کوئی نہ کوئی رئیس زادی فریفتہ ہو گی اور اس کا ہاتھ تھام لے گی۔ کوئی نہ کوئی لڑکی جو بہت بڑے جاگیردار یا صنعت کار کی اکلوتی اولاد ہو گی، اس کے انقلابی فلسفے سے متاثر ہو کر گلے سے لگا لے گی اور وہ فلسفہ بھی اس کا اپنا نہیں مانگے تانگے کا ہو گا۔

اُس روز جب بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی تو پاک ٹی ہاؤس خالی تھا۔ شام کے آس پاس کچھ ادیب آئے اور ایک دوسرے سے منہ چھپائے اظہار کے عجز کی برکات سے اطمینان محسوس کرتے رہے لیکن اچانک کیا ہوا؟ کہ غصے میں ایک اول جلول موٹر سائیکل جو شاید لاہور میں اپنی قسم کی ایک تھی یا شاید ویسی ہی شہنشاہِ غزل مہدی حسن کے پاس بھی تھی وہ یا تو جرمن تھی یا جرمن فوجیں کسی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد پھینک گئی تھیں اور وہاں سے وہ غریب ملکوں کو سکریپ میں ملی تھی۔ وہ اپنی نوعیت کی دو ہی تھیں اور میں ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ جونہی سناٹے میں اس موٹر سائیکل کی آواز آئی، پاک ٹی ہاؤس کہ پہلے انڈیا ٹی ہاؤس تھا، میں بیٹھے شاعر ادیب جو میر امن دہلوی کی داستان باغ و بہار کے چار درویشوں کی طرح کفنیاں باندھے، سر نیہوڑائے اور دو زانو بیٹھے تھے۔ چونکے کہ بھونچال آ گیا ہے۔ وہ موٹر سائیکل سب جانتے تھے کہ شہرت بخاری کے پاس تھی۔ یہ چار اپریل کی شام تھی۔ میں نے بس ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہاں کا ایک چکر لگایا تھا۔ دل میں ملال کے ساتھ ایک تشویش بھی تھی کہ ایسے میں ہم ادیبوں اور شاعروں کو کیا کرنا چاہئے۔ شہرت بخاری کی موٹر سائیکل جونہی بند ہوئی، فضا نے سکون کا سانس لیا۔ پرندے جو گھونسلوں سے اڑے تھے، واپس اپنے گھونسلوں میں آ گئے۔ راہگیر اپنی اپنی سمت کو چل پڑے۔ شہرت بخاری کہ شمشیر برہنہ اندر آیا۔ ویسے بھی وہ ہر وقت اپنے خیالوں میں شمشیر لئے پھرتا تھا جو برہنہ ہی ہوتی تھی کہ اس کو ملال تھا کہ وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے وقت کیوں پیدا نہ ہوا تا کہ وہ امام مظلوم کے مٹھی بھر سپاہیوں میں

شامل ہو کر اپنے ایمان کی گواہی دیتا۔ اس لئے وہ کفارہ ادا کرنے کے لئے شمشیر بدست رہتا تھا ایسے موقعوں کے لئے۔ وہ اندر گرجتا آیا اور اس نے ایک میز پر بیٹھے شفقت تنویر مرزا اور منو بھائی کو گردن سے پکڑ لیا۔ ''کس بات کے اخبار نویس بنے پھرتے ہو۔ کہاں کے ترقی پسند اخبار کے ترجمان ہو تم۔ کل یاد ہے تین اپریل کو میں گھبرایا ہوا، بوکھلایا ہوا تمہارے اخبار ''امروز'' کے دفتر پہنچا تھا اور تم دونوں سے پوچھا تھا کہ ''کیا بھٹو کو پھانسی ہوگی'' تو تم دونوں نے ایڈیٹر حمید جہلمی کو بلایا اور پھر یہ کانفرنس میرے سامنے اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ تین اور چار اپریل کی درمیانی شب کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ محض افواہ ہے کہ بھٹو صاحب کو پھانسی ہو گی۔ آپ دونوں نے کہا تھا کہ لیبیا، سعودی عرب، شام اردن اور کوئی بھی عرب ملک بھٹو جیسے ذہین نابغہ روزگار کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے گا کہ ایسا ہیرا مسلمان دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ کہاں گئی تمہاری پیشین گوئی اور یاد رہے تم دونوں کو کہ میں نے تمہاری اس دور اندیشی پر بھروسہ نہیں کیا تھا اور خاموشی سے تمہارے دفتر سے نکل گیا تھا۔ مرزا صاحب اور منو بھائی صاحب کیا ہے آپ کی صحافیانہ نظر۔ آپ بھی رومانوی خواب میں دھوکہ کھا گئے۔ ہاں منو بھائی تم تو چُوری والے مجنوں ہو۔ تمہیں تو ہر وقت کشور ناہید کا جھولا چاہئے جس میں لاڈ سے جھولتے رہتے ہو۔ یہ تمہارا قصور نہیں، کشور ناہید کا قصور ہے جس نے تمہارے اندر کے اخبار نویس کو بجو یا گنڈ دیا بنا دیا ہے کہ تمہیں مفت کی پینے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

پورا ٹی ہاؤس شہرت بخاری کو دیکھ رہا تھا اور اس کی شمشیر کو جہاں چلنا تھا وہ چل گئی اور ظالم نے یہ واقعہ اپنی کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں من و عن لکھ بھی دیا۔

میں یہ منظر دیکھ کر پھر ہسپتال چلا گیا اور پھر وہ جیل خانہ سامنے تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہسپتال اور جیل خانے میں ایسی مماثلت کیوں ہے۔ کیا یہ کیفیت کا نام ہے یا پھر عمارت ہی اسی وضع کی ہوتی ہے۔ بہرحال یہ اس وقت بحث کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے اور بیوی کو گھر لے کر آ گیا۔ بھٹو کی پھانسی کا واقعہ لوگوں نے قبول کر لیا اور پھر ایک احتجاج جو کہ نورنی تھا، وہ اٹھا۔ وہ یہ تھا کہ بھٹو کے جیالوں نے خود کو آگ لگا کر خودکشیاں کیں۔ کچھ نے عمارتوں پر حملے کئے۔ کچھ نے سڑکوں پر نکل کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا کہ بی بی سی ریڈیو ہی نہیں، ٹیلی ویژن بھی کام آ رہا تھا۔

ایک دو دن گزرے، افواہوں نے ٹی ہاؤس کو گھیر لیا۔ جو بھٹو کے عاشق تھے وہ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک وہ جو ہمہ وقت بھٹو کی قبر کو اندر سے مہکتا اور باہر سے نور میں نہایا ہوا دیکھ رہے تھے۔ قبر پر سنا ہے سبز پوش بزرگ آدھی رات کو اترتے ہیں اور صبح تک عبادت کرتے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد

غائب ہو جاتے ہیں۔ کسی نے یہ بھی بتایا کہ رات کو فرشتے غول در غول روشنی میں اترتے ہیں اور بھٹو صاحب کو جگاتے ہیں۔ ان سے ملاقات کر کے چلے جاتے ہیں۔ کچھ نے بتایا کہ جب آدھی رات کو کوئی وہاں سے گزرتا ہے تو اسے قبر سے روشنی کی لوویں باہر کی طرف آتی دکھائی دیتی ہیں۔ کسی نے بتایا کہ عورتیں جوق در جوق منتیں ماننے کے لئے تانتا باندھے رہتی ہیں۔ کسی نے بتایا سندھ کی دھرتی پر ایک اور صوفی بزرگ نے ڈیرہ ڈال دیا ہے اور یہ صوفی بزرگ ذوالفقار علی بھٹو ہے جہاں ان کے مزار پر ہزاروں ملنگوں نے بسیرا کرلیا ہے۔ ہر جمعرات کو قوالی ہوا کرے گی اور دھمال پڑے گی۔ کچھ موسیقاروں نے صوفی کلام پر دھنیں بھی بنادی تھیں اور کچھ نے باقاعدہ گائیکی کا اسلوب بھی وضع کر لیا تھا۔ دوسرا عاشقوں کا گروہ غصے میں تھا۔ ٹی ہاؤس میں پہلے کبھی کبھی اعجاز بٹالوی آیا کرتا تھا۔ باقاعدہ ادیب بھی تھا اور بہت مطالعہ رکھتے ہوئے ادب پر بات کرتا تھا۔ اس واقعے کا سارا بوجھ اعجاز بٹالوی پر ڈال دیا گیا کہ وہ استغاثہ کا وکیل تھا۔ عاشقوں کے اس گروہ کا غصہ بٹالوی پر اتر رہا تھا۔ اُن سب کا یہ ماننا تھا کہ بھٹو کو پھانسی اعجاز بٹالوی نے دلوائی ہے۔ اکثر نے تو اعلان کر دیا کہ اسے ٹی ہاؤس میں قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ اُس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ کچھ نے جن میں انتظار حسین بھی شامل تھے، بٹالوی کو رجعت پسند ادیب ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ کچھ عاشقین ایسے تھے جو ضیاء الحق کو کسی پراسرار بیماری سے ہلاک ہونے کی پیشین گوئی میں مبتلا تھے۔ کچھ تو باقاعدہ خودکش حملے کی تیاری کر رہے تھے کہ کیسے اسے ہلاک کیا جائے۔ ایسے میں ایک شاعر نے فوری جذبات میں بے شمار شاعروں کی نظمیں بھٹو کی شہادت کے نام پر لکھوالیں۔ دو نظمیں فوری طور پر میں نے لکھ دیں اور اگلے دن کتاب ''خوشبو کی شہادت'' شائع ہوگئی اور ساتھ ہی اُس پر پابندی بھی لگ گئی۔ جس سے اس کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ کتاب راتوں رات لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئی۔

پاک ٹی ہاؤس کی رونقیں آہستہ آہستہ آباد ہونے لگیں۔ قیاس آرائیوں اور جذباتی مکالموں کا گویا مقابلہ چل پڑا۔ اُدھر صحافیوں کو کوڑے لگا دیئے گئے۔ سیاست دانوں، اداکاروں، ادیبوں، شاعروں اور جیالوں سے جیلیں بھر دی گئیں۔ کچھ احتیاط پسند مصنّفین نے پاک ٹی ہاؤس آنا ترک کر دیا اور گھروں میں اپنے بستروں میں نیند سے پہلے کپکپانے لگے۔ اپنی بیگمات سے کہا کہ سرکار میری تلاش میں ہے، مخبروں نے خبر کر دی ہے، رات کو دروازے پر کوئی آئے تو دروازے پر نہیں جانا اور اگر کوئی فوجی جیپ آ جائے تو اندر سے دیکھ کر مجھے تہہ خانے میں یا صندوق میں ڈال کر بند کر دینا۔ بعض ادیبوں اور شاعروں نے مشہور کر دیا کہ فوجی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد کوئی ادیب اور شاعر جو لکھے اسے مارشل لاء کے

ہیڈ کوارٹر سے چھپوانے کے لئے درخواست دینا پڑے گی۔ الغرض بہت کچھ ہو رہا تھا۔ ایسے بھی ادیب تھے جنہوں نے مخصوص مذہبی جماعت جو ضیاء الحق کی چہیتی تھی، کی سبز ٹوپی پہن لی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ احتیاطاً جیب میں ڈھیلا بھی ہوتا تھا اور وہ ٹی ہاؤس آ کر بیٹھتے بھی تھے۔ انہی سے باقی ادیب ڈرنے لگے تھے کہ کہیں مخبری کا فریضہ تو انجام نہیں دے رہے۔

اُدھر تو یہ چل رہا تھا اور اِدھر میرے گھر میں نومولود بیٹے کی دیکھ ریکھ میں بیوی کیساتھ میں بھی ہمہ وقت شامل رہتا تھا۔ بچہ روز نئی عادت اور نئی شکل دکھا رہا تھا۔ جم کر میں اس کے نین نقش تو جہ سے نہیں بٹھا پاتا تھا کہ ایک دن...... پاک ٹی ہاؤس پہنچا تو معلوم ہوا رات کو فلاں فلاں ریڈیو، ٹی وی اور اخبار کے مشہور لوگوں کو فوجی گاڑیاں اُٹھا کر لے گئی ہیں۔ ساتھ میں یہ بھی خبر ٹھہری کہ اب ادیبوں اور شاعروں کی شامت آنے والی ہے۔ ادیبوں سے زیادہ خطرے میں شاعر ہوتا ہے کہ شاعر کی آواز جلدی عوام تک پہنچتی ہے۔ کچھ شاعروں نے اپنے بارے میں خود خبر پھیلا دی تھی کہ شہر میں میری ڈھنڈیا پڑی ہے مگر کسی سے نہیں ڈرتا اس لئے پاک ٹی ہاؤس آتا ہوں۔ ہے کسی میں جگرا جو میرے جیسے مقبول شاعر پر ہاتھ ڈالے۔ اس طرح کے کئی بیانات روزانہ گردش کرتے تھے۔ ایسے میں ملک کی فضا بوجھل سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کوڑوں کے ساتھ پھانسیاں بھی شروع ہو گئی تھیں جن میں پپو کے قاتلوں کو سرعام انتظار حسین کے گھر کے پاس کیمپ جیل کے چوک میں پھانسیاں دی گئی تھیں۔ جس جیل میں بھگت سنگھ کو انگریزوں نے پھانسی دی تھی۔ پپو کے قاتلوں نے پپو ایک بچے کو گلا گھونٹ کے مار دیا تھا۔ اس دن ایک میلہ لگا تھا۔ پورا لاہور یہ منظر دیکھنے کو اُمڈ پڑا تھا اور یہی فیسٹیول ضیاء الحق نے متعارف کرا دیا تھا۔ اُس دن اُس ہجوم میں دہی بڑے، پٹھورے چنے اور گول گپوں کے ساتھ خوانچہ برداروں کے ساتھ ریڑھی پر طرح طرح کا رزق کمانے والوں نے اپنا ٹھیلہ بھی لگایا اور اُس کی بکری بھی ہوئی۔ اس فیسٹیول نے لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں ڈرا دیا تھا اور یہی اُس کا مقصد تھا۔ منیر نیازی نے کب یہ شعر کہا، معلوم نہیں مگر اس کا مطلب اُسی دن سمجھ میں آیا:

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو اُن کے گھر میں ڈرا دینا چاہیئے

یہ وہ دن تھے کہ تاریخ میں شاید ان دنوں کو گمشدہ دنوں سے تعبیر کیا جائے۔ سکول کالج اور یونیورسٹیاں بند تھیں کہ بھٹو کی پھانسی پر کسی بھی قسم کے ردعمل کا راستہ بند رکھا جائے۔ صحافت لڑکھڑا رہی تھی۔ لوگ گھروں میں بند رہنے لگے۔ شام سے پہلے شام کا سناٹا سڑکوں پر آوارہ ہوا کی مانند لہریں لے رہا تھا۔

اِکا دُکا گاڑی گزر جاتی تھی اور پھر رات کے کسی پہر کوئی اخباری رپورٹر، اوسط درجے کا صحافی، ٹوٹا پھوٹا شاعر، گلوکار، فن کار یا معمولی درجے کا ادیب مفت کی سستی شراب پی کر موٹر سائیکل یا کسی کی سواری میں جب سڑک پر آتا تھا تو پولیس کے لٹھ بردار ناکہ لگا کر منہ سونگھتے پھرتے تھے۔ ایسے میں روزانہ کئی اس قماش کے لوگ حوالات کی ہوا کے ساتھ ایک آدھ چھوٹی موٹی خبر کا حصہ بھی بن جاتے تھے۔ یہ بھی روز کا معمول تھا۔ جو ذرا پیسے والے ہوتے تھے، دے دِلا کے اُسی پولیس کی نگرانی میں گھر پہنچائے جاتے تھے۔ ایسی خبریں روزانہ کا معمول تھیں۔ اس طرح کے ایک گرفتار ہونے والے شاعر نے بیان بھی دیا کہ بھٹو صاحب کو شرابیوں کی آہ لگی ہے کہ انہوں نے پاکستان میں شراب پر پابندی لگا دی تھی اس کی وجہ سے ایسے انجام کو پہنچے۔

میں اس ساری صورت حال سے الگ تھلگ ضرور تھا مگر اپنی شاعری اور ٹی ہاؤس سے غافل نہیں تھا۔ انہی دنوں میں نے دنیا کی بہترین سوشلسٹ شاعری کو اردو میں ترجمہ کیا تاکہ مزاحمت کرتے ہوئے موجودہ ضیاء حکومت کے خلاف اپنے غم وغصہ کا کوئی تو راستہ کھولا جا سکے۔ نہیں معلوم تھا یہ راستہ کسی اور سمت میں کھلنے والا ہے۔

....

یہ ایک معمول کا دن تھا۔ بیٹے اور بیوی کو گھر آئے چند دن ہو چکے تھے۔ عزیز رشتہ دار جو قریب میں تھے، مبارک سلامت کے لیے آ رہے تھے۔ گھر میں مٹھائیوں کے ڈبے اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔ خبریں عجیب طرح کی آ رہی تھیں۔ سندھ میں حالات بہت خراب ہو رہے تھے۔ بعض علاقوں میں کرفیو کی خبریں بھی تھیں۔ میرے پاس تو ریڈیو بھی نہیں تھا کہ بی بی سی کا سہارا لیتا، بس جو اخبار میں آ جاتا، حکومت ہی کا مؤقف ہوتا لیکن اس سے جھانکتی ہوئی مزاحمت اور بغاوت تو میں سونگھ ہی لیتا تھا۔ بڑے بڑے صحافی تو گرفتار ہو چکے تھے۔ خواتین بھی اُن میں شامل تھیں۔ سندھ اور بلوچستان میں حالات خراب تھے۔ کئی لوگ مارے بھی گئے اور زخمی تو لاتعداد تھے۔ کبھی کبھی لگتا تھا یہ مزاحمت رنگ لے آئے گی اور فوجی حکومت انتخابات کرا کے الگ ہو جائے گی۔ ایک تاریخ تو نوے دنوں کے بعد کی وعدے کے طور پر موجود بھی تھی۔ پنجاب میں دو چار جیالوں نے خود کو آگ لگا کر خودکشی ضرور کی لیکن سندھ جیسا احتجاج سڑکوں پر نہ ہو سکا۔ جنہوں نے احتجاج کی باگ ڈور سنبھالنی تھی، سنا ہے انہوں نے رضا کارانہ طور پر گرفتاریاں دے دیں اور یہ بھی خبر ملی کہ جیلوں میں سب کو ایک ساتھ رکھا جا رہا ہے۔ اس لئے جیلوں میں بہت رونقیں لگی ہوئی ہیں۔ گویا سب پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ گھروں سے بریانی کی دیگیں جاتی ہیں۔ انقلابی ترانے گائے جاتے ہیں۔ تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ دھمالیں بھی ڈالی جاتی ہیں اور شعر و شاعری کے ساتھ مارشل لاء سے متعلق تازہ ترین لطائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ پاکستانی فلموں کے ایک مشہور اداکار حبیب کو حبیب جالب کے شبے میں گرفتار کر لیا گیا اور جب اُس نے جیل میں یہ ماحول دیکھا تو خاموشی اختیار کر لی اور کسی کو نہ بتایا کہ میں حبیب جالب نہیں ہوں اور خاموشی سے اس پکنک سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ایسے میں باہر رہ جانے والے انقلابیوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے سوچا وہ اس صحبت اور تجربے سے کیوں محروم رہیں۔ ان کے وارنٹ نہیں بھی تھے تو وہ بھی رضا کارانہ گرفتاریاں پیش کر کے اُن سینہ چاکانِ چمن کے ساتھ جا ملے۔ لاہور

کی اس جیل میں ایک مشہور فلم سٹار بھی تھے جو بعد میں ضیاء الحق کے بچوں کے ماموں بن گئے تھے۔ سننے میں یہ آیا بلکہ اخباروں میں بھی نکلا کہ ان کے گھر سے روزانہ بریانی کی دیگ آتی تھی جس کے نیچے ولایتی وہسکی کی دو بوتلیں ہوتی تھیں جو جیل میں موجود ایک خاص وی آئی پی قسم کے انقلابیوں اور اس اداکار کے خاص دوستوں کے لئے ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک دن پکڑے گئے تو ان کو میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔ گرمیوں اور مچھروں کی تاب نہ لاتے ہوئے معافی نامہ لکھا اور سرکار دربار میں رتبہ پایا۔

میں خاموشی سے نظمیں لکھ رہا تھا اور مزاحمتی شاعری کے تراجم بھی کر رہا تھا۔ کئی فوری طور پر نئے رسالے اسی مقصد سے نکل رہے تھے۔ ان میں یہ شاعری چھپ رہی تھی کہ ایک دن، رات کا وقت ہوگا، شام سے ہی گھر کے دروازے بند کر دیئے جاتے تھے۔ گھروں سے مختلف کھانے پکانے کی خوشبوئیں اُس آبادی میں گھر گھر گھوم رہی ہوتی تھیں۔ اس وقت گھر میں ٹیلی فون بھی نہیں آیا تھا۔ گو کہ درخواست گذاری تھی اور سنا تھا بلکہ تجربہ تھا کہ کبھی کبھی بیس سال لگ جاتے ہیں باری نہیں آتی اور اگر کوئی سرکاری سفارش ہو تو فوری طور پر بھی لگ سکتا ہے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی سرکاری چابی نہیں تھی اس لئے شام ہی سے اپنے معمولات سے گزر کر جن میں اپنے بیٹے کے لئے دودھ بنانا، اُس کی نیپی تبدیل کرنا اور اپنی بیوی سعدیہ کا ہاتھ بٹانا اور اگر کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو کتاب اٹھالیتا۔ دنیا بھر کے انقلابیوں کی تحریریں پڑھتا۔ انقلاب کے فلسفے میں چھپی ہوئی بے ایمانیوں تک پہنچتا۔ پھر کچھ انقلابیوں کی جیلوں میں سرگزشت جو اردو تراجم کے ذریعے مجھ تک پہنچتی تھیں، میں وہ پڑھ رہا تھا۔ میرے سامنے جیلیں، ٹارچر سیل اور فاشسٹ حکومتوں کے ہتھکنڈوں پر مشتمل یادداشتیں بھی تھیں۔ اٹلی، جرمنی، فرانس، روس اور پولینڈ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کے اس طرح کے واقعات کے نتیجے میں لکھا گیا ادب میرے پاس کسی نہ کسی ذریعے سے موجود تھا اور وہ تراجم یا انگریزی میں لکھی گئی کتابیں میری میز جو کہ بہت معمولی نوعیت کی تھی، پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہیں میری نظمیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ گھر میں کوئی تہہ خانہ تو تھا نہیں کہ جہاں انقلابی ادب چھپا کے رکھا جاتا۔ میں نے بہت جگہوں پر پڑھا کہ دنیا کے ایسے ادیب جو انقلاب میں حصہ دار تھے، ان کے گھر بھی بے حد معمولی تھے۔ وہ لیمپ کی روشنی میں لکھتے تھے۔ کبھی کبھی میز بھی نہیں ہوتی تھی اور جب ان کے گھروں پر چھاپہ پڑتا تھا تو سب کچھ ایک ہی کمرے سے برآمد ہو جاتا تھا۔ وہ دنیا کے عام ترین لوگ ہوا کرتے تھے۔ تاریخ نے ان کے نام بڑے کر دیئے تھے کہ وہ حقیقت میں بھی بڑے تھے۔ تاریخ نہ ہوتی تو ان کا مقام کسی کو معلوم نہ ہو پاتا۔ میں زیادہ تر کتابیں اپنے بزرگ ادیبوں سے لے کر آتا تھا جو میرا شوق دیکھ کر اپنی قیمتی کتابیں دے

دیتے تھے جو میں پڑھ کر لوٹا دیتا تھا۔ یہ بڑے لوگ لاہور میں اس وقت موجود تھے جن میں صفدر میر، صلاح الدین محمود اور انیس ناگی تھے۔ میں ان کا ایک ادنیٰ سا چاہنے والا تھا۔ ان میں سے کچھ کتابیں میری میز پر رکھی تھیں۔ ابھی میں اپنے بستر میں جانے کا سوچ رہا تھا میرا بیٹا کب کا نیند میں جا چکا تھا۔ وہ تو کپڑوں میں لپٹا کر جکڑ کر سلایا جاتا تھا۔ وہ ایک گڑیا کی مانند لیٹا تھا۔ میں نے کسی گڈے کو اس طرح سوتے نہیں دیکھا اس لئے گڑیا سے تشبیہ دے دی۔ سعدیہ بس اپنے بیٹے میں مگن اس کے ساتھ لیٹی تھی۔ ہماری کچھ زیادہ بات گھر کے مسائل پر نہیں ہوتی تھی کہ گھر کے سادہ سے مسائل تھے۔ ابھی سعدیہ کو آرام کی ضرورت تھی اور میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہا تھا۔ سعدیہ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں، کیا لکھ رہا ہوں۔ ٹی ہاؤس میں کیا چل رہا ہے اور ملک میں ہم جیسے سوچنے والوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں بھی اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہم آنے والے دنوں کے خوابوں میں رہنا سیکھ رہے تھے۔

یہ کوئی گیارہ بجے کے آس پاس کا عمل ہوگا کہ دروازے سے بیل بجی۔ گھر کی گھنٹی کچھ ایسی تھی کہ جب بجتی تھی، زلزلہ آ جاتا تھا اور گھر بھر میں بجلی دوڑ جاتی تھی۔ سستی قسم کی گھنٹیاں اس زمانے میں ایسی ہوتی تھیں۔ بعد میں موسیقی یا ملائم قسم کی کال بیل ایجاد ہوئیں۔ اب میں چونکا۔ اس وقت اس طرح کے محلے میں کون آسکتا ہے۔ ہمارا کوئی رشتہ دار ایسا نہیں تھا جو بہت قریب رہتا ہو۔ سعدیہ چونکی۔ میں نے اسے مطمئن کیا کہ کوئی بھولا بسرا ہوگا، میں پوچھ لیتا ہوں۔ میں دروازے پر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ باہر بھاری گاڑیاں اپنی فرنٹ لائٹس کے ساتھ غرغرا رہی ہیں۔ اب میں نے اندر سے پوچھا "کون ہے۔"

"دروازہ کھولیں۔ ہم انٹیلی جنس سے ہیں۔"

"مگر آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے میرا نام لیا اور کہا کہ دروازہ کھولو نہیں تو ہم توڑ بھی سکتے ہیں۔ تو مجھے تب بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ یہی سوچا کوئی معلومات لینی ہوں گی۔ سو میں نے دروازہ کھول دیا۔ مسلح پولیس کے ساتھ کچھ کمانڈو اور ایک دو فوجی جو پیچھے تھے، داخل ہو گئے۔ میرا گھر ہی کیا تھا، معمولی سا کمرہ جہاں ہم بیٹھتے تھے۔ پھر بیڈروم اور پھر کچن اور کھانے کی جگہ...... وہ داخل ہوئے اور ایک نے مجھے قابو کیا، ہاتھ باندھے، منہ پر ٹیپ لگائی، آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ سعدیہ کی چیخ نکلی۔ میرا بیٹا اس آواز سے ذرا سا پہلو بدل کر پھر اپنی حالت میں آ گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مجھے فیض احمد فیض کے گھر پر اس طرح کی رات کے چھاپے کا منظر یاد آ گیا جو راولپنڈی سازش کیس سے متعلق تھا۔ جب فیض صاحب کے ماڈل

ٹاؤن والے گھر اسی طرح پولیس اور فوج کے لوگ داخل ہوئے تھے اور پھر مجھے پابلو پکاسو پر جرمن فوج کے فرانس میں چھاپے کی روداد یاد آ گئی جس میں جب پکاسو نے اپنے گاؤں گورنیکا پر جرمن فضائی حملے کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کو کینوس پر احتجاج کرتے ہوئے پینٹنگ بنائی تو جرمن فرانس میں اس کے سٹوڈیو پر اسی طرح رات کی تاریکی میں حملہ آور ہوئے تھے اور جب وہ پینٹنگ جس کا نام ''گورنیکا'' رکھا گیا تھا، دیکھی تو انہیں کچھ خاص سمجھ نہ آئی کہ اس کینوس پر آسمان کی طرف چیختے ہوئے ایک بیل تھا، ایک گھوڑا، ایک عورت اور شاید ایک بچہ تھا۔ ان سب کی چیخیں کینوس سے باہر آ رہی تھیں۔ شاید نازی جرمنی کے فوجیوں نے بھی سن لی ہوں گی اس لئے انہوں نے پوچھا ''پکاسو یہ تصویر تم نے بنائی ہے۔''

پکاسو نے جواب دیا ''نہیں یہ تصویر تم نے بنائی ہے۔''

اب میں نہ تو فیض احمد فیض تھا نہ پکاسو تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک معمولی شاعر تھا جسے اپنی شاعری پر اتنا اصرار بھی نہیں تھا۔ میں تو پکاسو کی تصویر میں موجود جانوروں اور انسانوں کی طرح چیخ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے میز پر رکھی سب چیزیں اٹھا کر قبضے میں لیں۔ میری تو آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ میری بیوی بولی ''آپ کون لوگ ہیں؟''

انہوں نے جواب نہ دیا بس اتنا کہا ''ہم اسے لے کر جا رہے ہیں، کچھ کپڑے اس کے ساتھ دینے ہیں تو دے دیں۔''

اس نے کچھ کپڑے ان کے حوالے کیے اور پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔ اپنی آواز کو دبانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ ایسا مجھے محسوس ہوا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک گاڑی میں ڈالا اور وہ سب گاڑیاں غراتی ہوئی اس محلے سے نکل گئیں۔ معلوم نہیں پاس پڑوس کے گھروں نے کیا سمجھا ہوگا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ اپنے سے کئی گنا دشمن سے لڑنے والی فوج ایک عام سے شاعر سے کیوں ڈر جاتی ہے۔ کیا وہ شاعر سے ڈرتی ہے یا شاعر کے الفاظ سے یا اس کی مزاحمت سے۔ مستقبل کی کوئی تصویر اس وقت میرے دھیان اور گمان میں نہیں تھی۔ بس گزرے لمحے کا ایک جھونکا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پورے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ وقت کا نہ اب کوئی تصور رہا تھا نہ کوئی احساس، کیا فرق پڑتا ہے اب دن ہو کہ رات۔

اچانک گاڑیاں رک گئیں۔ مجھے اترنے کا حکم ہوا۔ میں اترا تو مجھے پکڑ کے وہ اندر کہیں لے گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کیا جگہ ہے۔ ایک آواز آئی ''اوے کینوں چک کے لے آئے او۔'' اور پھر کوئی آواز نہ آئی۔ مجھے کسی جگہ بٹھا دیا گیا۔ کھسر پھسر سے محسوس ہوا یہ عارضی جگہ ہے۔ مجھے کہیں اور لے جانا

ہے۔ کچھ دیر ایسے ہی خاموشی میں گزری تو پھر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی اور شاید کسی اور کو میری طرح اٹھا کر لایا گیا تھا اور اب ان کی آپس میں گفتگو سے یہ لگ رہا تھا کہ ہمیں رات کو کہاں رکھا جائے گا۔ بعد میں قیاس کیا تو شاید وہ قریبی تھانہ تھا۔ ایسا تھا تو پھر وہ پرانی انارکلی کا تھانہ ہی ہو سکتا تھا۔ وہ کسی سے رابطہ کر رہے تھے۔ اس میں کچھ وقت گزرا۔ اب رات کا کون سا پہر تھا اس حوالے سے تو کچھ سوچنا بھی بے کار تھا۔ اب کوچ کا حکم ہوا۔ شاید ہمیں جہاں رکھنا تھا اس کی اجازت مل گئی تھی۔ پھر گاڑیاں روانہ ہوئیں۔ پھر ایک پھاٹک کھلا، اندر گاڑیاں داخل ہوئیں، آنکھوں پر پٹی کی وجہ سے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں اتار کر کئی جگہوں سے گزار کر ایک کمرے میں لایا گیا۔ مجھے اور میرے ساتھ جو کوئی تھا، دونوں کو الگ الگ سیل میں ڈال دیا گیا۔ اب آنکھوں سے پٹی اور منہ سے کپڑا کھول دیا گیا۔ وہاں فرش پر ایک چٹائی، دو اینٹیں اور مٹی کا گھڑا اور پلاسٹک کا گلاس رکھا تھا۔ کچھ کہے سنے بغیر وہ چلے گئے اور باہر موٹا تالا لگا گئے۔ ایک پولیس والا باہر ہمارے پہرے پر تھا۔ میں نے پانی پینے کے لئے جب گھڑا انڈیلنا چاہا تو مچھروں کا ایک جھرمٹ باہر نکلا اور سیٹیاں مارتا ہوا بکھر گیا۔ بکھر کہاں گیا، میرے سر پر منڈلانے لگا۔ میں نے جائزہ لیا تو کسی جیل یا حوالات کا حصہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مکمل خاموشی تھی۔ لگتا تھا کسی عمارت میں اس طرح کے کچھ سیل خاص طور پر بنائے گئے ہیں۔ اب ذرا غور کیا تو کونے میں ایک ڈبلیوسی موجود تھا رفع حاج ت کے لئے۔ اس کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ میں نے اسے نہیں ہلایا کہ مبادا اس ٹینکی میں پانی ہو اور میرے ایسا کرنے سے فلش ہو جائے اور دوبارہ اس میں پانی بھرنے کا انتظام نہ ہو۔ اس میں بھی مچھروں کا بسیرا تھا۔ یہ موسم مچھروں کا ہی ہوتا ہے اور پھر ایسی جگہ پر مچھر نہ ہوں گے تو کہاں ہوں گے۔ اب میں نے آواز دی ''کوئی ہے۔'' کوئی نہ آیا تو میں نے پھر آواز دی۔ پھر ایک نیند کا مارا باوردی پولیس کا کانسٹیبل رائفل لٹکائے آ گیا۔ ''بولنے کا حکم نہیں ہے۔''

''تم کہاں کے ہو؟''

''بتانے کا حکم نہیں ہے۔''

''دیکھو میں کوئی مجرم نہیں، مجھے غلطی سے پکڑ کر لائے ہیں۔''

''سارے مجرم اسی طرح بولتے ہیں۔''

''اچھا یہ کون سی جگہ ہے؟''

''میں اس جگہ پہلی واری آیا ہاں۔''

''کس تھانے سے ہو۔''

''بولا ناں بات کرنے کا آرڈر نہیں ہے۔''

''اچھا یہ جگہ کون سی ہے؟''

''او تینوں دسیا ناں، میں پہلی واری ادھر تعینات ہوا ہوں بس آج کی رات کے لئے۔''

''صبح کیا ہوگا۔'' میں نے غیر ارادی جملہ بول دیا۔

''سویرتوں بعد تساں نوں شاہی قلعہ میں شفٹ کرنا ہے۔ایسی بات وہ کہہ رہے تھے۔''

اب مجھے ساری بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ عارضی بندوبست تھا۔ ہماری اصل منزل شاہی قلعہ ہے۔ مجھے حسن ناصر یاد آ گیا اور کئی نام۔ کئی گمنام لوگ، کئی کردار، ایک تاریخ عقوبت خانوں کی میرے سامنے کھل گئی۔ میرے جسم سے ایسی جھرجھری آئی کہ جسم کانپنے لگا۔ بات بہادری یا بزدلی کی نہیں تھی، یہ ایسا مقام تھا جہاں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ آپ کو برداشت کرنے کی شکتی آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ابھی میرے لئے سوچنے کے کئی مقامات تھے۔ میں تو بس سوچ رہا تھا یہ رات کیسے میری زندگی میں آ گئی۔

''چنگا میں ڈیوٹی پہ ہاں، جُلساں۔''

''ٹھہرو، یہ بتاؤ یہ جگہ جہاں ہم ہیں، تم کچھ بتا سکتے ہو اس کے آس پاس کیا ہے؟''

''میرے کوتوں معطل کراسیں۔ چلو معطلی تاں اسانی کئی وار ہوئی اے، اک وار فیر سہی۔''

''پنڈی وال ایں۔''

''ناں تسانوں کس راں پتہ لگیا ما پنڈی وال آں۔ پکا پوٹھوہاری۔''

''تاں وت سنگتی کجھ تاں ماڈا خیال کرسی کہ ناں۔''

''چنگا بول...... ہن ماکوں سنگتی بول ڈتا تاں بول ڈتا، بول کی پچھنا ایں۔''

''بس اے ڈس جو میں کتھاں ہاں۔''

''او بندے دا کھر، میں تسانوں کی آکھاں، او تساں جیل میں ہو۔''

''میرا مطلب یہ جگہ کہاں ہے؟''

''ناں تیرے نوں پتہ لگ ویسی تاں توں اے جندرا توڑ کے نس ویسیں۔''

''نئیں یار سنگتی، میں اینویں پچھ ریاں۔''

اب ساتھ کے سیل سے آواز آئی۔

''تم جو کوئی بھی ہو، میں یہ ساری بات سن رہا ہوں۔ ساتھ کے سیل میں ہوں اور میرا نام، خیر نام چھوڑو، میں صحافی ہوں۔ تمہارے ساتھ مجھے اٹھا لائے ہیں۔ چونکہ صحافی ہوں تو سُنوا سے کیوں تکلیف دے رہے ہو، یہ غریب تو خود سسٹم کا قیدی ہے۔ ہم اس وقت لارنس گارڈن کے سامنے مال روڈ پر نہیں ہیں، ہم گورنر ہاؤس کے سامنے جو سڑک کیمپ جیل اور شادمان کی طرف نکلتی ہے اس پر محکمہ اطلاعات کے ایک بہت بڑے دفتر کے ایک حصے میں ہیں۔ جہاں یہ سیل خاص طور پر بنائے گئے تھے انگریز کے زمانے میں۔ یہ سیل صرف دو دفعہ استعمال ہوئے تھے اور اب تیسری دفعہ ہم دونوں پر استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں مجھ تک یہ بات پہنچا رہا تھا......

اب میں بولا ''پہلے کن قیدیوں کو یہاں رکھا گیا تھا۔''

''یہ ہمارے ایک بزرگ صحافی کی تحقیق تھی جو اس نے مجھے بتائی تھی اور اسی کے نقش قدم پر چل کر تمہاری طرح میں یہاں پہنچا ہوں۔ تم کون ہو؟''

میں نے نام بتایا تو اس نے کہا ''میں تمہیں نہیں جانتا، میرا نام یہ ہے۔''

میں نے کہا ''میں بھی تمہیں نہیں جانتا۔''

اب ایک خاموشی کا وقفہ آیا تو وہ رنگروٹ کانسٹیبل بولا:

''تساں نی بکواس بند کرسو یا میں گولی چلاواں۔''

'اوگرائیں......غصہ نہ کر، اساں پردیسی آں، کل اساں شاہی قلعے اڈ جاناں۔''

اس پر وہ سپاہی خاموش ہو گیا اور ہمارے دونوں کے سیل کے پاس آ گیا۔

''اویارا، اساں تاں بس ڈیوٹی دے غلام آں، اساں تاں پھانسیاں وی ڈھٹیاں ہن۔''

''اچھا یار پردیسی، رات وی تاں کٹنی اے۔''

''تو میں تمہیں بتا رہا تھا۔''

اب پھر وہ صحافی بولا۔ جیسے وہ مجھے ان دو لوگوں کے نام بتانا چاہتا تھا جن کو یہاں رکھا گیا۔ یہ بھی گویا تاریخ کا کوئی راز ہی تھا۔

''ہاں بتاؤ۔ یہاں کن دو لوگوں کو رکھا گیا۔''

''یہاں سے آگے ایک چوک آتا ہے۔ وہاں تک کیمپ جیل تھی اور انگریزوں نے پھانسی سے پہلے بھگت سنگھ کے لئے یہ جیل بنوائی تھی تا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ بھگت سنگھ کہاں ہے۔ انہیں خطرہ تھا

عوام حملہ کر کے اسے رہا نہ کرا دیں۔ اسی طرح لاہور میں جب بھٹو صاحب کا ٹرائل ہوا تھا تو انہیں بھی کچھ دنوں کے لئے یہاں رکھا گیا تھا۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ تاریخ کا دریچہ کھل گیا۔ اس میں سے بھگت سنگھ اور ذوالفقار علی بھٹو آ کر بیٹھ گئے۔ خاموشی سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں کہیں سے بھی ان کی روایت کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ لارنس گارڈن سامنے تھا جہاں ہر صبح میں ہر طرح کے پرندوں سے باتیں کرتا تھا۔ کچھ ہیولے، کچھ کٹے پھٹے امیج خواب اور نیند کے درمیان گھومتے رہے۔ بہت کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔ میں زندہ بھی تھا کہ نہیں، کچھ احساس نہیں رہا تھا۔ مچھروں کو میرے خون پر اپنی بھوک مٹانے کا پورا اختیار تھا۔ سوچتا رہا کوئی ایسا منصف ہو جو میرا کیس سنے جو شاعری پڑھتا ہو یا اس کے خاندان میں کوئی شاعر ہو تو شاید وہ میری مدد کر سکے۔ کاش میں دیگر صحافیوں، سیاسی کارکنوں، فن کاروں اور ادیبوں کے ساتھ گرفتار ہو جاتا تو میں ایک عام قیدی ہوتا۔ مجھے لگا میں نازی جرمنی کی قید میں ہوں اور ان کے کسی ٹارچر سیل میں ہوں۔ ایک بار میں نے یونہی غیر ارادی طور پر آواز دی:

''مسٹر صحافی۔''

کوئی جواب نہ آیا اور پھر میں نے محسوس کیا کہ مچھر مجھ پر حملہ کر کے تھک گئے ہیں یا میرا خون چوسنے کے بعد غنودگی میں لڑکھڑاتے ہوئے اِدھر اُدھر گر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیا وقت ہوگا کہ مجھے سلاخوں کے اُس پار کہیں سے روشنی پھوٹتی دکھائی دی۔ پرندوں کا شور بھی اب اندر آ رہا تھا۔ لارنس گارڈن کی وجہ سے پرندوں کے شور کی سمجھ آ رہی تھی اور بھی ہو سکتا ہے جس عمارت میں یہ سیل بنائے گئے تھے یہاں بھی بہت سے درخت ہوں۔ صبح دم نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ آنکھ لگ گئی۔ بڑی وجہ مچھروں کا خون پی کر مدہوش ہو جانا ہی مجھے معلوم ہوا۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ کوئی بھی اب وردی میں نہیں آتا تھا۔ سادہ لباس وردی والوں نے پہن رکھے تھے۔ وردی کوئی بھی ہو صرف وہاں آتی تھی جہاں مجھے باور کرانا ہوتا تھا کہ تم نے کس ادارے کو للکارا ہے جبکہ میں نے تو کسی ادارے کو نہیں للکارا تھا۔ ایک شاعر جو سوچتا ہے وہ لکھ رہا تھا۔ شاعر کو جب محسوس ہو کہ دشمن چند باغیوں کے شبے میں پورے جنگل کو آگ لگا دے گا تو نقصان باغیوں کا نہیں جنگل اور اس کے جانوروں کا ہوتا ہے۔ شاعر تو بس اتنی سی بات سمجھانے کے لئے لکھتا ہے۔ یا وہ یہ لکھتا ہے کہ غصے کی فصل جب پک جاتی ہے تو پھر اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس کا پھل تو اتارنا ہی پڑتا ہے۔ شاعر تو یہ بھی کہتا ہے کہ اے محافظ تیری خاردار تار اب مجھے چبھنے لگی ہے۔ میرے جسم پر اس نے خراشیں ڈال دی

ہیں۔اے محافظ تو ہماری حفاظت خاردار تاروں سے کر رہا ہے اور یہی تاریں ہمارے جسم میں پیوست ہو رہی ہیں۔اس سے زیادہ شاعر اور کیا کہہ سکتا ہے کہ اے مالکِ ملک وعوام ایک اور مالک بھی ہے جو مالکِ ارض وسما ہے۔اس کی طرف بھی دیکھ لے۔اگر تو کہتا ہے کہ تیرے ہاتھ لمبے ہیں تو وہ واقعی اتنے لمبے ہیں کہ شاعر کو پکڑ سکتے ہیں۔صحافی اور ادیب کو پکڑ سکتے ہیں۔سیاست دان کو پکڑ سکتے ہیں۔کیا تمہارے ہاتھ بارش کی دھاروں سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔کیا تمہارے ہاتھ سورج کی کرنوں سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔بس اتنی سی بات پر مجھے یہ شاہی قلعے حسن ناصر کی یادگار بنانے کے لئے لے کر جا رہے ہیں۔

وہاں کوئی سادہ لباس میں آیا اور پتلے چنوں اور سوکھے نان کا ناشتہ رکھ گیا۔میں بھی کتنا بے وقوف ہوں، ناشتہ تو زندہ لوگوں کا ہوتا ہے جو گھروں میں رہتے ہیں، میں تو کہیں بھی نہیں تھا۔میں تو نامعلوم مقام پر تھا اور خود بھی نامعلوم تھا۔مجھے تو اپنا نام بھی بھول گیا تھا۔یہ سب جو ہو رہا تھا وہ سب کچھ میرے شعور میں آنے سے گریزاں تھا۔معلوم نہیں کب باوردی، بے وردی، بے دردی اور دہشت گردی جیسے لوگ اندر آ گئے۔پھر سے میری آنکھوں پر پٹی باندھی، منہ پر ٹیپ لگائی، ہاتھ باندھے اور لے کر چلے۔پھر آوازیں کچھ آدھی کچھ ادھوری۔کچھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی میرے حواس پر منڈلانے لگیں۔میں کون تھا؟ جس پر حکومت نے اتنے محکموں کو میری سرکوبی پر لگا دیا تھا۔میں ایک فٹ بال کی طرح تھا جسے کوئی بھی کسی طرف کو دھکیل سکتا تھا اور میں خود بھی فٹ بال بن چکا تھا کیونکہ میرے پاس کوئی فیصلہ کرنے کا پیمانہ نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ دن کا کون سا پہر ہے۔بس یوں لگا کہ گاڑیاں چلیں اور پھر ایک جگہ رک گئیں۔پھر اتارا گیا اور پھر کہیں لے جایا گیا۔پھر آنکھوں سے پٹی اتاری گئی۔منہ سے ٹیپ ہٹائی گئی اور کچھ کاغذوں پر خانہ پری ہوئی۔میرے پاس بات کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ان کے پاس سننے کو کچھ نہیں تھا۔وہ سب حکم کے غلام تھے۔ان کے اندر کی روح گروی رکھی جا چکی تھی۔ان کے اندر کا انسان انہوں نے ٹریننگ میں ہی اپنے قابو میں کر دیا تھا۔میں شاعر تھا، میں نے دنیا بھر کے انقلاب پر لکھی شاعری کا ترجمہ کیا تھا۔یہی تو میری سزا تھی اس لئے کہ ضیاء الحق کے تجربہ کار، نابغہ روزگار افسروں نے کہ جن کی تربیت صدیق سالک نے کی تھی یا کسی اور نے بھی کی ہوگی، وہ نہیں جان سکتے تھے کہ دنیا کے بے شمار انقلاب غلامی سے آزادی کے لئے رونما ہوئے تھے اور اس کے نتیجے میں جو شاعری لکھی گئی تھی اس کا تعلق 1977ء کے بعد کے ضیاء الحق کے مارشل لاء سے بالکل نہیں تھا اور اگر کوئی اس شاعری کو حوالہ بنا کر ترجمہ کر رہا تھا تو وہ ایک

استعارہ تھا مگر یہ بات تو وہ جانتا جس کے سینے میں دل ہوتا۔

اب حاضری ہو رہی ہے۔ میرے انگوٹھے لگوائے گئے، دستخط کرائے گئے۔ میں نہیں جانتا یہ کاغذ کیا ہیں؟ نہ میرا وکیل نہ میری دلیل تو ایک شاعر سے آپ کیا خانہ پری کرا رہے ہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتے تھے کہ خانہ پری ان کی نجات کے لئے ضروری ہے۔ اسے دفتری کارروائی کہا جاتا ہے۔ میں بھلا اس دفتری کارروائی کا حصہ کیوں بنتا کہ میں تو تھا ہی نہیں لیکن میں ان کو تو دکھائی دے رہا تھا۔ سوان کے لئے تو میں تھا اس لئے انہوں نے مجھے ایک سیل میں ڈال دیا۔ یہ شاہی قلعے کا وہ سیل تھا جس میں حسن ناصر رہا تھا۔ پاکستان میں کوئی نہیں جانتا حسن ناصر کون تھا۔ ایوب خان جس نے مارشل لاء لگایا تھا، کس بے دردی سے حسن ناصر کو ٹارچر سیل میں مار دیا۔ وہ کون تھا؟ کیا فرق پڑتا ہے وہ کون تھا؟ اور میں کون ہوں؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے محافظ جو خاردار تار ہماری حفاظت کے لئے لگاتے ہیں وہی ہمیں چبھنے لگتی ہیں۔ ہمیں چھلنی کر دیتی ہیں۔ ہم تو اپنی انہی خاردار تاروں میں بندھے ہوئے ہیں جو ہماری حفاظت کے نام پر لگائی گئی ہیں۔

اب میرے لئے نہ دن تھا نہ رات۔ جونہی میں سیل میں آیا، کسی کی خوفناک چیخوں نے میرا استقبال کیا۔ مجھے اپنی آواز سنے لگتا ہے زمانہ ہو چکا تھا۔ ہو سکتا ہے میں اپنی آواز ہی کھو چکا تھا۔ رشتے کہیں بہت دور چلے گئے تھے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچہ سب میرے لئے سالوں میں بدل چکے تھے۔ وہ چیخیں شاید اذیت کی مختلف طرح کی آوازوں، چیخوں، کراہنے اور سسکیاں لینے کی ملی جلی کیفیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں نے انسان پر تشدد نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ اس طرح کی آوازوں کو سنا تھا۔ یہ اذیت گاہیں کب سے عمل میں تھیں۔ یہاں کون کون آیا ہوگا۔ کون بچ گیا ہوگا۔ کون مارا گیا ہوگا اور سنا ہے جو بچ گئے وہ زندگی کے قابل نہیں رہتے تھے۔ وہ دیوانگی اور پاگل پن کی ملی جلی کیفیت میں خلاؤں کو گھورتے رہتے تھے۔ میرا بھی ان دو میں سے ایک انجام ہونے والا تھا۔ مجھے ایک فلم یاد آ گئی۔ اس کا نام تھا "Brain Washed"۔ اس میں مصری اداکار عمر شریف ایک نوجوان انقلابی ہوتا ہے جس کی ایک بیوی ہوتی ہے۔ وہ انقلاب کے لئے پمفلٹ بانٹتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے خوابوں کا بوجھ اٹھائے سائیکل پر عوام کو آگاہی کے لئے پمفلٹ نکالتا ہے اور بانٹتا ہے۔ ایک دن پکڑا جاتا ہے۔ بیوی کو نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔ وہ اس کی یاد میں اونی شال بنتی رہتی ہے کہ کبھی تو ملاقات ہوگی تو اسے وہ اونی شال پہناؤں گی۔ اس کے ہر تار میں اس بیوی کی آرزوئیں اور امیدیں گندھی ہوئی تھیں۔ اسے نہیں معلوم جیسے میری بیوی کو نہیں

معلوم میں کہاں ہوں، کہیں پر ہوں بھی کہ نہیں...... جب اس نوجوان کے ذہن کے اندر سے انقلاب کی خواہش کو کھرچ کے باہر پھینک دیا جاتا ہے تو تب وہ اس کی بیوی کو بتاتے ہیں اور ملاقات کی اجازت دیتے ہیں۔ وہ نوجوان ابھی بھی ان کی قید میں بے شمار اس جیسے قیدیوں کے ساتھ بیرکس میں ہے جو اسی کی طرح ذہنی توازن اُن اذیت خانوں میں کھو چکے ہیں۔ ایک بڑے میدان میں وہ سب قیدی قطاروں میں موجود ہیں اور اس بیوی کو لایا جاتا ہے جس کے ہاتھوں میں اپنے خاوند کو سردی میں دینے کیلئے وہ اونی شال ہے جو اس نے شوہر کو تحفے میں پیش کرنی ہے۔ اسے لایا جاتا ہے اور وہ اپنے خاوند کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اسے نہیں پہچانتا کہ وہ تمام سمتیں اور تمام زمانے کھو چکا ہے۔ وہ سفید آنکھوں سے اُسے تکتا رہتا ہے۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بنی ہوئی اونی شال رکھ دیتی ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ وہ کون ہے اور اسے یہ کیوں دے رہی ہے۔ وہ اسے باور کرانے کے لئے بولتی ہے مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آتا۔ وہ اب جان جاتی ہے کہ یہ تو اس کے شوہر کی جگہ اس کی لاش بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ روتے ہوئے بھاگتی ہے اور اس اثناء میں وہ تمام قیدی اس شال پر حملہ کر دیتے ہیں اور اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں جس سے وہ تار تار ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں اس ایک لمحے میں یہ فلم کیوں مجھے یاد آئی اور کیوں مجھے لگا وہ میں ہی تھا اور اس کی بیوی میری بیوی تھی لیکن نہ تو میں اس کی طرح کا انقلابی تھا نہ ہی وہ عورت میری بیوی کی طرح تھی۔ ذہن خالی تھا۔ کچھ بھی اس میں گھس آتا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک کسرتی بدن کا بڑا مونچھوں والا آدمی داخل ہوا۔ پہلے مجھے گھورتا رہا۔ اس کے بدن پر جیسے سرسوں کا تیل جھسا ہوا تھا۔ اس نے کسی کو اشارہ کیا اور لوہے کا ایک ایسا شکنجہ وہ لے کر آیا جس کو نہ میں نے پہلے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اس نے صرف ایک آواز لگائی:

''اس کو کڑکی لگاؤ۔''

وہ شکنجہ کیا تھا؟ اس وقت تو میں بے روح، بے سدھ ہو چکا تھا۔ میں اذیت سہنے کے لئے بہادر آدمی نہیں تھا۔ میں نے جسمانی اذیت کسی بھی طرح سے نہ دیکھی تھی نہ سہی تھی اور پھر مجھے معلوم نہیں تھا کہ محض ایک شاعر ہونے کی اتنی بڑی سزا اور وہ بھی پاکستان جیسے ملک میں۔ یہ کوئی نازی جرمنی کا ملک نہیں تھا، یہ کوئی روس نہیں تھا جو ہم پڑھتے آئے تھے۔ یہ سب باتیں تو مملکت خداداد میں ہو رہی تھیں جسے قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے بنایا تھا۔ میری یہ حفاظت ہو رہی تھی کہ میری دونوں ٹانگوں کو ممکنہ حد تک چیر کر پھیلا دیا گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو ممکنہ حد تک چیر کر کھینچ کے باندھ دیا گیا تھا اور اس عالم

میں مجھے ساری رات کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔ ایک منٹ کوئی انسان اس حالت میں کھڑا نہیں ہوسکتا۔ مجھے پوری رات کا شکنجہ کس دیا گیا۔ نہ میں ہل سکتا تھا نہ میں جُھک سکتا تھا۔ میری ہڈیوں کو فطرت کے خلاف گھما دیا گیا تھا۔ اذیت تو چھوٹا لفظ ہے۔ مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ درد، اذیت اور تکلیف تو معمولی الفاظ ہیں۔ وہ تجربہ تو ایسا تھا کہ میں صرف اپنی ہڈیوں کو چبانے پر مامور ہو گیا تھا۔ کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ تم نے یہ شاعری کیوں کی۔ تم نے دوسرے ملکوں کے انقلاب کی ذمہ داری کیوں لی کہ وہ ساری نظمیں دنیا کے دوسرے ملکوں کی شاعری کے ترجمے تھے جو میرے ملک کے فوجی حکمرانوں کو محسوس ہوئے کہ یہ ان کے لئے لکھی گئی نظمیں تھیں...... جب درد بڑھتا ہے تو پھر وہ درد نہیں رہتا۔ یہ سنا تھا، محسوس اس رات کو ہوا۔ اس بات کا مطلب صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس درد سے گزرتا ہے۔

اگلے دن وہ شکنجہ اتارا گیا تو میری ہڈیاں جہاں پر ڈال دی گئی تھیں وہ وہاں سے بالکل حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ میں اس شکنجے کی طرح کا ہو گیا تھا۔ میں گر پڑا اور معلوم نہیں کب تک پڑا رہا۔ وہ مجھے کھانے کے نام پر کچھ لا کر رکھتے تھے۔ جب جسم ہی قابو میں نہ ہو تو آپ کو بھوک کیوں لگے گی۔ اسی طرح میں سوچنے لگا کہ اس کے بعد اور کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ لوہے کے اوزار کے ساتھ ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن نوچ کر اتارتے ہیں۔ اس کا احساس خوفناک تھا۔ میرے جسم سے بوٹی نوچ لیں مگر ناخن نہ نوچیں کہ ناخن کا گوشت سے جو رشتہ ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ بہت عرصہ بعد میں نے مشرقی یورپ کا دورہ کیا یا دنیا کو دیکھا تو وہاں نازی جرمنی یا دوسرے ملکوں کے وہ میوزیم موجود تھے جہاں ٹارچر سیل اور ٹارچر کے تمام اوزار اور تمام طریقے موجود تھے۔ جب میں نے وہ دیکھے تو میرا دل جینے سے اکتا گیا تھا۔ انسان اتنا ظالم ہے تو پھر وہ انسان کیوں ہے۔ اس سے اچھے تو جنگل کے جانور ہیں جو کسی پر تشدد نہیں کرتے۔ جو بے جا کسی کی گردن نہیں مارتے۔ دن رات چیخوں کی آوازیں مختلف اوقات میں سنائی دی جاتی تھیں۔

ایک صبح میرے سیل میں ایک لڑکا کھانا دینے آیا تو رُک گیا۔ مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا ''ہم کو بولنے کا حکم نہیں ہے مگر آج میں بتاؤں گا ساتھ والا مر گیا ہے۔ اس کی لاش ابھی نکال کے گاڑی میں ڈالی ہے۔ بہت ہلکی لاش تھی۔''

میں نے کچھ نہ پوچھا، کچھ نہ بولا گیا۔ وہ چلا گیا۔ اگلی رات پھر اسی طرح مجھے شکنجے میں ڈال دیا گیا۔ کسی پہر درد سے بے قابو ہو کر میری چیخیں آسمان کو چھونے لگی تھیں۔ اسی لمحے کوئی اندر آیا اور اس نے

انتہائی یخ بستہ پانی میرے پورے جسم پر انڈیل دیا۔ میں ساری رات کانپتا رہا۔ اس میں ایک اچھی بات ہوئی کہ میں پہلے درد سے غافل ہو گیا۔ اگلی رات مجھے شکنجہ نہیں لگایا۔ اس کی منطق مجھے یہ سمجھ آئی کہ میں اس کا عادی نہ ہو جاؤں اور مجھے یہ تکلیف گوارا نہ ہونے لگے۔ اب مجھے ایک نئے تجربے کا انتظار تھا کہ یہ میرے جسم اور میری روح کے لئے کس طرح کا تجربہ آزماتے ہیں۔ اچانک میرے سیل کا جو بلب بہت بڑا اور کئی سو واٹ کا تھا کہ میں سو نہ سکوں، وہ بجھا دیا گیا۔ اب مکمل تاریکی میرے سیل میں سیلاب کی طرح داخل ہو گئی۔ میں نے سوچا آج مجھے نیند آ جائے گی کہ اچانک عجیب وغریب آوازیں مجھے آئیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی آنکھیں محسوس ہوئیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اچانک ایک نرم اور لجلجا سا کوئی جانور میرے ہاتھ کو چھو گیا۔ غور کیا تو وہ پلا پلایا موٹا سا چوہا تھا۔ اب سمجھ میں آیا۔ انہوں نے میرے سیل میں تربیت یافتہ پلے پلائے چوہے چھوڑ دیئے تھے اور اسی لئے روشنی گل کر دی تھی کہ وہ اپنے شکار پر اندھیرے میں حملہ آور ہوں اور اسے نیند میں جانے سے روکیں۔ بعد میں کبھی معلوم ہوا تھا کہ چوہے شاہی قلعے کے باقاعدہ ملازم تھے۔ ان کے پے رول پر تھے جیسے دنیا کی تمام افواج مختلف طرح کے کتوں کو بھرتی کرتی ہیں اور ان کے باقاعدہ عہدے اور رینک ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ چوہوں کا گروہ ان کے پے رول پر تھا۔ وہ جس رات انہیں شکار پر چھوڑتے تھے۔ کم از کم دس گھنٹے بھوکا رکھتے تھے اور پھر وہ چوہے اپنے ہدف پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اب میں نے محسوس کیا وہ نوکیلے دانتوں سے میرے جسم کے ہر حصے کو نوچنے میں پوری مہارت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہ بہت ہی بڑے چوہے تھے اور ان کی تربیت ہوئی تھی۔ جب اتنے بہت سے چوہے میرے جسم کو نوچنے لگے تو میں نے دونوں ہاتھ چلانے شروع کئے۔ ایک آدھ چوہا ہاتھ میں آیا تو اسے دیوار پہ مارا کہ مر جائے یا بے ہوش ہو جائے۔ کوئی میرے پاؤں کے انگوٹھے کاٹ رہا تھا۔ کوئی میرے چہرے پر دانت گاڑے تھے۔ اب مجھے رات کو سونے کے لئے تو کسی قسم کی سہولت نہیں تھی۔ گویا رات جاگ کے اور ان چوہوں سے لڑ کے بسر کرنی ہے۔ یہ چوہے میرے جسم کو نوچنے کی خاص مہارت رکھتے تھے۔ وہ خون بھی چوستے تھے اور جسم کا کوئی لوتھڑا بھی جسم سے الگ کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں ساری رات نیند کی جگہ ان سے لڑتا رہا۔ یہ عجیب جنگ تھی۔ دشمن رات کے اندھیرے میں ہر طرف سے حملہ آور تھا اور میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ وہ اتنی تعداد میں تھے کہ میں ایک ایک کو پکڑ کے مار بھی دیتا تو وہ کم نہیں ہو سکتے تھے۔ میں بالآخر تھک کے ہار گیا اور وہ جب تک بھوک میں رہے، مجھے نوچتے رہے۔ پھر جب ان کی بھوک مٹ گئی تو وہ اپنی مخصوص آوازوں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے اور کوئی انہیں لے گیا۔ میں

زخمی لہولہان گرا پڑا تھا۔ ایک نائی اندر آیا۔ اس نے میرے زخموں پر پھٹکری لگائی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ میرے جسم کو اگلی رات کے تشدد کے لئے تیار کرنے آیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا اور چلا گیا۔

ایک دن مجھے وہاں سے نکالا گیا اور اسی احاطے میں یا وہاں کسی جگہ پر کہ میں اس علاقے کا حدود اربعہ نہیں جانتا تھا، نہ جان سکتا تھا۔ مجھے ایک عدالت نما جگہ پر پیش کیا گیا۔ باوردی لوگ تھے۔ وردیاں فرق قسم کی تھی۔ نہ وکیل نہ دلیل۔ فوجی افسر نے کچھ کاغذ سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظم کے دو تین مصرے پڑھے اور پوچھا ''یہ تم نے لکھا ہے؟''

مجھے پکاسو کا واقعہ یاد آیا مگر میں کہہ نہ سکا کہ یہ تو تم نے لکھا ہے۔ میں چپ رہا۔ اس نے پھر دہرایا۔ میں نے کہا ''یہ میں نے نہیں لکھا، یہ تو ناظم حکمت نے لکھا ہے۔''

''وہ کون تھا، یہ نظم تمہارے نام سے چھپی ہے۔''

''ہاں مگر یہ میں نے اردو میں ترجمہ کی ہے۔''

''مگر یہ تو ہم پر یعنی پاکستان کے سکیورٹی اداروں پر طنز ہے۔''

''آپ کے اندر کا چور بول رہا ہے۔ دنیا میں اور بھی ایسی جگہیں ہیں جہاں اس طرح کے حالات ہو سکتے ہیں۔''

''یہ تو بولتا ہے، بکواس کرتا ہے، کسی نے اس کی زبان خاموش نہیں کی۔''

''سر جی آج رات زبان کاٹ دیں گے۔ خود ہی خاموش ہو جائے گا۔''

''یہ نظم کس کی ہے؟'' اس نے تین چار مصرعے غلط سلط پڑھے۔

''یہ نظم پابلو نرودا کی ہے۔ وہ چلی کا شاعر تھا۔''

''ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو، وہ صاف صاف ہم پر طنز کر رہا ہے۔''

''وہ اس لئے کہ وہاں کے حالات بھی ایسے تھے۔''

''تو تم اب ہمیں سبق پڑھاؤ گے۔ ان کے حالات ایسے تھے تو تم ان حالات کو پاکستان میں کس لئے لائے ہو؟''

''میں نہیں لایا، وہ تو آپ لائے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔ ابھی تک اس کو کسی نے سبق نہیں سکھایا۔''

''سر جی بس ایک موقع، کل یہ بولنے کے قابل نہیں ہوگا۔'' ایک وردی والا بولا......

''مگر اب تک یہ ایسا کیوں ہے؟''

''سر جی ذرا کاٹھا ہے، جسم کا سخت ہے، آج رات سُدھ کر دیں گے۔''

پھر اس نے بھٹو صاحب پر میری نظم پڑھی۔

''یہ تمہاری ہے، نام ہے تمہارا۔''

''نہیں جی یہ میری نہیں ہے۔''

''تیرے نام کے تین پہلے حرف لکھے ہیں۔''

''ان تین حرفوں سے تین مختلف نام بن سکتے ہیں مثلاً۔''

''ہم کو چوتیا سمجھتا ہے، بے وقوف سمجھتا ہے، یہ بھاری بوٹوں سے کیا مراد ہے، یہ وردی کے لفظ کا کیا مطلب ہے؟''

''دنیا کی ہر فوج کے بوٹ بھاری ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر فوج کی وردی ہوتی ہے۔''

''ہم کو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اوئے یہ مارشل لاء ہے اور اس میں تم ایسی بکواس کرو گے تو کھال کھینچ کے بھس بھر دیں گے۔''

اس کے بعد اس نے کچھ اور کاغذ دیکھ کر پوچھا ''تم کالج میں پڑھاتے ہو؟''

''جی میں استاد ہوں۔''

''ایسے استاد اگر اس طرح کا سبق دیں گے تو ایک پوری نسل ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ تم ہر دس سال بعد ایک نسل کو پاکستان کے سکیورٹی اداروں کے خلاف کرو گے تو پچاس سال بعد تم تو پورے ملک کو ہمارے خلاف مسلح کر چکے ہو گے۔''

''یہ بات ایک خاص مذہبی جماعت نے تمہارے منہ میں ڈالی ہے۔ حقیقت یہ نہیں ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، تم کوئی فیض احمد فیض ہو۔ ہم نے ان کا ٹرائل بھی پڑھا ہے۔ وہ بھی دودھ کے دھلے نہیں تھے۔ انہوں نے بڑے سمجھوتے کیے تھے۔ وہ برطانوی فوج میں کرنل کا عہدہ لے چکے تھے۔ وہ اچھے انسان تھے مگر ضروری نہیں کہ ان کے ہاتھ صاف ہوں۔''

''میں فیض صاحب نہیں ہوں اسی لئے یہ سزا کاٹ رہا ہوں۔''

''اس کی زبان نہیں، اس کا دماغ بول رہا ہے۔ اسے خاموش کرو۔''

''سر جی آج رات دماغ کو بھی قابو کر لیں گے۔''

''اس جیسے ناسور کالجوں میں نہیں رہ سکتے۔ فارغ کرو نہیں تو نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور مجھے اپنے سیل میں ڈال دیا گیا۔ اب میرے لئے یہ کس حکم کی تعمیل کریں گے، میں انتظار میں تھا۔ بالآخر میرے سیل سے مجھے نکال کر ایک عجیب طرح کے اذیت خانے میں لے گئے۔ میرے ہاتھ باندھے گئے۔ میرے پاؤں باندھے گئے۔ اس کمرے میں بے شمار بجلی کی تاریں، اوزار اور مختلف طرح کے آہنی شکنجے رکھے تھے۔ میرے سر پر آہنی خول کس کر باندھ دیا گیا۔ پاؤں پر بھی اسی طرح کے آلات چڑھا دیئے گئے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں گے۔ میرا جسم پوری طرح جکڑ دیا گیا اور پھر مجھے یوں لگا کہ خوفناک زلزلہ آ گیا ہے۔ میرے جسم میں معلوم نہیں کتنے دولٹ کی بجلی دوڑا دی گئی۔ میرے پورے جسم کے اندر جیسے ہل چل رہا ہو۔ میری چیخیں آسمان تک جا رہی تھیں۔ میرے اندر سے روح باہر کو نکلنا چاہ رہی تھی۔ یہ جھٹکے بہت دیر تک وقفوں وقفوں سے دیئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ میری چیخیں دم توڑ گئیں۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ جب ہوش آیا تو اپنے سیل میں پڑا تھا۔ میرے بال بڑھ چکے تھے۔ میری شیو بڑھ چکی تھی۔ اپنا چہرہ دیکھے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ اب میں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے سوچنے کے قابل ہی نہ چھوڑا ہو۔ اب اذیت نہ ہو تو اذیت کا انتظار رہنے لگا۔ جسم اذیت کا عادی ہو رہا تھا۔ یہ بات ایک لحاظ سے شاید اچھی تھی مگر اذیت دینے والوں کا تجربہ کہتا تھا کہ جب جسم اذیت کے نشے کا عادی ہونے لگے تو اذیت کے طریقے بدل دیئے جائیں۔ اذیت پر وہ تجربے کرنا جانتے تھے۔ وہ حسن ناصر یا کسی اور کو بھی مارنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اسے مسلسل اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے کہ وہ ان کو دھوکہ دے گیا۔ ان کے تجربے کو جھوٹا ثابت کر گیا اور جلدی چلا گیا۔ اب مجھ پر وہ تجربے کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے میں بھی ان کو جھوٹا ثابت کر کے ایک صبح مردہ خانے میں لے جایا جاتا۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ شاہی قلعہ میں وہ کسی کو نہیں مارنا چاہتے تھے۔ وہ اسے مسلسل اذیت میں رکھنا چاہتے تھے۔

اب ایسے میں کوئی سانس کا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا تھا تو یہ ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا قصور تھا۔ مقصد کسی کو وہاں قتل کرنا نہیں تھا۔ قتل کرنے کے لئے تو پہلے ہی دن ایک گولی کافی ہے اور خبر آ سکتی ہے کہ فلاں ابن فلاں پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ نہ مارشل لاء پر حرف آئے نہ کسی قاتل پر۔ یہاں معاملہ یہ تھا ہی نہیں۔ یہاں تو قیدی کے جسم کی آزمائش مقصود تھی۔ اس بات سے ثابت ہوا اذیت دینے والے پیشہ ورانہ تربیت میں نااہل تھے ورنہ حسن ناصر قتل نہ ہوتا۔ اسے قتل کرنا مقصود نہیں تھا۔ اسے دیر تک اذیت دینا مقصود

تھا۔ وہ انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا اپنے اللہ کے پاس۔

مجھے اب خواب نہیں آتے تھے۔ مجھے کھلی آنکھوں کے سامنے ہیولے آتے تھے اور جاگتے میں خواب جیسی کیفیت ہوتی تھی مثلاً کئی دفعہ دیکھا میری بیوی بچے کو لے کر آئی ہے۔ اسے میری گود میں بٹھایا ہے۔ میں اسے دودھ کا فیڈر منہ میں دیتا ہوں۔ وہ مسکرا کر دودھ پینے لگتا ہے۔ وہ سامنے کھڑی رہتی ہے اور پھر میرے گلے سے لگ جاتی ہے اور بس۔ بات ختم۔ کبھی دیکھتا ہوں میری ماں آئی ہے اور مجھے کھانا دیتی ہے کہ میں کھالوں۔ کبھی سب گھر کے لوگ اکٹھے آ کر مجھے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ یہ سب کیا تھا۔ یہ میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بس یہ چند لمحے میرے لئے سکون ضرور پیدا کر دیتے تھے۔ مجھے اچانک کسی کے داخل ہونے کا احساس ہو جاتا تو میں چونک جاتا لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ مجھے وقت کا شعور نہیں رہا تھا۔ مجھے کبھی کبھی یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ میں کون ہوں۔ اب چار سو واٹ کا بلب میرے سر پر دن رات جلنے لگا تھا۔ ویسے دن تھا نہ رات، وقت وہاں پر ایک جگہ جامد ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں مجھے وہاں کتنا عرصہ ہو چکا تھا۔

....

ایک دن ایک نائی کو میرے سیل میں دھکیل دیا گیا۔ اس نے مشین سے میرے سر اور چہرے کے بال ایک منٹ میں صاف کر دیئے جیسے بھیڑ یا گھاس پر مشین چلا کے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اندر سے ایک چہرہ تو باہر آیا مگر نہیں معلوم کس کا تھا۔ اس نے آئینہ دکھانا بھی مناسب نہ سمجھا کہ اس کے پاس شاید نہیں تھا۔ یہ احساس تو نہیں تھا کہ شام کب ہوتی ہے لیکن اُس دن جب مجھے سیل سے نکال کر ایک بڑے کمرے جو دفتر نما تھا، میں لایا گیا۔ سامنے ایک خاتون بیٹھی تھی جسے میں نہیں پہچان سکا۔ نہ ہی اس نے مجھے پہچانا۔ وہ میری بیوی تھی۔ وہ رونے لگی کہ یہ کون ہے؟ یہ تو میرا شوہر نہیں ہے۔ ایک افسر وہاں موجود تھا اور دو کارندے جو مجھے سیل سے لے کر آئے تھے۔ کارندے دور کھڑے ہو گئے۔ میں قریب آیا تو وہ میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ میں بدل چکا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔ ''تمہارے بال سفید ہو گئے۔ تم وہ نہیں ہو، کیا کیا ظالموں نے؟ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا تمہیں کہاں لے گئے ہیں۔ تم لا پتہ قرار دیئے گئے ہو حکومت کے اداروں کے کاغذات میں۔ میں نے بھائی ارشد تک انکل نواز کی سفارش لگوائی تو پتہ چلا کہ تم یہاں ہو۔''

وہ ایک سانس میں بول گئی۔ دوسرے سانس کا موقع ہی اس افسر نے نہ دیا۔

''دیکھو بی بی اس وقت جس کام سے آئی ہیں، صرف وہ کریں۔''

''تو مجھے کچھ تو بتانا ہے۔ بریگیڈیئر ارشد نے آپ کو کچھ پیغام نہیں دیا۔ انہوں نے آپ کو جو حکم دے رکھا ہے اس کے لئے آئی ہوں۔''

''او کے بات مکمل کریں۔''

''تمہیں نہیں پتہ انکل نواز......''

''میں کسی انکل نواز کو نہیں جانتا۔''

''وہ میرے ابو کے فرسٹ کزن ہیں۔ ہماری شادی پر بھی آئے تھے۔ خیر انکل نواز تک ہم نے

بات پہنچائی کہ فوج میں بریگیڈیئر ارشدان کے بھانجے ہیں۔ وہ ہمارے کام آرہے ہیں۔ بریگیڈیئر ارشد نے تمہارا پتہ لگایا اور پھر......''

''آپ کے پاس صرف دس منٹ ہیں۔'' افسر بولا۔

''ہاں ہاں بات تو کرنے دیں۔ یہاں آپ پر کون سا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تعینات ہے۔'' میری بیوی بول رہی تھی۔ میں خاموش تھا۔

''اچھا بات مکمل کریں۔'' وہ پھر بولا۔

''تمہیں تو باہر کی خبروں کا پتہ نہیں ہے۔ ویسے تو ملک میں بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بی بی سی کے ذریعے کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ پاکستان ایئر لائنز کا ایک جہاز اغواء ہوا تھا اور اسے ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹوں نے کسی طرح اغواء کیا ہے۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے۔ وقت نہیں ہے۔ بات مختصر یہ ہے کہ تمہیں یہ لوگ مار دیں گے یہ مجھے بریگیڈیئر ارشد نے بتایا ہے۔ انہوں نے تمہیں یہاں سے نکلنے کا بندوبست کیا ہے۔ آج رات آپ کو یہاں سے انگلینڈ جہاز کے ذریعے ہم نکال لیں گے۔''

''مگر میں تو پاکستان سے جانا نہیں چاہتا۔ میری بیوی بچہ میری ملازمت یہاں پر ہے۔''

''دیکھو پوری بات سن لو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں مجھے صدیاں لگی ہیں۔ تم نہیں جانتے جیسے تم نے ظلم برداشت کیا ہے ویسے ہی میں نے بھی کیا ہے۔ تمہارے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے بھی کیا ہے۔''

''Tell him that he has to go to uk''

''ہاں ہاں میں بتا رہی ہوں۔ دیکھو بریگیڈیئر ارشد نے ہماری مدد کی ہے تمہیں یہاں سے نکالنے کے لئے۔ آج رات کو یہاں سے پی آئی اے کی فلائٹ انگلینڈ روانہ ہو رہی ہے۔ اس میں جیلوں میں قید وہ لوگ جائیں گے جن کے نام ہائی جیکرز نے حکام کو دیئے ہیں۔ جو اس وقت پاکستان کی جیلوں میں ہیں اور وہ لوگ حکومت پاکستان کے لئے ناپسندیدہ لوگ ہیں اس لئے حکومت پاکستان نے ہائی جیکرز کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے کہ یہاں سے ان کی فہرست کے مطابق جو لوگ جیلوں میں ہیں انہیں فوری طور پر انگلینڈ بھجوا دیا جائے کہ انگلینڈ نے انہیں سیاسی پناہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب حکومت پاکستان جن لوگوں سے جان چھڑانا چاہتی ہے انہیں اسی فلائٹ میں انگلینڈ بھجوا دیا جائے گا۔''

اس وقت میری ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ یہ ساری بات مجھے سمجھ آجاتی۔ میں بت بن کر سن رہا

تھا۔ میری بیوی پھر بولی۔

''دیکھو تم واپس آ جاؤ گے جب یہاں سے یہ حکومت ختم ہو گی۔ تم اپنی نوکری پر بحال ہو جاؤ گے۔ سمجھو۔ بڑی مشکل سے تمہارا نام اس فہرست میں شامل کرایا ہے جن سے حکومت جان چھڑانا چاہتی ہے۔''

''میں تو اب کہیں نہیں جانا چاہتا۔ ان کا ظلم برداشت کر چکا ہوں۔ صرف مرنا باقی ہے جو میرے بس میں نہیں ہے مگر جب مرنے کا وقت آئے گا مجھے کیا اعتراض ہو گا۔''

''تم بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرے گلے سے لگ گئی۔

میں ایک اجنبی پھٹی نگاہوں سے خلاء میں دیکھ رہا تھا۔ ایک آواز آئی ''آپ کی ملاقات ختم۔''

میری بیوی مجھ سے الگ ہو گئی اور اس نے ایک تھیلا میرے سامنے رکھا۔ اس میں تمہارے کپڑے اور ضروری اشیاء ہیں۔ یہ پیسے جو پاؤنڈ میں ہیں، رکھ لو۔

''نہیں یہ مجھ سے چھین لیں گے۔''

''نہیں رکھ لو۔ ہم نہیں چھینیں گے۔ ہم ظالم نہیں۔ یہ سسٹم ظالم ہے۔''

پھر وہ چلی گئی۔ میں خالی دیواروں کو گھورتا رہ گیا۔ وہ آئی تھی ملنے۔ وہ تو ملی نہیں بس اطلاع دے کر چلی گئی۔ کیا یہ میاں بیوی کا ملنا ہوتا ہے۔ میں نے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور مجھے سیل میں ڈال دیا گیا۔ اب میں پھر کہیں نہیں تھا۔ وہ کون تھی۔ کیا کہہ گئی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ کیا یہ میرے لئے رہائی کی رات تھی یا ایک قید سے دوسرے قید میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ کیسی جلاوطنی اور ہجرت تھی جس کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ میرا تو کوئی خواب بھی نہیں تھا۔ میرے لئے تو یہ ہوائی سفر بھی پہلا تجربہ ہو گا نہ پاسپورٹ نہ ویزہ۔ مجھے دھکیلا جا رہا تھا اور اس کے لئے میری بیوی نے کس کس کے دروازے پر دستک نہیں دی ہو گی۔ کیا واقعی مجھے اس قلعے کے چھوٹے سیل میں مار دیا جائے گا۔ سچ کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ سچ اور سچ کے ہونے تک میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔ مجھے کبھی بھی اپنے ملک میں کسی بھی طرح کے انقلاب کا نہ تو انتظار تھا نہ امید تھی۔ انقلاب کی فصل کے لئے زمین کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے اقبال احمد کے لیکچر میں سنی تھی جو مبشر حسن کی کوٹھی کے لان میں اس نے ترقی پسند سیاسی کارکنوں اور روشن خیال سوچنے والوں کو دیا تھا...... یہاں تو زمین تھی ہی نہیں اور جو زمین ہمیں پناہ دے رہی تھی آج وہ بھی پاؤں کے نیچے سے کھینچی جا رہی تھی۔ میں اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اور ذاتی سامان کے تھیلے کو دیکھ رہا تھا۔ میری مٹھی میں کچھ پاؤنڈ تھے اور یہ بھی نہیں

جانتا تھا کہ وہ کتنے دن کام آسکیں گے۔

رات آہستہ آہستہ آسیب کی طرح میرے سیل میں پاؤں رکھ چکی تھی۔ معلوم نہیں مجھے کیوں اپنے اس چھوٹے سے سیل سے پیار ہو چکا تھا۔ یہ چھوٹا سا گھونسلہ اب مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ بار بار میرے دماغ میں حبیب ولی محمد کی گائی ہوئی غزل کا یہ شعر گونج رہا تھا جسے ہمیشہ میں نے تیسرے درجے کا شعر سمجھ کے نظر انداز کیا تھا۔ آج وہی شعر میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملی بھی تو مر جائیں گے

میں نے اپنے اس مختصر سے سیل پر نظر ڈالی۔ اب اس سے جدا ہونا تھا۔ آدمی اپنی قریبی چیزوں سے جدا ہوا کرتا ہے اور یہی میرے لئے قریبی چیز تھی۔ انگلینڈ میں میرا نہ تو کوئی قریبی عزیز رہتا تھا نہ ہی کوئی ایسا دوست جس کی کوئی یاد میرے پاس ہو۔ کالج کی ملازمت مجھے بہت مشکل سے کڑے مقابلے کے بعد حاصل ہوئی تھی اور میں بہت خوش تھا کہ زندگی اچھی گزر جائے گی۔ لاہور کی ادبی محفلیں ہوں گی۔ بڑے ادیبوں اور شاعروں کے قریب رہنے کا موقع مل رہا تھا۔ اپنی بیوی کو لیکچرار بنوانے کا ایک مرحلہ خواب کی حیثیت رکھتا تھا کہ وہ بھی میرے ہی مضمون میں ایم اے کر چکی تھی۔ یہ ایک خواب بھٹو صاحب کی پھانسی سے پہلے کا تھا جو اب میرا خواب نہیں رہا تھا۔ یک بیک کیا ہوا؟ اتنی تیزی سے حالات بدل رہے تھے کہ اتنی تیزی سے تو موسم نہیں بدلا کرتے۔

اچانک جیسے بھونچال آ جاتا ہے۔ میرے سیل کے باہر شور ہوا اور پھر ایک کارندہ اندر آیا۔ ''تمہیں آدھے گھنٹے میں ایئر پورٹ منتقل کرنا ہے۔ جلدی سے کپڑے بدل لو کہ حکومت نہیں چاہتی تم جیل کے ان کپڑوں میں نکالے جاؤ۔ جلدی جلدی۔''

گاڑی میں ایئر پورٹ روانہ ہوا۔ وہی لاہور تھا مگر وہی نہیں تھا۔ میں کسی دشمن ملک کا قیدی تھا اور وہ دشمن ملک مجھے کسی نامعلوم ملک کی طرف دھکیل رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ روشنی میں باہر کچھ سڑکیں، عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں کتنے زمانے بعد ہوا چلی تھی۔ باہر دیکھا تھا مگر ذہن میں نہ خواب نہ خیال۔ ایک بھیڑ بکری کو جیسے دھکیلا جاتا ہے۔ ایسے ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ یہ لاہور کا ایئر پورٹ تھا۔ ہر طرف فوجی اور پولیس والے موجود تھے۔ لگتا تھا کرفیو لگا ہوا ہے۔ میرے علاوہ وہاں عورتیں، مرد اور کچھ بچے بھی تھے، میں ان میں شامل ہو گیا۔ کوئی نگاہ اگر اٹھی بھی تو فوراً بیٹھ گئی۔ پہرہ لگا ہوا

تھا۔ مبادا کوئی وہاں سے بھاگ جائے۔ گویا ہم سب اب بھی جیل ہی میں تھے، آزاد نہیں تھے۔ ہم پر پہرے دار اس لئے تھے کہ کہیں ہم بھاگ کر اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں یا روپوش نہ ہو جائیں۔ یہ سرکار کی ڈیوٹی تھی کہ پاکستان کا کوڑا کرکٹ پاکستان سے باہر پھینک دیا جائے اور اس بارڈسٹ بن کے لئے انگلینڈ کا انتخاب کیا گیا۔ کیا خوب؟ کیا انگلینڈ خود ڈسٹ بن کے طور پر قبول کرلے گا۔ وہ انگلستان جس نے ہندوستان پر درجہ بدرجہ قبضہ کیا کہ ہندوستان ریاستوں میں تقسیم تھا۔ وہ انگلستان اب ہندوستان کی تاریخ کا کچرا قبول کرلے گا؟

یہ کیا تاریخ ہے؟ پاکستان میں ہندوستان سے خاندان ہجرت کر کے آئے۔ مشرقی پاکستان میں بہار سے آئے ہوئے کروڑوں لوگ تھے۔ پھر وہ 1971ء کے بعد بے گھر ہو گئے۔ کیوں؟ جو ایک گھر چھوڑ کے آئے، ان سے دوسرا گھر کیوں چھینا گیا اور پھر ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی، لاہور اور نوزائیدہ پاکستان میں ہجرت کر کے بڑی تعداد میں لوگ آئے اور وہ رہنا چاہتے تھے پھر ایک اور ہجرت ان کے گلے میں ڈال دی گئی۔ یہ ہجرت کس حساب سے ہو رہی تھی۔ فلائٹ کو کراچی جانا تھا جہاں سے بہت سے قیدی شامل ہونے تھے اور پھر یہ جہاز انگلستان جا کر ٹھہرنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ہجرت ہے کیا؟ اور اس کو کہاں جا کے رکنا ہے جو میرے دادا سے شروع ہوئی، میرے باپ سے گزری اور پھر مجھ تک پہنچی اور پھر شاید میرے بیٹے تک پہنچے گی۔ تو کیا یہ سب ایک مسلسل عمل ہے یا اس زمین کا تاریخی جبر ہے۔ اسے تو ہونا ہے۔ میں ایئرپورٹ پہلی بار اندر سے دیکھ رہا تھا۔ اُجڑا ہوا مہاجر کیمپ لگ رہا تھا۔ خوف کے سائے ہر سمت اُنڈے چلے آتے تھے۔ وہاں جو بھی لائے گئے بت بن کر تکتے تھے۔ کیا اس طرح کی رہائی انہیں قبول ہو سکتی تھی۔ یہ تو ایک اور غلامی میں دھکیلے جا رہے تھے۔ جس انگریزوں کی غلامی سے نام نہاد آزادی حاصل کی تھی ہندوستان نے، دوبارہ ان کی غلامی میں بھیجا جا رہا تھا۔

ایک اجڑا اجڑا شخص پہلے مجھے گھورتا رہا۔ وہاں کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ ہمیں کب اور کس فلائٹ میں سوار ہونا ہے۔ وہ شخص میرے پاس آیا۔

''تمہیں کس جیل سے لایا گیا ہے؟''

''میں جیل میں نہیں تھا۔''

''تو کیا تم انڈر گراؤنڈ تھے؟''

میں نہیں بولا۔ وہ میرے ساتھ فلائٹ میں جا رہا تھا۔ اب میں نے سوال کر دیا۔

''تمہیں کس جیل سے لایا گیا ہے؟''

''کیمپ جیل سے۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''میرا نام اوپر سے آیا ہے۔ انہوں نے بھیجا ہے جو مجھے رہا کرانا چاہتے ہیں۔''

''جنہوں نے جہاز اغواء کیا ہے؟''

''ہاں وہی جو بھٹو صاحب کے بیٹے کنٹرول کر رہے ہیں۔''

''تمہیں وہ کیسے جانتے ہیں؟''

''بڑی ماریں کھائی ہیں، بڑی جدو جہد کی ہے، جس کا آج انعام مل رہا ہے۔''

''کیا یہ انعام ہے؟''

''ہاں ہاں وہ ہمیں نکال کے لے جائیں گے۔ پھر ادھر کوئی مارشل لاء کا ضابطہ نہیں ہوگا۔ وہ تو آزاد ملک ہے۔ وہاں تو سیاست پر بات کرنے کی آزادی ہے۔ وہاں تو آپ نے سنا ہے ایک جگہ ہے جسے ''ہائیڈ پارک'' کہتے ہیں۔ وہاں تو ملکہ کے خلاف بھی آپ تقریر کر سکتے ہیں۔ کوئی مقدمہ نہیں ہوتا۔''

''تو تم وہاں ہائیڈ پارک میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف تقریر کرو گے۔''

''میں تو جہاز میں بھی کروں گا کہ ایک دفعہ جہاز اڑا نہیں اور ہم آزاد ہوئے نہیں۔''

''مگر ہم تو ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں۔''

''ملک آزاد ہے۔ ہم تو آزاد نہیں ہیں۔''

''تو پھر یہ کیسا ملک ہے جو خود تو آزاد ہو گیا ہے، اپنے رہنے والوں کو آزاد نہیں کر سکا۔''

''دیکھ لو جناب یہ تو پھر ایک معمہ ہے۔''

''تو آپ یہ معمہ حل کرنے خوشی خوشی انگلینڈ جا رہے ہیں۔''

''بھائی صاحب آزاد ہو رہے ہیں اس ملک کی قید سے۔''

''اور غلام ہونے جا رہے ہیں اس گورے کے جس نے ہمیں سو سال غلام رکھا۔''

''آپ ہیں کون؟''

''میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''آپ کو آج رہائی نہیں مل رہی۔''

''اسے تم رہائی کہتے ہو؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ایک بار یہاں سے نکل جاؤں میں پوری دنیا کو بتا دوں گا کہ پاکستان میں سخت ترین مارشل لاء نافذ ہے۔''

''کیا دنیا کو معلوم نہیں ہے۔کیا دنیا کو تمہیں بتانا پڑے گا؟''

''دنیا بی بی سی سنتی ہے؟''

''نہیں دنیا بی بی سی نہیں سنتی۔وہ دیواروں پر لکھا پڑھتی ہے۔''

''آپ کون ہیں بھائی صاحب؟''

''میں مارشل لاء کا آدمی ہوں۔تم پر تعینات ہوا ہوں۔''

یہ سن کر وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔اس سے پیچھا چھڑانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔اب مجھے محسوس ہوا ایسے ہی کئی کردار اس فلائٹ میں مجھے ملنے والے تھے۔پھر معلوم نہ ہوا کہ ہم سب ایک بڑے لاؤنج میں کراچی ایئر پورٹ میں چیخ وپکار میں تھے۔لگتا تھا قیامت کا منظر ایسا ہی ہوگا۔وردیوں والے بھی کئی رنگوں کی وردیوں میں تھے۔امتیاز ختم ہو چکا تھا کون کیا ہے؟ اور یہاں کیوں ہے؟ کوئی باجماعت نعرے لگا رہے تھے۔کہیں سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔کوئی اکیلا خاموشی میں تقریر کر رہا تھا۔یہ تماشا تو فلائٹ میں بھی ہونے والا تھا۔دنیا کی یہ ہجرت کسی فلائٹ میں شاید پہلی بار ہو رہی تھی۔ہم نے 1947ء سے 1979ء تک اتنی ترقی کر لی تھی کہ ریہڑوں، بیل گاڑیوں اور پیدل مشرقی پنجاب سے قافلے لاہور کی طرف آئے تھے یا ٹرین کے ذریعے آئے تھے مگر اب جہاز کے ذریعے ہجرت تک پہنچ گئے تھے۔ہجرت بھی اپنے ساتھ اپنے ذرائع مواصلات لے کر آتی ہے۔جہاز میں سب کو ڈال دیا گیا تھا اس لئے کہ یہ کوئی کمرشل فلائٹ نہیں تھی، یہ ایمرجنسی فلائٹ تھی جو ہائی جیکرز کے مطالبے کو پورا کرنے کے لئے حکومت پاکستان نے قیدیوں کو مختلف جیلوں سے نکال کر اُڑنے کی اجازت دی تھی۔حکومت کا مؤقف یہ تھا کہ یہ ملک کے لئے ناسور ہیں۔جتنی جلدی اس ناسور کو ملک سے باہر پھینک دیا جائے اتنا ملک کے لئے اچھا ہوگا۔

فلائٹ میں ہر عمر، ہر زبان، ہر حلیے کے لوگ تھے۔کیا ان کا مستقبل ہوگا، کوئی نہیں جانتا تھا۔جونہی جہاز ہوا میں آیا، کچھ لوگ جن کا سندھ سے تعلق تھا، نعرے لگانے لگے۔کئی طرح کے ملے جلے نعرے تھے جن میں ''بھٹو'' کا نام سنائی دے رہا تھا۔نعرے ذرا کم ہوئے تو آگے بیٹھے ایک ادھیڑ عمر کے انقلابی نے

با قاعدہ تقریر شروع کر دی اور بھٹو کی شہادت پر عالمی بے حسی کے ساتھ عدالتی نظام کی چیرہ دستیوں پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہوا؟ مجھ پر نیند کا شدید دورہ پڑا اور میں سو گیا مگر یوں محسوس ہوا خواب میں بے شمار آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ وقفے وقفے سے یہ آوازیں بھنبھناتی رہیں مگر نیند نہ ٹوٹی۔ کئی برسوں کی نیند تھی۔ جسم سے باہر نکل رہی تھی۔ جس کے سبب پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جب آنکھ ذرا سی کھلی تو پورا جہاز سو رہا تھا۔

لندن میں دن چڑھا ہوا تھا۔ جہاز رکا ہوا تھا۔ کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دو لوگ جو ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے، وہ حکومت پاکستان کے نمائندے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہماری فائل تھی جو انہوں نے شاید ہائی کمیشن کے لوگوں کے حوالے کی اور پھر ہمیں نیچے اترنے کا حکم ہوا اور سخت پہرے میں سب کو ایک ہال میں بٹھا دیا گیا۔ ہمارے کاغذات تیار ہونے تھے۔ یہاں انسانی بنیادوں پر ہمیں کچھ خوراک کے پیکٹ دیئے گئے۔ اب ہمیں سیاسی پناہ دی جا رہی تھی۔ لگتا تھا ہم سب کسی ملک کے جنگی قیدی ہیں جنہیں کسی اور ملک کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہاں بھی کچھ سندھیوں نے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جسے وہاں موجود سکیورٹی والوں نے خاموش کرا دیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کتنی دیر یہاں بیٹھنا ہوگا۔ میں تو شاہی قلعہ میں وقت کے خلاف جاگنے اور انتظار کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ میرے لئے یہ سب ایک پراسرار آگاہی تھی۔ کیا ہوگا؟ میں اس سے قطعی لاتعلق تھا۔ جب آپ کے اختیار میں کچھ نہیں تو ایک لمبا انتظار کھینچنے میں کیا جاتا ہے۔

میں اپنی سوچوں میں لاہور پہنچ گیا۔ مجھے فرار حاصل کرنے میں مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے کہیں پہنچ جاتا تھا۔ میں اپنے گھر پہنچ گیا جہاں میری بیوی سعدیہ میرے بیٹے کو نہلا رہی تھی۔ میں اس کے لئے دودھ کا فیڈر بنا رہا تھا۔ جونہی اس نے اسے نہلا کر تولیے میں لپیٹا، وہ منہ مارنے لگا جس کا مطلب تھا میرے منہ میں فیڈر دو۔ سعدیہ نے فیڈر منہ میں دیا اور وہ آنکھیں بند کر کے پی گیا۔ اتنے میں اسے نیپی باندھ دی گئی تھی اور کمبل میں لٹا دیا گیا تھا اور وہ فیڈر صاف کر کے سو چکا تھا۔ میں نے سعدیہ کے ساتھ کچن میں کھانا بنایا اور پھر ہم نے لاہور کے دوستوں کے شام کے کھانوں میں شریک ہونے کی خوشی کو آپس میں بانٹا اور طرح طرح کے خواب دیکھنے لگے کہ کون آیا ہوگا۔ تقریب میں منیر نیازی ہوگا۔ کشور ناہید ہوں گی۔ فیض صاحب ہوں گے۔ نہیں ہوں گے۔ انتظار حسین سے بات کرنے کا موقع ہوگا۔ ایک بھرپور تہذیب میں شامل ہونے کے لئے میں اور میری بیوی تو گویا پیدا ہی اسی لئے ہوئے تھے۔ ہر دم تیار کہ اب

کس کے ہاں ڈنر یا گیٹ ٹو گیدر ہے۔ میرا یہ خیال ٹوٹا جب میرا نام پکارا گیا۔ میں اٹھا اور مجھے ایک کاغذ تھما دیا گیا اور اشارہ کیا گیا کہ وہاں چلے جاؤ۔ میں وہاں گیا۔ مجھے میرے کاغذات دیئے گئے اور کہا گیا کہ یہ گم نہیں ہونے چاہئیں، نہیں تو تم گم ہو جاؤ گے۔ تم اب انسان نہیں یہ کاغذات ہو۔ ساتھ میں کچھ پاؤنڈز دیئے گئے اور کہا گیا کہ یہ تمہاری خوراک کے لئے ہیں، احتیاط سے خرچ کرنے ہیں۔ شراب نہیں پی سکتے کہ تمہارے لئے سیاسی پناہ میں شراب شامل نہیں ہے۔ میں نے جب بھی شراب پی تھی، منیر نیازی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس کے فٹ پاتھ پر پی تھی۔ جب وہ حکم لگاتے کہ دس روپے نکالو۔ میں نکال دیتا تھا پھر وہ دس روپے اپنی جیب سے نکالتے اور کہتے ''اوئے کاکے وہ سامنے ایڈلجی کا ٹھیکہ ہے ایک بوتل واڈ کا کی لے آ۔ اور پھر حکم کی تعمیل ہوتی تھی۔ ٹی ہاؤس کے باہر الٰہی بخش منیر نیازی کا چہیتا تھا، جگ میں پانی اور گلاس رکھ جاتا تھا۔ ادھر سے بوتل آتی اور پھر گلاس بھر جاتے۔ ایسے میں منیر نیازی چہکتا تھا اور اس نے ایک دن کہا اوئے یہ تو سونگھ سونگھ کے پی رہا ہے۔ اسے فیڈر میں دو۔ یہ ہمارے لئے بچہ ہے۔ ابھی یہ فیڈر سے شراب پیئے گا۔ پھر میں نے دیکھا منیر نیازی نے خاموشی سے الٰہی بخش کے لئے ایک پیگ بنایا اور اسے سرکا دیا۔ وہ وہیں پانی کی طرح پی گیا۔ گلاس واپس کیا اور منیر نیازی نے کہا جنموں کے پیاسے کے لئے سمندر بھی کم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مضافاتی شاعر ایک دن آ گیا۔ منیر نیازی نے مجھے دیکھا اور کہا اس رنگروٹ کو شامل کرنا ہے یا نہیں۔ میں نے نظروں سے تولا، وہ منیر نیازی کا عاشق نکلا۔ میں نے اشارہ دے دیا اور پھر منیر نیازی نے جیب سے دس روپے نکالے اور کہا اس میں دس روپے اور ملا کر سامنے سے واڈ کا لے آ۔ وہ لے آیا۔ اتنے میں دو مفت خورے آ کر کھڑے ہو گئے۔ جگ اور گلاس آ چکے تھے۔ منیر نیازی نے کہا ان کے لئے بھی گلاس بناؤ کہ مجھے ان میں مستقبل کے ماشکی دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ مستقبل میں ہمیں پلا سکتے ہیں۔ اچانک میرا تصور ٹوٹ گیا اور میرے ہاتھ میں کاغذ تھما دیا گیا اور باہر بھیجا گیا۔ ادھر ایک بس کھڑی تھی۔ اس میں ہمیں بٹھایا جا رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ ہمیں کہاں لے جایا جانا تھا، معلوم نہیں تھا۔ یہ گاڑی لگتا تھا جنگی قیدیوں کو لے جانے کے لئے کبھی استعمال ہوئی ہو گی۔ میں لندن کی پتھریلی گلیوں، عمارتوں اور سڑکوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ انہوں نے ہندوستان پر واقعی ٹھیک قبضہ کیا تھا۔ یہ تو کئی سو سال ہم سے آگے تھے۔ ہم تو پہلے بھی غلام تھے اور اگر انہوں نے غلام بنایا تو پھر کیا ہوا؟ ایک غلام دوسرے آقا کی غلامی میں چلا گیا۔ ہم پہلے بادشاہوں، راجوں، ٹھاکروں اور نوابان کے غلام تھے، اب انگریز آقا بن گیا، کیا فرق پڑا۔ میں غلام ابن غلام کہاں جا سکتا تھا۔ اپنے آپ میں رونے لگا کہ میں جیسے

جینا چاہتا تھا ویسے مجھے کیوں جینے نہیں دیا گیا۔ صرف شاعر ہونے کی اتنی بڑی سزا؟ پھر میں نے سوچا شاعر ہونے کی سزائیں تو بہت سے شاعروں نے برداشت کی ہیں۔ کئی شاعر جان سے بھی جا چکے ہیں۔ ایک تو جعفر زٹلی تھے جس نے بادشاہ کو چیلنج کر دیا اور پھر صاف شفاف مارا گیا۔

اب میں ایک ایسی عمارت کے سامنے کھڑا تھا جو دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ہوگی۔ مجھے بتایا گیا کہ تمہارا اپارٹمنٹ یا فلیٹ یا کمرہ اس منزل پر ہے۔ میں نے اپنے وجود کی گٹھڑی اور ایک معمولی سامان کی گٹھڑی اٹھائی اور چلا گیا۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر مجھے ایک چابی دی گئی کہ تم اور ایک اور ساتھی یہاں یہ سٹوڈیو اپارٹمنٹ شیئر کریں گے۔ دوسرا کون ہوگا؟ شاید پچھلی بس میں آ رہا ہو۔ میں نے وہ سٹوڈیو اپارٹمنٹ کھولا۔ ایک چوہا سامنے سے دوڑ گیا۔ یہ ایک اور طرح کا قید خانہ ہوگا۔ میں نے اسے دیکھا، پرانا تھا مگر بنا ہوا ڈھنگ کا تھا۔ یہ غالباً اسی لئے بنائے گئے تھے کہ جو بھی غریب ملکوں سے سیاسی پناہ کے لئے آئے گا انہیں یہاں ٹھہرائیں گے یا کبھی جنگی قیدیوں کے لئے بھی استعمال کئے گئے ہوں تو کہا نہیں جا سکتا۔ خاص طور پر دشمن کے جرنیلوں کے لئے تو یہ استعمال ہو ہی سکتے تھے۔ میں حیران ہوا کہ ہجرت کرنے والوں کو پاکستان بننے کے بعد جس طرح ان کی حیثیت کے مطابق مکان اور جائیدادیں الاٹ ہوئی تھیں یہاں بھی ہم پناہ گزینوں کو کئی درجوں میں بانٹا گیا تھا۔ میں چونکہ کسی شمار قطار میں نہیں تھا بلکہ میرا تو نام بھی نیچے کہیں آخر میں حکومت نے میری بیوی کے رشتہ دار کے سفارش پر شامل کیا تھا تو اس کی کیا حیثیت ہونی تھی۔ جو ممبرانِ اسمبلی تھے یا جو سیاسی رہنما تھے یا جو صحافی تھے یا جو براڈ کاسٹنگ کی دنیا سے تھے ان کو ان کی حیثیت کے مطابق گھر الاٹ کئے گئے یہ مجھے بعد میں پتہ چلا۔ ان گھروں میں اندرونی طور پر گھروں کو گرم رکھنے کا پورا سسٹم موجود تھا۔ میرے اس فلیٹ میں یہ سب نہیں تھا۔ اب لندن کی سردیوں میں کیسے رہ سکوں گا۔ یہ ایک سوال آ گیا تھا۔ جواب نہیں تھا۔ ابھی میں اس جگہ کو سمجھنے کی کوشش میں تھا کہ یہ لندن کا کون سا علاقہ ہو سکتا ہے۔ ابتدائی معلومات میں جو بتایا گیا یہ مشرقی لندن کا علاقہ ہے جو زیادہ تر ایشیائی اور روسی ممالک اور کچھ افریقی باشندوں کی آبادی پر مشتمل ہے یعنی یہاں گورے بالکل آباد نہیں تھے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ ہمیں جو پاؤنڈ ایئرپورٹ پر دیئے گئے انہیں مہینے بھر کے لئے مجھے خرچ کرنا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں کھانے پینے کی اشیاء کے دام کیا ہوں گے۔ میں نے اپنا بستر دیکھا۔ اس پر کمبل رکھا تھا۔ ابھی تو موسم بہتر تھا لیکن ایک کمبل تو سردی میں کسی کام کا نہیں ہوگا۔ کچن دیکھا۔ آگ اس میں کیسے جلتی تھی میں واقف نہیں تھا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ میرے ساتھ کسے ٹھہرایا جائے گا۔ کوئی میرے

جیسا ہی ہوگا۔ بیل بجی، میں نے دروازہ کھولا۔ ایک شلوار قمیص اور سندھی ٹوپی میں میری عمر سے ذرا بڑا ایک نوجوان داخل ہوا۔

''سائیں تم کون ہو؟''

''پہلے تم بتاؤ تم کون ہو؟ یہ تو مجھے الاٹ ہوا ہے۔''

''او بابا، یہ ہم کو بھی الاٹ ہوا ہے، یہ دیکھو کاغذ پہ لکھا ہے۔''

''اسی فلائٹ میں تھے آپ؟''

''تو بابا کیا میرے واسطے الگ سے فلائٹ آنی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ آجاؤ اور دیکھو یہ بیڈ میرا ہے جس پر میں نے سامان رکھ دیا ہے۔''

''تو بابا ایسے بولو ناں کہ یہ سیٹ تم نے مل لی ہے۔ وہ اُدھر ہمارے ملک میں بس میں سواری سامان رکھ دیتی ہے تو وہ سیٹ اس کی ہو جاتی ہے۔''

''ہاں میں بھی اُسی ملک سے ہوں اور تمہارے ساتھ آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بابا۔ تعارف بھی ہو جائے گا۔ پہلے ہم دیکھ تو لیں ادھر لندن میں ہم کو رہنا کیسے ہے۔''

''وہ ایک اور بیڈ ہے دیکھ لو۔''

اس نے پورے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ وہ بھی سیدھا جیل سے ایئر پورٹ آیا تھا مگر اس کے چہرے پر خوشی پھوٹی پڑتی تھی گویا وہ جنت میں آگیا ہے۔ وہ لگتا ایسے تھا پھانسی کے پھندے سے سیدھا ہائی جیکرز کی فرمائش پر یہاں آیا ہے اس لئے اس کی خوشی دیدنی تھی اور مجھے سمجھ آرہی تھی۔

''بابا جیسا بھی فلیٹ ہے، ہم کو منظور ہے۔ بابا اُدھر جیل میں تو وہ ہم کو مارنے کا بندوبست کر چکے تھے۔ پتہ مل گیا تھا کہ صبح سویرے نکال کر گولی مار دیں گے۔ نہ پتہ نہ نشان۔''

''تم کہاں سے ہو؟''

''بابا بھٹو شہید کا خاص الخاص خادم۔ ان کے جوتے میں ہی سیدھے کرتا تھا۔ لاڑکانہ سے ہوں۔ خاص بھٹو شہید کی حویلی کا نوکر ہوں۔ ازل سے نوکر ہوں سائیں۔ میری اولاد ہوگی تو وہ بھی ان کی نوکر ہوگی۔''

''تم نے ایسا کیا کیا؟ اور کیا سزا ملی؟''

''بابا جب ہمارے سائیں کو ظالموں نے پھانسی دے دی تو سائیں ہمارے کو لگا ہم خود کو پھانسی دے دیں یا آگ لگا کے مر جائیں۔ بے غیرتوں کی طرح تو زندہ نہیں رہ سکتے؟''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''پھر سائیں پیٹرول اٹھایا اور تھانے کو آگ لگا دی۔ ایک دو دفتروں کو آگ لگا دی۔ ہم گوٹھ کے سو لوگ تو ہوں گے جنہوں نے جو حکومت کا دفتر دیکھا، آگ لگا دی۔''

''روکنے والا کوئی نہیں تھا۔''

''جب تک فوج آتی، ہم اپنا کام کر چکے تھے۔ پولیس والے تو ویسے ہی بھاگ گئے تھے۔''

''پھر تم لوگوں کو انہوں نے کیسے گرفتار کیا؟''

''اگلی شام تک ہم سب جیل میں تھے۔ مگر سائیں ہم کو کوئی افسوس نہیں تھا۔ ہم نعرے لگاتے جیل میں گئے تھے۔ جیئے بھٹو۔''

''تو پھر تم کو سزا ہوئی؟''

''ایک پیشی پر ہی پندرہ کوڑوں کی سزا ہوگئی اور سات سال کے لئے قید۔ اگر چھوٹا سائیں جہاز اغواء نہ کراتا تو۔''

''چھوٹا سائیں کون؟''

''سائیں میر مرتضیٰ بھٹو۔ میر شاہنواز بھٹو اور کون؟''

''تمہیں کوڑے لگائے گئے؟''

''ہاں سائیں اگلے دن ہی کوڑے لگانے کے لئے ہم کو لے گئے۔ سخت کڑکی لگی ہوئی تھی۔ جب ہم کو کوڑے لگانے کے لئے ہمارا وزن کیا اور سائیں اُدھر ڈاکٹر نے بولا اس کا وزن کم ہے۔ اس کو پندرہ کوڑے نہیں لگائے جا سکتے۔ تو اُدھر فوجی افسر بولا اس کا وزن پورا کر کے دوبارہ پیش کیا جائے۔ ہم کو واپس جیل میں ڈال دیا۔ پھر جہاز آ گیا۔''

''تم خوش قسمت نکلے، تمہاری جسمانی کمزوری تمہارے لئے نعمت بن گئی۔''

''ویسے سائیں ہم تیار تھے کوڑے کھانے کے لئے۔''

اب میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس کے ساتھ یہاں کب تک رہ سکوں گا یا پھر مجھے اس کے ساتھ رہنے کے لئے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے بعد ان صلاحیتوں کو اپنے حق میں استعمال کر کے

یہاں ا. نے لئے قیام کو گوارا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ مجھے وہ ورکر قسم کا نوجوان لگا جو ہر طرح کا کام کرسکتا تھا۔ مجھے مستقبل میں کچھ روشن لکیریں دکھائی دیں۔ اس کا مظاہرہ اسی شام ہی ہو گیا۔ اس نے اپارٹمنٹ کو صاف کیا، رہنے کے قابل بنا دیا اور کھانے کے لئے اس نے کہا وہ سب کچھ بنا لیتا ہے اس لئے کچھ سودا سلف نیچے سے لایا جائے اور پھر اس نے مجھے رات کو سونے کے قابل بنا دیا۔

....
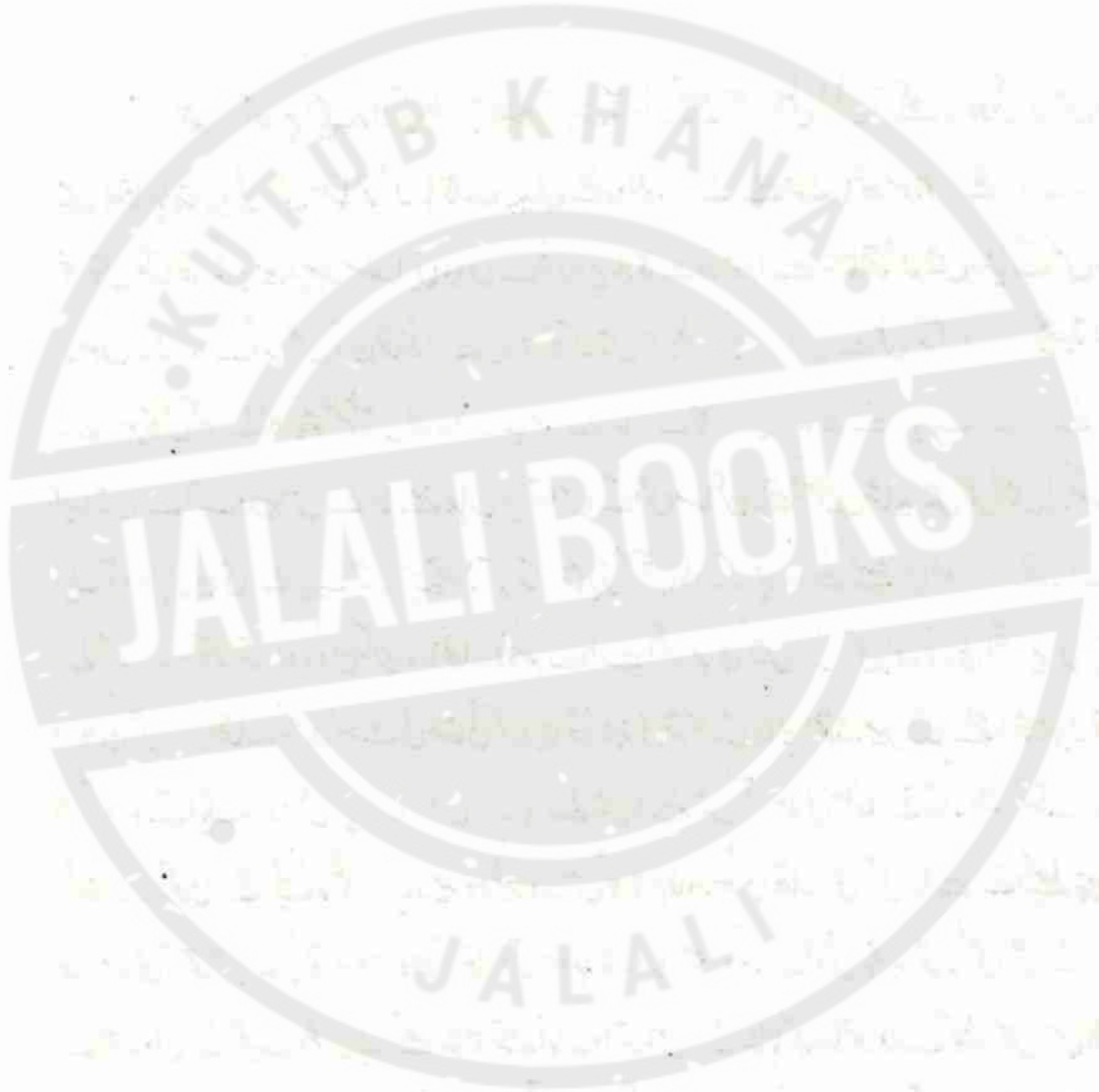
لندن مجھ پر ایک راز کی طرح بہت آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ پہلی خوشی تو مجھے یہ ہوئی کہ میں لندن میں جتنا چاہتا پیدل چل سکتا تھا کہ باقاعدہ پیدل چلنے والوں کے لئے فٹ پاتھ موجود تھے۔ اب میں دن بھر چل سکتا تھا لیکن میرا پہلا مسئلہ اپنی بیوی سے فون پر ملاقات تھا اور اسے بتانا تھا کہ میں دنیا کے کس ریڈار پر ہوں۔ نہ میرے گھر میں فون تھا نہ اسے پتہ ہوگا کہ میں کس فون نمبر پر اس سے مل سکتا ہوں۔ مجھے تو لندن سے باہر کال کرنے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اب یہ میرے سارے کام اس سندھ کے جیالے نے کرنے تھے۔ ایسا میں نے ایک دن اس کے سامنے بیان کیا تو اس کے بھی مسائل تھے جنہیں شاید میں حل نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو وہ اپنی بیوی کے پیٹ میں بچہ چھوڑ آیا تھا۔ شادی کو کل ملا کے چھ سات مہینے ہی ہوئے تھے۔ اب اس نے کب باہر آنا تھا۔ وہ دن گن رہا تھا۔ دوسرے اسے انگریزی نہیں آتی تھی اور فوری انگریزی سیکھنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ وہ اپارٹمنٹ کی صفائی کر دیتا تھا، سبزی ترکاری بنا لیتا تھا۔ میرے لئے اتنا بہت تھا کہ بغیر تنخواہ کے ایک ملازم مل گیا ہے۔ اس کے بدلے میں اسے میں انگریزی سکھانے لگا۔ مثلاً تھینک یو کب کہنا ہے۔ کوئی شے کیسے مانگنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کا نام قادر سولنگی تھا۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر روتا تھا۔ میری آنکھ کھل جاتی تو شرمندہ ہو کر خاموش ہو جاتا۔ دن میں وہ بہت خوش پھرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے سندھ کے اندرون کے عجیب وغریب قصے سناتا تھا۔ ایک واقعہ اس نے سنایا کہ ساتھ والے گوٹھ میں اس کا ایک دوست رہتا تھا۔ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ وہ ویگن چلاتا تھا۔ اکثر راتوں کو گھر نہیں آپاتا تھا۔ اب خوبصورتی پہ یا جوانی پہ پہرہ تو لگ نہیں سکتا۔ ہوتی آئی ہے کہ پکے پھل کو گرنا ہی ہوتا ہے۔ اس نے ایک عاشق پال لیا اور پھر ایک رات جب رات کے پچھلے پہر اس کا خاوند ڈیوٹی سے جلدی گھر آ گیا تو سوچا بیوی کو نیند سے کیا جگاؤں۔ گوٹھوں میں دیواریں تو برائے نام ہوتی ہیں۔ دیوار سے کود گیا اور جب اندر گیا تو کیا دیکھا، اس کی بیوی اور وہ عاشق بے سدھ نیند میں ڈوبے ایک دوسرے سے لپٹے پڑے ہیں۔ اوپر نام کو کپڑا

نہیں ہے۔اب اس نے جو دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ ہر سندھی کے گھر کلہاڑی ہوتی ہے۔ یہ دستور ہے۔اور وہ کیوں ہوتی ہے؟ گلے کاٹنے کے لئے نہیں، راستے میں پیدل چلتے ہوئے کبھی کبھی جھاڑ جھنکار کو کاٹ کر راستہ بنانا ہوتا ہے۔دوسرے راستے میں سانپ نکل آئے تو اسے بھی مارنا پڑتا ہے۔اس نے کلہاڑی اٹھائی اور دونوں کی گردنیں تن سے جدا کر دیں۔نیند میں ہی ابدی نیند میں چلے گئے۔ پھر اس نے ان کی لاشوں کو اٹھایا اور قریبی کنوئیں میں پھینک دیا اور خود روپوش ہو گیا۔ پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔قصے میں عجیب موڑ آ گیا۔وہ کہاں گیا؟ اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ایسا ہی ہوا تھا۔جب میں نے یہ بات قادر سولنگی سے پوچھی تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔ پھر وہ بولا سائیں نہ آسمان کھا جاتا ہے نہ زمین نگل لیتی ہے۔ بندہ بھیس بدل لیتا ہے اور آپ کے پاس کہیں نہ کہیں ہوتا ہے۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''سائیں سمجھاتا ہوں۔سندھ کی سرزمین صدیوں کے نشے میں گم رہتی ہے۔یہ جو صدیوں کا نشہ ہے سائیں یہ کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔بندہ گمان میں رہتا ہے کہ اس کے کندھے پر صدیاں سوار ہیں پھر وہ ان ہی صدیوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ایسا ہی سندھ کی دھرتی کے ساتھ ہوا ہے۔''

''مجھے بتاؤ اس کہانی کا انجام کیا ہوا؟''

''سائیں چار سال گزرے کہ میں حضرت سائیں کی سرکار کے عرس حضرت شہباز قلندرؒ کی حاضری کے لئے گیا تو سائیں ایک اُطاق پر عورتوں کا ہجوم دیکھا۔طرح طرح کے برقعے،طرح طرح کی چادریں،طرح طرح کے چڑھاوے۔ بچے ساتھ میں بوڑھے ساتھ میں۔تو سائیں ہم بھی ساتھ لگ گئے۔جب میں قریب گیا تو مرشد کا دیدار ہوا۔سندھی ٹوپی،سندھی اجرک میں تسبیح ہاتھ میں، آنکھوں میں سرمہ، داڑھی اور سر کے بال برابر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔میں پیش ہوا۔آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو وہ چونکے۔میں نہ چونکا۔میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا'' قادر سولنگی تیری مراد پوری ہوگی۔''

میں حیران ہوا اور پوچھا'' مرشد آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میرا یہ نام ہے۔''

''تو ہم کس لئے یہاں بیٹھے ہیں۔زور سے آواز دے کے بتاؤ کہ ہم نے تمہارا نام لے کر بات کی ہے۔ہم وہ بھی جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔بولو اور بتاؤ کہ ہم نے تمہیں غیب کے علم سے پہچانا ہے۔ بولو۔'' اب میری باری تھی۔میں نے بتایا تو مجمع بے قابو ہو گیا کہ معجزہ ہوا ہے اور ایک سائل کو مرشد نے نام سے پکارا ہے۔یہ سب تو ہوتا رہا۔میں نے پہچان لیا کہ یہ تو وہ میرا دوست ہے جو دو قتل کر کے روپوش ہو گیا

تھااوراس نے حضرت شہباز قلندرؒ کے مزار پر ملنگ بن کر پناہ لے لی تھی۔ وہ ملنگ بن چکا تھا!! ور پولیس اسے گرفتار نہیں کر سکتی تھی کہ پولیس کو کیا پتہ تھا کہ ایک مجرم فقیری بھیس لے چکا ہے۔اب میں اس کے قریب گیا۔اس نے مجھے گلے سے لگایا اور کہا ''میرا یہ راز اپنے سینے میں دفن کر دینا۔''

یہ قصہ سن کر مجھے قادر سولنگی کے اندر سے کئی کہانیاں جنم لیتی محسوس ہوئیں لیکن وہ اتنی جلدی تو مجھے اپنے تجربے سے واقف نہیں کر سکتا تھا۔سو وقت گزرتا رہا۔میں نے پاکستان بیوی کو خط لکھ دیا کہ ایک دن میں لندن میں گھوم رہا تھا کہ ایک جگہ ''لندن پوسٹ'' کا لفظ دیکھا اور وہاں لفافہ اور ٹکٹ لے کر گھر خط لکھ دیا۔اتنی ہی تیزی سے جواب آ گیا۔میں نے اپنے اسی اپارٹمنٹ کا پتہ بھیجا تھا۔اب وہاں ڈاک آنے لگی۔سعدیہ نے ایک سکول میں پڑھانے کی ملازمت لے لی تھی اور وہ سکول جلد ہی کالج بننے والا تھا۔مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ محنت کر کے ہمارے بچے کو پڑھائے گی۔میں کسی معجزے کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔مجھے یہ مارشل لاء دور تک پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔یہاں لندن کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔کچھ سیاسی لیڈر لندن بھاگ کے آ چکے تھے اور وہ یہاں سے اپنا سیاسی کیریئر جاری رکھے ہوئے عوام کی نظروں میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے جبکہ وہ لندن میں مکمل عیاشی اور کاروبار دونوں پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ میں بالکل کورا کاغذ تھا۔مجھ تک خبریں بھی دیر سے پہنچتی تھیں۔مجھے کیسے معلوم ہو پاتا کہ فیض احمد فیض اور احمد فراز بھی آ چکے تھے اور ایک ادارہ اردو مرکز بھی تھا جسے افتخار عارف کراچی سے ٹیلی ویژن چھوڑ کر اس کی سربراہی کر رہے تھے اور تو اور زہرہ نگاہ اپنے خاوند ماجد صاحب کے ساتھ رہتی تھیں اور فیض اور فراز اکثر ان کے مہمان ہوتے تھے اور چھوڑیں بی بی سی اردو سروس پر کئی اردو کے عاشق اور ادیب موجود تھے مگر میں چند نظموں اور چند نظموں کے تراجم کے ساتھ کیا معنی رکھتا تھا۔کوئی یہ جان کر خوش نہ ہوگا کہ میں نے شاہی قلعہ میں معلوم نہیں کتنے دن اذیت برداشت کی ہے اور موت کے منہ سے نکل کے آیا ہوں۔یہ تو سیاسی ایلیٹ کلاس ہے جنہوں نے ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی بھی اسی جلاوطنی کے ایجنڈے میں کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے کہ وطن میں نیک نامی بھی قائم رہے کہ اس مارشل لاء کے بعد پھر ان کی حکومتیں آنی ہیں اور پھر انہوں نے بھٹو سے وفاداری کی سند کو استعمال کرنا ہے جبکہ مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب یہاں سیاست کے نام پر ہر طرح کا کاروبار اور عیاشی کر رہے ہیں۔گویا لندن اب میرے لئے ایک اور غلامی کے دور کا دلچسپ تجربہ تھا۔

وہ راجے مہاراجے اور ان کی نسلیں ہندوستان میں جس میں پاکستان بھی شامل تھا، انگریزوں

کے سامنے باقاعدہ لیٹ گئے۔خراج ادا کیا اور اپنی بیویوں کو جمخانہ میں رقص کے لئے گوروں کے حوالے کیا اور بدلے میں رعایا کے سامنے سرخروئی کی سند لی اور اپنے کھوئے ہوئے وقار واقتدار کو عوام کی نظروں میں بحال کرنے کا سامان کیا جس کا کچھ حصہ عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں آچکا تھا۔اب انہی کی اولاد میں بچی کھچی زمینوں اور جاگیروں کو ٹھکانے لگا کر لندن میں اپنے آقا سے باقی ماندہ زندگی ایک اور طرح کی غلامی میں گزارنے کا بندوبست کر چکے تھے۔ایسے مجھے ایک دن سڑک پر گزرتے ہوئے پب دکھائی دیا۔بس سن رکھا تھا کہ پب ایک شراب خانہ ہوتا ہے مگر اس کا کلچر، اس کا ماحول، اس کی فضا ادبی، تاریخی، ثقافتی اور فنون لطیفہ سے متعلق بحثوں کے لئے انتہائی موزوں ہوتی ہے۔یہ ہفتے کی ایک شام تھی۔ لوگ کام سے واپس آکر اگلے دو دنوں کی چھٹیوں کے تصور میں خوشی سے ڈوبے جا رہے تھے۔ میں نے شراب چکھی ضرور تھی منیر نیازی سے مگر اب گرہ میں مال کہاں ہوسکتا تھا۔اس لئے میں اندر گیا اور گوروں کی آوازیں جو مل جل کر عجیب تاثر دے رہی تھیں، میری گرفت میں آنے سے انکاری تھیں۔میں باہر آ گیا اور مجھے اردو ناولٹ کا پہلا شاہکار ''لندن کی ایک رات'' یاد آ گیا جسے میں نے ایم اے میں پڑھ لیا تھا۔یہ سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔ان کی اس زمانے کی تحریر تھی جب وہ لندن پڑھنے گئے تھے۔وہ پب کی ایک رات تھی جس میں ہندوستان جس میں پاکستان بھی شامل تھا اور بنگلہ دیش بھی۔

یہ 1930ء سے 1935ء کا وقت ہو گا جب ہندوستان پر انگریز کے پنجے مضبوطی سے گڑے تھے۔پہلی جنگ عظیم گزر چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم کو ابھی آنا تھا۔ایسے میں ہندوستانی نوجوان جن کے بزرگوں نے یا تو جاگیرداری سے یا ریاستوں کی ملکیت سے یا اپنی ٹیکنوکریٹ حیثیت سے سوچا تھا کہ اپنی اولادوں کو ولایت بھیج دیں اور سکہ تو ولایت کا چلتا ہے تو پھر یہ وہاں سے کچھ بھی کر کے آ گئے تو ہندوستان کے اعلیٰ عہدے ان کے پاؤں کی دھول ہوں گے۔ایسا انہوں نے غلط نہیں سوچا تھا۔ایسا آج تک چلا آ رہا ہے۔سجاد ظہیر اور وہ نوجوان ہندوستان کے بڑے گھروں کے چشم و چراغ تھے اس لئے وہ بڑے خواب دیکھ سکتے تھے۔بڑے خواب بھی بڑے لوگ ہی دیکھا کرتے ہیں۔میرے جیسوں کے خواب بھی میری حیثیت کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔سید سجاد ظہیر کے خواب بھی ان کے بزرگوں کے خواب تھے کہ اس رات اس پب میں ہندوستان سے آئے ہوئے طالب علموں نے ایک ملاقات کی۔یہ وقت دنیا میں اشتراکی اور کمیونزم کے انقلاب کے آنے کی نوید تھی۔اس وقت ان ہندوستانی طلباء کا مسئلہ انگریزوں کی غلامی سے نجات کی بجائے ہندوستان میں برابری کا کمیونسٹ نظام لانے کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔یہ طالب علم

ہندوستان کے مختلف حصوں سے وہاں موجود تھے اور اس ناولٹ میں ان کی گفتگو ہے۔ اس وقت انہیں لگتا تھا انقلاب ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ بنگال کے مزدوروں، کسانوں میں ایک لہر پہلے سے موجود تھے۔ مختلف فلاحی تحریکوں اور سماجی سروکار کی تنظیموں نے پڑھے لکھے ہندوستانیوں میں ایک جوت جگا دی تھی کہ جلد ہی وہ موسم آ سکتا ہے جس میں ہندوستان کے غریب عوام ایک بڑی تحریک کا حصہ بن جائیں گے اور پھر انگریزوں کو یہاں سے جانے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا۔ یہ سب وہ نوجوان تھے جو کھاتے پیتے گھروں سے تھے اور ان کے اندر ایک رومانوی ہیرو موجود تھا جو نئے مغربی خیالات اور روسی فکشن کی روشنی میں اپنے ہندوستان کو بھوک اور غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھ دی۔ سجاد ظہیر نے واپس آ کر اس تحریک کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک شعلہ بن گئی اور ایک مجموعہ افسانوں کا عجلت میں چھاپ دیا۔ نام تھا ''انگارے۔'' وہ ایسے انگارے تھے جن میں آگ نہیں تھی۔ پھر بھی انگریزوں کو کسی نے ایسا گمراہ کیا کہ اس پر پابندی لگا کے اس تحریک کو ہوا دے دی۔

میں اُس پب سے جلدی نکل آیا۔ میں یونہی بے مقصد گھومتا رہتا تھا اور تھک کر واپس آ جاتا۔ مایوسی اور اداسی میں آگے کے لئے سوچنے کی کوئی اُمنگ اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ میر امن کے چار درویشوں کی طرح گلے میں کفنی ڈالے کسی قبرستان میں دیا جلا کے بیٹھا تھا اور چاہتا تھا کوئی میری کہانی سنے مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے سوچا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اسی لندن میں بے شمار پاکستانی قانونی طور پر موجود ہیں اور سیاسی پناہ لئے ہوئے ہیں۔ تمہیں کسی نہ کسی سے رشتہ بنانا پڑے گا ورنہ تم کیسے رہ سکو گے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں اکیلی سڑک پر اکیلا چلا جاتا تھا۔ احمد مشتاق کا یہ شعر مجھ سے بری طرح لپٹ گیا۔ یا شعر رو رہا تھا یا میں رو رہا تھا:

اپنے گلے میں اپنی ہی بانہوں کو ڈالیے
جینے کا اب تو ایک ہی ڈھنگ رہ گیا

اچانک ایک عمارت کے برآمدے میں مجھے گدڑی میں ایک باریش آدمی کہ جوان سا تھا، نیم وا آنکھوں سے دیکھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے فرش پر بستر جما رکھا تھا اور ایک بے حد خوبصورت کتا جس کے گلے میں بہت اچھا چرمی پٹہ بندھا تھا اور جسم پر سردی سے بچنے کے لئے کوئی سویٹر اوڑھ رکھا تھا۔ میں نے دیکھا وہاں ایک پلے کارڈ پر لکھا تھا ''Home Less''۔ وہ کتا میں نے کسی سے پوچھا کہ کس نسل کا ہو گا تو

ایک گورے نے بتایا یہ کتا بہت اچھی نسل کا ہے جسے Saint Bernard کہتے ہیں۔ یہ نام میں نے سن رکھا تھا۔ وہ کتا مجھے دیکھنے لگا۔ اب میں شرمندہ ہوا کہ میرے پاس اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ دراصل وہ کتا اپنے مالک کو پال رہا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگ کچھ نہ کچھ دے جاتے تھے اور وہ کتا اپنی خوراک بھی حاصل کرتا تھا اور اپنے مالک کے لئے بھی اسے بھیک مل جاتی تھی۔ مجھے اپنے وطن میں ریچھ اور بندر کا تماشا دکھا کر بھیک مانگنے والے یاد آ گئے۔ مگر وہ بارلیش گورا گدڑی میں لیٹا رہتا تھا اور وہ کتا آنے جانے والوں کی توجہ میں رہتا تھا اور لوگ اس کے لئے اور اس کے مالک کے لئے خوراک دے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ میری اس کتے سے دوستی ہوگئی۔ وہ ایسے میں نے معلوم کیا کہ Saint Bernard کیا پسند کرتا ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ پکا ہوا گوشت کھاتا ہے تو میں نے اسے گوشت کئی طرح سے ڈالنا شروع کر دیا اور وہ لندن میں میرا پہلا دوست بن گیا۔ میرا لندن میں کوئی دوست نہیں تھا۔ اب میں اس کے لئے اہتمام سے دو وقت کی خوراک بناتا اور اسے دو وقت ڈالتا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور وہ بھی میرا انتظار کرنے لگا تھا۔ جب وہ مجھے وقت پر آتا دیکھتا تو محبت اور بھوک سے کھڑا ہو جاتا اور اشتیاق میں ہلکورے لینے لگتا۔ یہ بات اس کے مالک نے محسوس کر لی تھی۔ اب میں نے اس کے مالک کے لئے بھی سستا سا برگر لے کر آنا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ میری اپنے کتے سے محبت کو حسد سے نہ دیکھے۔ اب یہ رشتہ چل نکلا۔ میرے پاس تو محدود قسم کی رقم ہوتی تھی کہ میں سیاسی پناہ کے پیسوں پر پل رہا تھا پھر بھی میں اپنے دوست کتے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا کہ لندن میں میرا وہ واحد دوست تھا اور وہ مجھے دوست کی طرح چاہتا تھا۔ وہ میرے ہاتھ باقاعدہ چاٹتا تھا اور مجھ سے لپٹ جاتا تھا۔ بس یہاں سے خرابی شروع ہوگئی۔ وہ گورا جس نے "Home Less" کا کارڈ لگا رکھا تھا وہ کون تھا، کیا تھا مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں تو اپنے نئے دوست کو جانتا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کتا جس کی ملکیت ہے وہ مجھے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔

ایک دن جب میں اپنے دوست کے لئے اور اس کے مالک کے لئے خوراک لے کر آیا تو وہ جگہ خالی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کوئی بتانے والا تھا کہ وہ "Home Less" کہاں گیا ہے؟ وہ جا چکا تھا اور اب میں لندن میں بالکل اکیلا تھا۔ کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا۔

لندن میں یہ میری پہلی شکست تھی اور پہلی بے وفائی تھی مگر اس کا ذمہ دار اس کا مالک تھا جو انسان تھا۔ جانور بے وفائی نہیں کیا کرتے۔ اس کا مالک سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے کتے کو گمراہ کر رہا ہوں جبکہ وہ اس کی زندگی کا سہارا تھا اور میرے نزدیک اس نے میرے دوست کتے کو غلام بنا رکھا تھا۔ باقاعدہ گلے میں

قیمتی پٹہ ڈالنا اور کیا معنی رکھتا تھا۔ اب جب بھی فٹ پاتھ پر یا کہیں بھی کوئی گورا یا گوری اپنے پالتو کتے کے ساتھ گزرتے تو میں دیکھتا کہ ان میں Saint Bernard کی نسل کا کوئی نہیں۔ کہیں کہیں وہ مل جاتا تو میں حسرت سے اسے دیکھتا رہتا۔ لندن آہستہ آہستہ مجھ پر کھلنے لگا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں پاکستانی اور انڈین ادیب اور شاعر باقاعدہ گروہ بندیوں کے ساتھ موجود ہیں اور ان کے درمیان بڑے بڑے معرکے ہوتے رہتے ہیں۔ میں ابھی تک لندن کے مرکزی دھارے سے باہر تھا۔ ایک تو اپنی کم آمیز طبیعت کے باعث دوسرا میں نے اس جلاوطنی کو قبول نہیں کیا تھا۔ ابھی تک میں ''نومینز لینڈ'' پر کھڑا تھا۔ میں منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی طرح بے وطن اور بے زمین تھا لیکن مجھے جلد سے جلد اپنے لئے کچھ فیصلہ کرنا تھا اور اس فیصلے میں میرے سندھی ساتھی قادر سولنگی نے اہم کردار ادا کیا جسے میں ایک سندھی ملازم سمجھ کے نظرانداز کئے بیٹھا تھا۔ وہ زندگی کے گرم سرد کو اپنے جسم کی کھال پر اتنا سہہ چکا تھا کہ بیس کوڑوں سے بھی اسے خوف نہ آیا۔ خوشی خوشی ٹکٹکی پر چڑھ گیا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ وزن کم نکلا اور ڈاکٹر کوئی انسان دوست تھا۔ قادر سولنگی صبح ناشتہ کر کے نکل جاتا تھا اور پھر شام کے بعد اور کبھی کبھی رات گئے واپس آتا تھا۔ اس نے لندن میں انڈر گراؤنڈ کا پورا نیٹ ورک سمجھ لیا تھا کہ کس لائن پر کون سا سٹیشن ہے اور کون کون سی لائنیں کہاں کہاں کس کس سٹیشن کو جا کر ملتی ہیں۔ وہ ہفتے یا مہینے کا پاس بنوا لایا تھا اور مزے میں پورے لندن میں دندناتا پھرتا تھا۔ اس نے بسوں کا نظام بھی جان لیا تھا اور جو بس سروس ساری رات چلتی تھی اس کی خبر بھی لگا لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ کس بڑے سٹور کی Chain سے سستی گراسری ملتی ہے اور کون سا سٹور چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ شراب کی مختلف اقسام کس سٹور سے ڈسکاؤنٹ پر ملتی ہیں۔ میں اس کی چند دنوں کی کارگزاری دیکھ کر حیران رہ گیا اور محسوس کیا کہ یہ تو ہیرا ہے جسے میں پتھر سمجھ کے نظرانداز کر رہا تھا۔ اب مجھے اس کی قدر معلوم ہوئی۔ وہ اسی طرح اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی کے ساتھ میرے کپڑے بھی دھونے لگا کہ یہ اسے اچھا لگتا تھا۔ جب وہ اپنے کپڑے دھوتا تو میرے بھی ساتھ ہی دھو ڈالتا۔ یہاں تک کہ ایک دن کہنے لگا سائیں آپ تو شاعر لوگ ہو، پڑھائی لکھائی کرتے ہو، ہم تو نوکر ذات ہیں اور بولیں تو میں آپ کو دبا دیا کروں۔ میں نے کہا نہیں، میں انسان کو برابری کی سطح پر دیکھتا ہوں۔ کوئی چھوٹا بڑا اور مالک نوکر نہیں ہے اور ویسے بھی میں کسی بھی طرح سے تمہارا مالک نہیں ہوں اور پھر میں کون سا ہل چلاتا ہوں یا مشقت کرتا ہوں۔ اس پر اس نے عجیب بات کی۔

''سائیں ہاتھوں کو جسم دبانے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اب ہاتھوں میں کھجلی ہوتی ہے۔ نہ

دباؤں تو میرا اپنا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔''

''قادر سولنگی! اگر تیرا جسم ٹوٹتا ہے تو میں دبا دیتا ہوں۔''

اس پر وہ ہاتھ جوڑ کر میرے پاؤں پڑ گیا کہ سائیں ہمیں اپنی اوقات میں رہنے دو، ہم خدمت گزار قوم ہیں، ہم سے خدمت لو۔''

اس طرح مجھے قادر سولنگی اپنی اس نئی دنیا میں روشنی کی ایک کرن محسوس ہوا۔

اب مجھے نکلنا چاہئے اور اپنے نئے رشتے نئے راستے معلوم کرنے چاہئیں کہ پاکستان میں حالات جلدی تبدیل ہونے والے نہیں تھے۔ ایک دن اطلاع ملی کہ پاکستان ہائی کمیشن اور پھر ویسٹ منسٹر اسمبلی کے سامنے پاکستان میں مارشل لاء اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے۔ قادر سولنگی ہی یہ خبر لایا تھا اور پھر ہم وہاں پہنچے۔ اچھا خاصا مظاہرہ تھا جس میں ہم جلاوطنوں کے ساتھ پہلے سے وہاں رہنے والے پاکستانی اور کچھ سکھ بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس روز میں نے پاکستان ہائی کمیشن اور سینٹرل لندن کی بہت سی جگہیں دیکھیں جن کا ذکر کئی کتابوں میں موجود تھا۔ اب میری آنکھ کھلنی شروع ہوئی۔ اس مظاہرے میں میری ملاقات ایک پکے ترقی پسند شاعر سے ہو گئی۔ اس نے میرے متعلق کچھ سن پڑھ رکھا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا میں اسی فلائٹ میں تھا جس میں دو اور شاعر بھی تھے۔ ایک پشاور سے ایک لاہور سے جس کی بیوی پارٹی کی رکن تھی۔ وہ دونوں شاعر مظاہرے میں نہیں آئے تھے۔ وجوہات تلاش کرنے کی کس کو ضرورت تھی۔ وہ شاعر نام کے ساتھ لائلپوری لگاتا تھا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ جب اس نے پاکستان چھوڑا تھا تو اس وقت لائلپور کا نام فیصل آباد نہیں پڑا تھا اس لئے وہ پیدائشی لائلپوری ہے اور مرتے دم تک لائلپوری رہے گا۔ اس نے اپنا یہ وچن ساری زندگی نبھایا۔

میری لندن سے یہ اچھی ملاقات تھی۔ مجھے قطعی دلچسپی نہیں تھی کہ پاکستان مارشل لاء سے کب آزاد ہوتا ہے نہیں ہوتا، انقلاب کس چڑیا کا نام ہے، میں اب بھولنے لگا تھا۔ پاکستان سے خبریں آ رہی تھیں۔ وہی جبر و ظلم کا موسم، وہی رسن و دار کی فضا۔ جو بھاگ سکتا تھا بھاگ کر لندن آ چکا تھا کہ جس انگریز نے ہندوستان کے پہلے دو ٹکڑے کئے پھر تین ٹکڑے ہوئے وہ لندن میں بھی ہندوستان کو تقسیم در تقسیم کرنے کی مہارت رکھتا تھا۔ جب کسی ثابت چیز کے ٹکڑے ہونے لگیں تو سمجھ جائیں کہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا عمل رکے گا نہیں، یہ جاری رہے گا۔

اب اس مظاہرے میں وہ سیاسی رہنما بھی آئے ہوئے تھے جو انیس سو ستر اور پھر ستتر کے

انتخابات میں کامیاب ہوئے تھے اور مارشل لاء کے فوراً بعد فرار ہو کر بغیر کوئی سزا برداشت کیے لندن آ گئے تھے۔ یہ چُوری کھانے والے مجنوں یہاں مظاہرے کی قیادت کر رہے تھے اور بلند بانگ دعوے کر رہے تھے کہ بھٹو کے خون کا بدلہ لیں گے۔ قاتلوں کو چوک میں لٹکائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ پھر یہ کرنا ہی تھا تو یہاں لڈو لینے آئے ہو۔ جاؤ لڑو مارشل لاء کے حکمرانوں سے۔ یہ جو منافقت اور دوغلہ پن پاکستان کی سیاست میں آیا تو اس کی جڑیں بہت پیچھے سے تھیں۔ پہلی بار یہ منافقت یا دوغلہ پن پہلے وزیر اعظم نواب لیاقت علی خان سے شروع ہوا۔ ایک تو راجے مہاراجے جا چکے تو پھر نام کے ساتھ نواب لکھنا کیا معنی رکھتا تھا۔ ہزار طرح کی پاکستان سے محبت اور وابستگی اپنی جگہ مگر ان باتوں کی تاریخ میں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ دوغلہ پن اس وقت نمودار ہوا جب پاکستان کی فوج کی انٹیلی جنس ایجنسی نے ایک بات پالی تھی کہ راولپنڈی میں ایک فوج کے افسر کے گھر ایک ڈنر پر چند لوگ جمع ہوئے تھے جن میں اس وقت کا ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض بھی تھا اور سب سے نوجوان لیفٹیننٹ ظفر پوشنی بھی تھا۔ باقی کردار تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ ڈنر پارٹی تھی جس میں شراب بھی موجود تھی اور شراب فیض صاحب کی کمزوری تھی اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ اس وقت دنیا کی ساری افواج میں شراب ایک باقاعدہ کلچر کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ آپ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی فلمیں دیکھیں، فوجیوں کے دفاتر میں شراب موجود بھی ہوتی تھی اور ہر طرح کے فیصلوں کے وقت وہ پی جا رہی ہوتی تھی۔ اس ڈنر کی بھنک سکیورٹی اداروں تک پر لگا کر پہنچی اور جو اس ڈنر ٹیبل پر نہیں بھی ہوا تھا وہ تک رپورٹ میں شامل ہو گیا اور اس کا نام ''راولپنڈی سازش کیس'' رکھ دیا گیا۔ وزیر اعظم صاحب نے اسمبلی کو اگلے روز نوید سنائی کہ ہم نے ملک کے خلاف ایک بڑی سازش پکڑ لی ہے۔ کچھ فوجی اور سول اشخاص مل کر ملک کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ ہم نے سب کو گرفتار کر لیا ہے۔ وہ سب روس نواز کمیونسٹ تھے۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے روس کا دورہ بدل کر امریکہ کا سفر اختیار کیا۔ پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔ تاریخ کے کچھ صفحات مکمل طور پر خاموش کر دیئے گئے یا پھاڑ دیئے گئے۔

ہماری سیاست میں بے اصولی اور منافقت کی ٹیڑھی اینٹیں رکھی جا چکی تھیں اور اب لندن میں جلاوطنی کے نام پر ایک اور سیاست ہو رہی تھی۔ اس طرح کی اکا دکا خبریں بی بی سی اردو پر سر چڑھ کے بول رہی تھیں اور پاکستان میں یہ واحد ذریعہ تھا خبر رسانی کا جس پر سب کو اندھا اعتقاد تھا۔ یہاں سے ان جلاوطن سیاست دانوں کو زندگی مل رہی تھی۔ زیادہ تر سیاست دانوں کا ایک ہی پارٹی سے تعلق تھا کہ عتاب میں وہی آئی ہوئی تھی۔ یہ پنجاب اور سندھ سے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں پنجاب سے کچھ درمیانے طبقے

کے سیاست دان تھے کہ بھٹو صاحب نے عام ورکر یا نظریاتی کارکنوں کو بھی ٹکٹ دیئے تھے۔ اکثریت جاگیرداروں پر مشتمل تھی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ سندھ کے وڈیرے سیاست دانوں میں جتوئی، بلوچ، سید اور تالپور لندن میں موجود تھے۔ پنجاب سے ملک، شیخ اور ایک میر صاحب موجود تھے جن کا راولپنڈی سے تعلق تھا۔ اب یہ یہاں کیا کرنے والے تھے اس کا مجھے علم کیسے ہوسکتا تھا۔ میں نے تاریخ پر نظر ڈالی تو مقبول عام تصور سامنے آگیا کہ ہم نے انگریز سے آزادی حاصل کی اور ہندوستان آزاد ہوگیا اور ساتھ میں پاکستان بھی جو وجود میں آیا تو وہ بھی خود بخود آزاد ہوگیا۔ یہ بھی مقبول تصور تھا کہ ہم نے آزادی کے لئے بڑی جدوجہد کی اور انگریز کو یہاں سے بھگا دیا۔ پھر بھی تصور عام ہے کہ ہم نے آزادی کی خاطر لاکھوں جانوں کی قربانیاں دیں۔

ان تصورات کو کس کس تاریخ دان نے چیلنج کیا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ میں ایک معمولی سا لیکچرر تھا جو ادب پڑھاتا تھا۔ جب میں نے ہندوستان کی تقسیم پر کتابیں دیکھیں اور بی بی سی کی دستاویزی اور فیچر فلمیں دیکھیں تو معلوم ہوا ہندوستان کے تمام ریاستوں کے راجے مہاراجے، نواب، ٹھاکر اور کنور انگریز کی غلامی میں آسودگی حاصل کر چکے تھے۔ ان کی کاغذی حکمرانی اور جھوٹی آن بان موجود تھی۔ باقی رہ گئی رعایا تو وہ بھی تقسیم تھی۔ اس لئے کوئی ملک گیر تحریک آزادی کی موجود نہیں تھی جس سے انگریز کو خطرہ محسوس ہوتا۔ وہ تو آسانی سے عام لام بندی کے تحت ہندوستان کے کسانوں کو دوسری جنگ عظیم کے ایندھن کے طور پر بحری جہاز بھر کے لے گیا تھا۔ چرچل نے ہی دوسری جنگ عظیم کے آخر میں ہندوستان کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا کہ پاکستان کی تحریک موجود تھی جو انگریزوں کے خلاف نہیں، ہندوؤں سے آزادی کی تحریک تھی اور ہم آزادی کی کس جدوجہد کی بات کرتے ہیں۔ یہ کس سے آزادی تھی۔ یہ تو اپنا الگ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد تھی۔ چرچل نے جب اپنے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو طلب کیا اور اسے تقسیم کا پورا پلان دیا تو اس نے واپس آکر ہندوسکھ مسلمان لیڈروں کو یہ پلان بتایا تو وہ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی کہ اتنی جلدی کی تو وہ توقع ہی نہیں رکھتے تھے۔ بی بی سی کی فلم میں دکھایا گیا کہ محمد علی جناح نے حیران ہوکر پوچھا کہ اسے تو اپنی مسلم لیگ کے دیگر رہنماؤں سے ابھی مشاورت کرنی ہے تو اس پر وائسرائے کا جواب تھا جو فلم میں موجود ہے:

"Mr.Jinnah this is not a saggestion, this is an announcement"

اب اگر ہم اس مقبول تصور کا جائزہ لیں کہ ہم نے آزادی کی خاطر لاکھوں جانوں کی قربانیاں دیں تو یہ بھی محل نظر ہے۔ قربانی کا تصور یہ ہوتا ہے کہ جو قربانی دے رہا ہوتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پسند اور مرضی سے یہ قربانی پیش کر رہا ہے اور اس کی جان اس قربانی میں جا بھی سکتی ہے جیسے ہماری فوج کے جوان دشمن کے خلاف لڑتے ہوئے قربانیاں پیش کرتے ہیں لیکن ہم نے جو لاکھوں جانیں گنوائیں وہ تو غریب خاندان اپنے وطن کی خاطر ہجرت کر رہے تھے اور تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ان پر تو چھپ کر حملے کئے گئے اور ان معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور یہ سب ہندوستان کی تقسیم کے سبب ہوا۔ ان جانوں کا ضیاع ہندوستان کی تقسیم کے سر آتا ہے۔ ان معصوم لوگوں نے جانوں کا نذرانہ یا قربانی اپنی مرضی سے نہیں دی۔ ان پر تو راتوں اور دن میں چھپ کر وار کیا گیا۔ نہتوں کا قتل عام کیا گیا۔ وہ کب جانیں قربان کرنے کے لئے نکلے تھے۔ وہ تو اپنا نیا وطن حاصل کرنے کے بعد آباد ہونے کے لئے اپنے گھر چھوڑ کر سفر کر رہے تھے۔ اب میں تاریخ کو ایک اور نظر سے بھی دیکھنے لگا تھا کہ ہم جو ہندوستان پر انگریز کی غلامی کو نفرت سے دیکھتے تھے اور اپنے غلام ہونے پر ملال کرتے تھے۔ اب اپنی پسند سے دوبارہ انگریز کی غلامی قبول کرنے کے لئے انگلستان میں آباد ہونے کو اپنی خوش قسمتی تصور کر رہے تھے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

میں بہت بے زمین ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ قادر سونگی کو اپنا رہنما بنا کے لندن میں اپنے لئے کوئی ایسا ریڈار حاصل کروں جہاں پر میں سب کو دکھائی دے سکوں یا اپنے لئے کوئی ملازمت تلاش کروں۔ یہ بھاڑے کی زندگی تو میرا کل اثاثہ ہضم کر جائے گی۔ اب جو رات کو قادر سونگی آیا تو میں جاگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا تم سارا سارا دن کہاں رہتے ہو؟ تو اس نے کہانیاں سنانا شروع کر دیں۔

''سائیں کچھ نہ پوچھو، میں تو ناں دراصل سندھی مانٹروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں تا کہ میرے واسطے ادھر کام نکل آئے۔''

''پھر کہاں کہاں گئے اور کیا دیکھا۔''

''سائیں میں وہ بولتے ہیں ناں ایک جگہ جہاں سکھ، ہندو اور مسلمان سب اپنے اپنے مُحلے بنا کے بیٹھے ہیں۔''

''اسے ساؤتھ ہال کہتے ہیں۔''

''ہاں سائیں ہم کو انگریزی نہیں ناں آتی۔''

''تو ساؤتھ ہال بھی دیکھ آئے ہو؟''

''سائیں ادھر تو بڑی رونقیں لگی ہیں، سکھوں کے الگ گوردوارے ہیں، مندر ہیں، مسجدیں ہیں، محلوں کے محلے آباد ہیں۔ پاکستانی اور انڈین کھانوں کی ایک قطار میں کئی دکانیں ہیں۔ سب کچھ ملتا ہے۔ پان کی دکانیں بھی ہیں اور تو اور کھسے اور چادریں پہن کے حقہ پیتے ہیں۔''

''وہ پنجاب سے ہوں گے۔ تمہیں سندھی مانٹروں ملا۔''

''نہیں جی، سندھی تو اپنے گوٹھ سے نہیں نکلتے، ولایت میں کیسے آئیں گے۔ میں شاید پہلا سندھی ہوں جو اس طرح ادھر پہنچا ہوں۔ میں نے تو پہلی بار سکھ دیکھا ہے۔ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ہندو تو سائیں ہمارے سندھ میں بلکہ لاڑکانہ میں بہت ہیں۔''

''کراچی کے لوگ تو ادھر بہت ہوں گے۔''

''ہاں سائیں مگر ہم کو تو سندھی مانٹروں کی تلاش ہے۔ ہم کراچی کو سندھ نہیں سمجھتے۔ وہ تو سائیں ویسے بھی پوری دنیا کا شہر ہے۔''

''تو پھر تم نے ساؤتھ ہال میں کسی سے دوستی کی۔''

''ناں سائیں وہ سب پنجابی تھے۔ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔''

''کس نے کہا تم سے؟ تمہارے لیڈر بھٹو صاحب تو پنجاب سے تحریک چلا کے کامیاب ہوئے تھے۔''

''سائیں مالک کی اور بات ہے۔ ہم تو سائیں کی کمین ہیں پنجابیوں کے لئے۔''

''تو پھر تم اب سندھی کہاں سے تلاش کرو گے۔''

''سائیں ضرورت ہی نہیں ہے، لاڑکانہ کی بھٹو سائیں کی حویلی کا چاکر ہوں، کوئی مذاق نہیں ہے۔ سائیں بھٹو کے اُطاق میں کون نہیں آیا۔ امریکہ بہادر کے سفیروں، وزیروں تک سب آئے تھے۔ سب کے جوتے سیدھے کیئے ہیں تو جو پارٹی کے وڈیرے اِدھر بھاگ کے آئے ہیں سائیں مجھے پہچانتے ہیں۔ میں نے ان کی خدمت کی ہے۔ اب ان کو میری قدر پڑے گی۔''

اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ تو اڑنے والا پنچھی ہے۔ یہ تو محنت کش ہے۔ لندن میں تو اس کی بے حد اہمیت ہے۔ یہاں تو ذاتی ملازم دستیاب نہیں ہوتے۔ ہر کام کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اسے تو کوئی بھی روٹی

کپڑے پر رکھ لے گا اور یہ تو ازل کا غلام ہے، جلدی غلامی قبول کر لے گا۔ پھر میں نے پوچھا:

''تم ملازمت کرنا چاہتے ہو؟''

''سائیں اگر تو اپنی پارٹی کا لیڈر ہم کو رکھ لے تو سائیں اس سے بڑی کیا بات ہوگی۔''

''تم مشکل سے غلامی سے باہر نکلے ہو اور پھر لندن میں بھی غلامی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو۔''

''سائیں ہم نہ غلام ہیں نہ مالک ہیں۔ ہم خدمت گزار ہیں۔ ہم کو ایسے ہی رہنا آتا ہے۔''

اب یہ خدمت گزاری کا کلچر چونکہ سندھ اور سرائیکی علاقے میں عام ہے اس لئے یہ بغیر لکھت پڑھت کے غلام ہوا کرتے ہیں۔ یہ میں جانتا تھا۔ اب میں نے پوچھا:

''تو کہاں تک تم پہنچے اور چاہتے کیا ہو؟ مجھے چھوڑ جاؤ گے؟''

''سائیں، اپنے ایک وڈیرے کے فلیٹ تک پہنچ گیا ہوں۔ جتوئی صاحب ہیں۔ انہوں نے کل آنے کا کہا ہے۔ سائیں لندن کے بالکل درمیان میں ان کا فلیٹ ہے اور میں پہلے بھی سائیں بھٹو کی حویلی میں ان کی خدمت کرتا رہا ہوں۔''

''کیا خدمت کرتے تھے؟''

''سائیں اب نہ پوچھو، ہر سائیں کے ساتھ الگ الگ خدمت ہوتی تھی۔''

''کیا الگ الگ ہوتی تھی۔ بتاؤ۔''

''ہاں سائیں شام پڑتی تو سائیں کا آرڈر تھا کہ بڑے اُطاق (ڈرائنگ روم) میں شراب کے گلاس، پانی، سوڈا اور سائیں کی ولایتی بوتلیں لے کر جاتے تھے اور پھر کئی ٹرے چلتے تھے۔ مونگ پھلی، بادام، پستہ اور کاجو، چلغوزے، ڈرائی فروٹ قسم قسم کے اور سائیں پھر طرح طرح کی مچھلی کی پلیٹیں۔ ہم کو تو سائیں ان کی شکل یاد ہے نام یاد نہیں ہیں۔ سائیں کئی طرح کے خانساماں مقرر تھے۔ کوئی بلوچی، کوئی مکرانی، کوئی پنجابی، کوئی لکھنؤ کا، کوئی دہلی کا، ہر طرح کا پکوان نکلتا تھا اور میز پر سج جاتا تھا۔ سائیں بڑی خدمت کی ہے۔''

''تو اب وہ خدمت تم لاڑکانہ سے لندن لانا چاہتے ہو۔''

''واہ سائیں اللہ آپ کی زبان پوری کرے۔ ہم کو تو سائیں کا چسکا لگا ہوا ہے۔ وہ چسکا پورا ہوگا تو سواد آئے گا۔''

''اس کا مطلب ہے تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟ بے وفائی کرو گے۔''

''سائیں ایسا تو نہ بولو۔ ہم تمہارے کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ ہمارا جتوئی سائیں بڑا منسٹر تھا۔''

''معلوم ہے، جانتا ہوں۔''

''تو سائیں آپ کو بھی کہیں جما دے گا۔''

''خیر میں تو تمہیں جانے نہیں دوں گا۔''

''ناں سائیں جہاں پیر رکھو ادھر بخت ہوگا۔ فکر نہ کرو۔''

''اس پر کل بات کریں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ بھٹو صاحب کو محفلوں میں کیا کھانے پسند تھے اور وہ کیا بنواتے تھے۔''

''سائیں ہم کیا بتائیں۔ سائیں تو بہت کم کھاتے تھے۔ کھانے کے شوقین تو تھے مگر کھاتے نہیں تھے۔ کھانا سجا کر خوش ہوتے تھے۔''

''پھر بھی کچھ تو پسند ہوگا۔''

''سائیں انہیں بھنڈی پسند تھی۔ بھنڈی خالی یا بھنڈی گوشت یا بھنڈی قیمہ کچھ بھی بولو۔ پھر ان کو پلا مچھی پسند تھی۔ کئی طرح سے بنواتے تھے۔ سائیں پھر ایک چیز ہوتی ہے مچھلی کے انڈے۔''

''ہاں جانتا ہوں اس کو ''Caviar'' بولتے ہیں۔''

''سائیں ہم جاہل اَن پڑھ، بولتے تو یہی تھے سب کے سب۔''

''اور بولو کیا پسند تھا۔''

''سائیں ان کو قیمہ آلو، ماش کی دال، کریلے گوشت، کدو گوشت۔ سائیں سب سبزی پسند تھی۔ وہ یہ کڑاہی گوشت اور تکہ اور سری پاوے بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ بولتے تھے جو شے زمین سے نکلی ہو وہ بندے کے پیٹ میں جاتی ہے تو پیٹ میں بھی ہریالی اُگ آتی ہے۔''

''تو یہ جتوئی صاحب تمہیں ملازم رکھیں گے؟''

''ناں سائیں ہم ملازم نہیں ہوتے، ہم تو حویلی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہم خدمت گزار ہوتے ہیں، ہم تنخواہ نہیں لیتے۔ ناں سائیں ہم ان کی خدمت پر ہوتے ہیں۔ ہمارا پورا خاندان اُدھر ہی پلتا ہے۔ روٹی کپڑا سب ان کا ہوتا ہے۔''

''یہ تو گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ تو غلامی ہے۔''

''سائیں آپ اس کو کچھ بھی بولو۔ ہمارے لئے تو سائیں یہ عزت کی بات ہے۔''

''تمہیں پتہ ہے لندن میں نوکر یا ملازم نہیں ملتے اور ہر کام کی ایک فیس ہوتی ہے جو پاؤنڈ میں ادا کی جاتی ہے۔''

''سائیں ہم کیوں جانیں گے، ازل سے ہم ان کے خدمت گزار ہیں۔ اِدھر بھی وہی کام کریں گے اور ہم کو کیا چاہئے۔ ہمارا روٹی کپڑا، ڈاکٹر ماکٹر کا خرچہ تو وہی اٹھائیں گے ناں۔''

''ہاں اسے ہی غلامی کہتے ہیں۔''

''سائیں اب ہم آپ کو کیا بولیں۔ ہمارے پردادا، دادا، باپ اور ہم صدیوں سے پلتے آئے ہیں اور خوش ہیں۔''

''ہاں غلامی میں خوشی کا تصور بھی ہوتا ہے کہ غلام اپنی زندگی کا سارا بوجھ آقا پر ڈال دیتا ہے اور خود میٹھی نیند سوتا ہے کہ اسے نہ سوچنا ہے نہ خود کچھ کرنا ہے۔ جو حکم وہ دے گا وہ بجالائے گا۔ دماغ پر بوجھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسے تم خوشی کہتے ہو؟''

''سائیں ہم کو کچھ نہیں پتہ۔ ہمارا جسم تو وہ کرتا ہے جو وہ کرتا آیا ہے۔''

''اب سنو! یہ جتوئی صاحب تمہیں چوبیس گھنٹے ملازم رکھیں گے۔ صفائی ستھرائی، روٹی کپڑا، کچن میں کھانا پکانا، گاڑیاں صاف کرنا، بستر لگانا، جوتے صاف کرنا، کپڑے استری کرنا، ان کے کتوں کے برتن صاف کرنا، کتوں کو نہلانا، بھلے تم نہا سکو یا نہ نہا سکو۔''

''ہاں سائیں یہ تو ہے۔''

''تو پھر وہ اس کا تمہیں کیا دیں گے۔ بچے کھچے کپڑے، بچا کھچا کھانا اور سونے کے لئے ایک زمین کا کونہ۔''

''یہ تو سائیں ہوتا ہے۔ اس میں غلط کیا ہے؟''

''غلط یہ ہے کہ اس ساری ڈیوٹی کا لندن میں معاوضہ اگر تم کو ملے تو وہ پاکستانی دو لاکھ بنتا ہے۔''

''ناں سائیں ہم کو تو گنتی سو تک آتی ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔''

''تو آگے کی خبر رکھو۔ آگے گنتی اربوں اور کھربوں تک جاتی ہے۔''

''تو سائیں ہم تو کبھی سائیں سے حساب نہیں رکھتے تھے۔''

''یہ لندن ہے، ان کو مفت میں ایک جلاوطن ملازم خدمت کے لئے مل جائے تو ان کو کیا چاہئے۔

ہر مہینے کے ۱۰ لاکھ وہ بچا لیں گے۔''

''ہم ان کے سامنے بول نہیں سکتے۔''

''اس لئے کہ انہوں نے تمہاری زبان ہی تو گروی رکھی ہے۔ کیسے بول سکتے ہو؟''

''سائیں اب رات بہت ہوگئی ہے، نیند آرہی ہے۔''

''تم تو ازل سے نیند میں ہو اور ازل سے تمہاری رات مسلط ہے تم پر، جاؤ سو جاؤ۔''

اور پھر ہم سو گئے۔ اگلے دن وہ رات گئے آیا اور اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ اسے جتوئی سائیں نے بوریا بستر لانے کا کہہ دیا ہے اور اب وہ ان کے پاس رہے گا اور وہ مجھے چھوڑنے کے لئے آیا اور اپنا سامان لے کر جانے لگا تو میں نے پوچھا:

''تمہارا کوئی فون نمبر اور پتہ ہے تو دے جاؤ۔''

''سائیں، ہم تو بس راستہ جانتے ہیں۔ جو بندہ پیدل چلتا ہے وہ کبھی نہیں بھولتا۔ اسی طرح دنیا نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ہے۔ وہی راستے دنیا کا نقشہ بن گئے ہیں۔''

''اچھا یار اتنا ہی بتا دو کہ تمہارے سائیں کے فلیٹ کا پتہ کیا ہے؟''

''سائیں وہ یہ ہے۔''

اس نے لکھا ہوا پتہ مجھے دے دیا اور خود چلا گیا۔ اب میں بے حد اُداس ہو گیا کہ میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا اور مجھے رات کو اکیلے سوتے میں ڈر لگتا تھا۔ کئی طرح کے ڈراؤنے خواب آتے تھے کہ میں ڈراؤنے خوابوں سے بھاگ کر آیا تھا۔ میری نفسیات میں خوف اور دکھ درد شامل تھا۔ میں کیا کرتا؟

میں نے اب اپنے لئے کچھ کھوجنا شروع کیا کہ کون میرا جاننے والا یہاں ہوگا۔ مجھے ان دو جلاوطن شاعروں سے کوئی توقع نہیں تھی۔ ایک تو وہ میری جدید نظم کے ازلی دشمن تھے اور کلاسیکی یا ترقی پسندی سے لپٹی ہوئی غزل کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ پوری جلاوطن فلائٹ میں کوئی بھی تو میرا جاننے والا نہیں تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ اب مجھے ایک دن لاہور سے سعدیہ کا خط ملا۔ اس میں اس نے دور پار کے دو جاننے والوں کے پتے بھیجے تھے جو کچھ سالوں سے یہاں روزی کمانے کے لئے آچکے تھے۔ میں نے وہ پتے دیکھے۔ ان میں سے ایک تو ہنسلو میں تھا اور دوسرا ساؤتھ ہال کے پاس رہتا تھا۔ جب میں نے لائلپوری صاحب کا پتہ دیکھا جو انہوں نے مجھے سنٹرل لندن کے مظاہرے میں ملاقات کے بعد دیا تھا تو وہ بھی ہنسلو میں رہتے تھے۔ اب میں نے ٹھان لی کہ میرا تعلق یہاں بننا ضروری ہے ورنہ میں تنہائی زیادہ دن

نہیں سہہ سکوں گا۔ میں نکل پڑا اور پھر میں نے تیر تکے سے انڈر گراؤنڈ کا استعمال سیکھنے کی کوشش کی۔ یہاں مجھے کچھ کامیابی ہوئی۔ میں ہنسلو ایسٹ پہنچ گیا۔ لندن میں میرا گھر تلاش کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ پہلے میں اُس پتے پہ جانا چاہتا تھا جو مجھے سعدیہ نے بھیجا تھا۔ یہ گھر کا پتہ تھا۔ شام سے ذرا پہلے میں نے وہ گھر تلاش کر لیا۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا۔ چونکہ اس روز ہفتہ تھا اور چھٹی کا دن تھا اس لئے مجھے یقین تھا وہ مل جائے گا۔ جب میں نے بیل دی تو ایک نوجوان نیکر پہنے آ گیا۔ میں نے نام بتایا تو وہ چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ آدمی آیا جس کا نام میں نے بتایا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ میں کون ہوں؟ میں نے تعارف کرایا اور جس وسیلے سے یہاں پہنچا تھا اس کا نام بتایا جو غالباً پاکستان میں اس کا بھائی تھا، یہ سن کر اس نے کہا:

''تو مجھ سے کس لئے ملنا ہے۔ بھائی جان نے آپ کو کس لئے بھیجا ہے۔''

''میں کسی کام سے نہیں آیا۔ بس انہوں نے کہا کہ میں آپ سے مل لوں۔''

''میں تو خود کسی کے ہاں رہ رہا ہوں۔ ہم چھ لڑکے اس مکان کے چھوٹے چھوٹے دو کمروں میں مشکل سے رہتے ہیں۔''

''میں رہنے نہیں آیا۔ میرے پاس رہنے کی اپنی جگہ ہے۔''

''تو بتائیں کوئی کام ڈھونڈنا ہے؟ میں ایک جگہ گراسری کی بڑی چین میں ملازم ہوں۔ مطلب سامان ویئر ہاؤس سے لاتا ہوں۔ بڑی گاڑی چلاتا ہوں۔ لائسنس ہے میرے پاس۔ میں کمپنی سے بات کروں گا۔''

''لیکن مجھے کام بھی نہیں چاہئے۔''

''تو پھر آپ صرف ملنے آئے ہیں...... تو اندر آ جائیں۔''

میں جب اندر داخل ہوا تو ایک زوردار قہقہہ میرے کانوں میں آیا۔ پانچ لوگ فرش پر بچھے غالیچے پر بیٹھے انڈین فلم دیکھ رہے تھے اور امیتابھ بچن کے کسی منظر پر انہوں نے یہ قہقہہ لگایا تھا۔ میں خاصا شرمندہ ہوا کہ یہاں کیوں آ گیا۔ اتنی مشکل سے پتہ تلاش کیا اور یہاں تو میرے لئے مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر ان صاحب سے معذرت کر کے باہر آ گیا کہ پھر کبھی ملوں گا۔ اس نے گویا یہ سن کر خود کو آزاد محسوس کیا اور میں سڑک پر آ گیا۔ اس لمحے مجھے لندن میں اپنا پہلا دوست وہ کتا Saint Bernard یاد آیا جس سے لپٹ کے میں آج سونا چاہتا تھا......

کچھ دیر بے مقصد گھومتا رہا۔ پھر میں اس لائکپوری شاعر کی دکان تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ

گیا۔ دکان کھلی تھی۔ یہ ''آف لائسنس شاپ'' تھی یعنی یہاں ہر طرح کی شراب ملتی تھی۔ ساتھ میں کچھ گراسری جو گھروں کی ضرورت کی اشیاء پر مشتمل تھی، موجود تھی مثلاً انڈے، ڈبل روٹی، آئل، دودھ، روٹیاں، سبزی، چائے وغیرہ۔ لائکپوری صاحب خود موجود تھے۔ مجھے پہچان لیا اور خوش بھی ہوئے۔ کہنے لگے ''یہاں ترقی پسند شاعروں میں بس دو چار شاعر اور ادیب ہیں جن سے میں رسم وراہ رکھتا ہوں۔'' میں نے پوچھا ''ادھر اردو مرکز'' ہے، سنا ہے وہاں فیض احمد فیض، احمد فراز، علی سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند ادیب بھی آتے ہیں۔''

''ہاں کبھی کبھی وہ کوئی جلسہ کرتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ مگر وہ اِدھر کے ادیبوں شاعروں کو کچرا سمجھتے ہیں۔ بڑے دماغ ہیں ان کے۔ خاص طور پر اردو مرکز والے افتخار عارف کے۔''

''کیوں، میں نے سنا ہے وہ بھی ترقی پسندی کی بات کرتے ہیں۔''

''ہم ورکر کلاس ہیں، محنت کر کے یہاں رہ رہے ہیں، ہم کسی چندے یا فنڈ پر نہیں بیٹھے ہوئے۔ وہ سمجھتے ہیں ہم دہلی، کراچی اور لاہور لکھنؤ میں نہیں بیٹھے ہوئے تو ہمیں شاعری کا نہیں پتہ۔ ہم مشہور نہیں ہوئے تو کیا ہوا؟ اِدھر ہم نے اردو کی شمع جلا رکھی ہے۔''

''ہاں میں سمجھتا ہوں۔ کسی بھی تجزیے اور جائزے میں لندن کے ادیبوں شاعروں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ بس ان کو سمندر پار کے ادیب کہہ کر فارغ کر دیا جاتا ہے۔''

''فارغ سے یاد آیا، آپ کی فلائٹ جو جلاوطنوں کو لے کر آئی ہے جس میں آپ تھے، اس میں پشاور سے ترقی پسند شاعر فارغ بخاری اور لاہور سے شہرت بخاری آئے ہیں۔ دونوں بخاری اپنی اَنا کے بخار میں مبتلا ہیں۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو نہیں ملے۔''

''اور فیض صاحب، فراز صاحب تو سنا ہے آج کل بھی یہاں ہیں۔ آپ نے ملنے کی کوشش کی۔''

''کیا بات کرتے ہو، وہ ترقی پسند ضرور ہیں مگر وہ ٹھہرتے بورژوا لوگوں کے گھروں میں ہیں۔ شراب تو میں بھی اعلیٰ پلا سکتا ہوں مگر انہیں سٹیٹس بھی چاہئے جہاں انڈیا سے گوپی چند نارنگ ہوں، یہاں سے ساقی فاروقی ہوں اور پھر زہرہ نگاہ ہوں۔ وہ بھی ایلیٹ کلاس ہیں۔ ترقی پسندی ان کا زینہ ہے اور رہے گی۔''

''مگر آپ تو پاکستان اور ہندوستان کے ہر اچھے ادبی پرچوں میں چھپتے ہیں مثلاً فنون، اوراق،

سیپ، شب خون، افکار وغیرہ۔ میں نے آپ کا کلام پڑھا ہے۔‘‘

’’مگر فیض صاحب یہ پرچے کیوں پڑھیں گے اور فراز صاحب خود سے نظر ہٹائیں گے تو کسی کو دیکھیں گے۔‘‘

ایسے میں کچھ گاہک آئے جنہیں فارغ کیا اور اب انہیں محسوس ہوا کہ عرصے بعد کوئی سامع اور وہ بھی باذوق سامع آچکا ہے۔ انہوں نے گاہک نمٹائے اور کہنے لگے:

’’گھر چلتے ہیں، آپ کو کہیں جانا تو نہیں؟‘‘

’’نہیں میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔‘‘

’’تو بس چلتے ہیں، ہم اپنی دکان بڑھاتے ہیں۔‘‘

انہوں نے سکاچ بلیک لیبل کی ایک بوتل اور کچھ پیکٹ مونگ پھلی وغیرہ کے رکھ لئے اور دکان بڑھا دی۔ گھر ان کا زیادہ دور نہیں تھا اور ہم ایک اچھے سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ ’’میں فریش ہو کر آتا ہوں، آپ ٹی وی دیکھیں۔‘‘

انہوں نے ٹی وی لگا دیا۔ میں دیکھنے لگا مگر میں ان کی باتوں پر غور کر رہا تھا کہ دنیا میں ترقی پسند رائٹرز میں بھی اگر مختلف طبقاتی کلچر ہے تو پھر کہاں کی ترقی پسندی؟ لندن میں فیض صاحب اس لائلپوری شاعر کے گھر کیوں آئیں گے۔ وہ تو وہاں جائیں گے جہاں ان کی آسائش کا مکمل بندوبست ہوگا اور یہ بری بات بھی نہیں ہے کہ انہوں نے ضیاءالحق کے مارشل لاء میں یہ بیان دیا تھا کہ ’’اب جسم مار نہیں سہہ سکتا، اب بوڑھا ہو گیا ہوں، اس لئے مجھے اب راحت چاہیے۔‘‘

ایک شاعر کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ شاعر سے آپ کو بہت سی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ لائلپوری صاحب آ گئے۔ انہوں نے بلیک لیبل سکاچ رکھی دو گلاس، پانی اور سوڈا اور ساتھ میں مونگ پھلیاں، کاجو اور کشمش کی قابیں رکھ دیں۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر کہ وہ بھی پورے دن کی ڈیوٹی دے کر آئے تھے، دو گلاس بنائے۔ مجھ سے پوچھا پانی یا سوڈا؟ برف یا بغیر برف۔ میں نے محسوس کیا ان کی باتیں سچی تھیں۔ اب جب دو دو پیگ اندر گئے تو لائلپوری کا لائل پور جاگ اٹھا۔ انہوں نے دنیا بھر کے ترقی پسندوں کے تضادات کھول کر سامنے رکھ دیئے۔ میں نے محسوس کیا کہ لندن میں معاملہ اتنا آسان نہیں ہے کہ یہاں کئی طرح سے پاکستانی آئے ہیں اور اب میرے جیسے بھی آئے ہیں تو کیسے اندازہ ہو کہ فیض صاحب لندن میں جلاوطنی تکلیف میں گزار رہے ہیں یا مزے میں۔ اب تیسرے پیگ پر

لائکپوری نے بتایا کہ وہ لڑکپن ہی میں مزدور کسان پارٹی کے میجر اسحاق اور بنگش سے بہت متاثر ہوئے اور ترقی پسندی کا علم اٹھالیا۔ میجر اسحاق کے پنجابی ڈرامے ''مصلی'' میں اداکاری بھی کی اور پھر قسمت یہاں لے آئی۔

''یہاں فیض صاحب سے کبھی ملے؟''

''ہاں سرسری ملاقاتیں جیسی چاہنے والوں کی اپنے گرو سے ہوتی ہیں۔ ایک مشاعرے میں انہوں نے مجھے سنا تو کہنے لگے دیکھو غزل میں شعلے کم اور دل گداز زیادہ اثر پیدا کرتا ہے اور میں نے ان کی بات کو سمجھ لیا تھا۔ مجھے معلوم ہے فیض صاحب یہاں خوشی سے نہیں رہتے۔ ان کا دل پاکستان میں رہتا ہے، بیوی بچوں کے پاس۔ میں نے انہیں دکھی ہوتے دیکھا ہے۔''

''پھر تو وہ اگر اپنے ان چاہنے والوں کے پاس رہتے ہیں جو اُن کی ناز برداری کر سکتے ہیں اور انہیں راحت دے سکتے ہیں تو اس میں کیا بری بات ہے؟''

''ہاں میں سمجھتا ہوں جو شاعر اپنی شاعری میں ڈی کلاس ہو جاتا ہے تو اسے حقیقی زندگی میں ڈی کلاس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروری نہیں وہ کسانوں مزدوروں کے ساتھ خوار ہوتا رہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ بلیک لیبل اپنا اثر دکھا رہی تھی اور لائکپوری کے اندر کا صاف ستھرا انسان اور روشن دماغ باہر جھلک رہا تھا۔ میں نے لندن میں رہنے والے صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ادب دوستوں کا بھی پتہ لگا لیا۔ یہ لوگ کب کب پارٹیاں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ پاکستان سے آنے والے مشہور شاعروں، گلوکاروں اور فن کاروں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں مگر میں تو مشہور شاعر نہیں تھا اس لئے مجھے ابھی سب سے متعارف ہونا تھا۔ ایسے میں لائکپوری نے پہلے میری ایک نظم جو بھٹو صاحب کی شہادت پر تھی، سنی اور پھر ایک آدھ اور نظم۔ اس کے بعد انہوں نے انکساری کے ساتھ اپنی دو غزلیں سنائیں اور پھر کھانے کی اندر سے آواز آ گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے دیکھا رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایسے میں ایسٹ لندن اپنے اس فلیٹ تک پہنچنا میرے لئے ایسے تھا جیسے روشنی میں جگنو تلاش کرنا۔ لائکپوری صاحب کو میری بے بسی کا احساس ہو گیا۔ ایسے میں مجھے سڑک پر دھکا دینا کسی بھی طرح کی انسان دوستی نہیں تھی۔ انہوں نے کہا ''آپ کو یہیں ڈرائینگ روم کے قالین پر بستر ڈال دیتا ہوں، صبح ناشتہ کر کے چلے جانا۔'' مجھے اپنے تنگ و تاریک بیرک نما فلیٹ سے ایک رات کے لئے ہی سہی، نجات مل رہی تھی۔ میں وہی پسر گیا اور سو رہا۔ مجھے ایسی نیند لگتا تھا زمانوں بعد آئی ہے۔ صبح ناشتے کے بعد میں چلا آیا۔

کیا مجھے روز ایسی شام لندن میں مل جائے گی۔ ظاہر ہے یہ دیوانے کا خواب تھا۔ میں تو سچ مچ میں جلاوطن اور ملک بدر ہو چکا تھا۔ تنہائی میرے لئے عذاب کی طرح مسلط تھی۔ یہاں جو شاعر یا ادیب میرے کسی کام آسکتے تھے وہ سب دن رات روزی روٹی کے چکر میں ہلکان ہو رہے تھے۔ کوئی دن بھر ٹیکسی چلاتا تھا۔ کوئی دو دو ڈیوٹیاں دیتا تھا۔ کوئی سارا دن دکان یا تندور پر محنت مزدوری کرتا تھا۔ ان کے پاس صرف اتوار کا دن دھونے نہانے کے لئے ہوتا تھا۔ ایسے میں کہاں کی رباعی کہاں کی غزل۔ اب میں کسی معجزے کا منتظر تھا۔ ایک دن قادر سولنگی صبح ہی آ دھمکا۔ میں نے سوچا اس کے وڈیرے سائیں جتوئی نے اسے فارغ کر دیا ہے۔ اس نے اپنی خوشی کو اچھالتے ہوئے بتایا کہ سائیں نے پورے کا پورا گھر اس کے حوالے کر دیا ہے۔ صاف صفائی، روٹی پانی، باورچی خانہ، سودا سلف، مالش پالش سب اس کی ذمہ داری ہے۔ میں نے کہا ''میاں سولنگی! یہاں ان خدمات کے لئے کوئی ملازم نہیں ملتا۔ ہر کام کے لئے الگ لوگ ہوتے ہیں جو گھنٹے کے حساب سے آکر کام کر جاتے ہیں۔ ایسا زرخرید غلام یہاں کسی کو نصیب نہیں ہے۔ ان کو تو تم لاٹری میں ملے ہو۔ وہ اور کیا چاہیں گے۔''

''سائیں! وہ اُدھر میرے ماں باپ کو گوٹھ میں پانچ سو روپے مہینے کے بھجوا دیا کریں گے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ پاکستان میں پانچ سو روپے تو کافی ہیں ان کے لئے۔''

''بس اس لئے تو ہماری جان بھی سائیں پر حاضر ہے۔''

''تمہارے سائیں نے اچھا سودا کیا ہے۔''

''سائیں میں تو آپ کو لینے آیا ہوں۔ سائیں کو آپ کا بتایا کہ آپ نے بھٹو سائیں پر نظم لکھی تھی جس کی وجہ سے یہاں آپ کو نکالا گیا ہے پاکستان سے۔ تو وہ بولے بابا ان کو ادھر لے آؤ۔ آج کی شام ان سے کچاہری کریں گے۔''

''کچاہری۔ سولنگی کچاہری تو برابر والے کے ساتھ کی جاتی ہے۔ میں تو معمولی شاعر ہوں۔''

''سائیں وہ شاعروں کی بڑی عزت کرتے ہیں جیسے ہمارے بڑے سائیں بھٹو کرتے تھے۔ ہمارے بھٹو سائیں کے اطاق میں حبیب جالب اور فیض تو اکثر آتے تھے۔''

''میں تو وہ نہیں ہوں۔ میرے سے وہ کیوں ملیں گے۔''

''آپ تیاری پکڑیں میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ ابھی بہت ٹائم ہے۔ تیار ہو جائیں۔ اُدھر دارو مارو بہت ہوتا ہے سائیں۔''

''مجھے سب پتہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے مگر سولنگی دیکھو میں رات کو لیٹ وہاں سے اِدھر نہیں آسکتا واپس۔''

''اس کا بھی بندوبست سائیں نے کردیا ہے۔ آپ اُدھر میرے ساتھ کمرے میں سوئیں گے۔ اتنا بڑا فلیٹ ہے سائیں، جہاں چاہو سو جاؤ۔''

میرے اندر کی کمینگی نے سوچا سائیں جتوئی مجھے بھی رکھ لے۔ آخر مغل دربار اور دوسرے درباروں میں گویے، شاعر اور فنکار ریاست کے خرچے پر ملازم ہوا ہی کرتے تھے۔ پھر میں نے سوچا اپنی تنہائی کے خوف سے ایسے ارادے باندھنا بزدلی ہے۔ میں خاموش رہا اور شام کے لئے تیار ہوگیا۔

ہم وہاں پہنچ گئے۔ سولنگی نے مجھے پہلے اپنے والے کمرے میں بٹھادیا اور خود باورچی خانے میں کھانا بنانے میں لگ گیا کہ یہ وقت سائیں کے آرام کا وقت تھا۔ ابھی شام میں کچھ وقت تھا۔ میں نے کاغذ قلم لے کر ایک نظم لکھنے کی کوشش کی اور لکھ لی۔ یہ میرا پہلا لندن کا جلاوطنی کا تجربہ تھا جو مجھے بہرحال لکھنا تھا۔ میں نے وہ نظم لکھ لی اور آرام کرنے لگا۔ سولنگی نے اس شام کے کھانے بنالئے اور اپنے وڈیرے کے لئے شام کی کچاہری (محفل) کا ساز و سامان لگادیا مثلاً ٹرالی پر گلاس، برف کا برتن، سوڈا، پانی، کاجو، مونگ پھلی، پستہ، بادام اور پھر وقفے وقفے سے پرانز، مچھلی، تکے وغیرہ کا پورا انتظام۔ میں ابھی سولنگی کے کمرے میں تھا کہ ڈرائینگ روم میں محفل کے شرکاء کی آمد ہوئی۔ لندن میں جلاوطن لیڈر جو اسی پارٹی سے تھے، تشریف لے آئے۔ اُن میں ایک سرائیکی علاقے کے لیڈر تھے جو گورنر بھی رہ چکے تھے۔ پھر ایک وفاقی وزیر راولپنڈی سے تھے۔ میں جانتا تھا۔ اور پھر سندھ سے جتوئی صاحب اور ان کے ایک ایم پی اے بھی آ گئے۔ میں ان کو بھی جانتا تھا مگر وہ مجھے نہیں جانتے تھے اور میرا تعارف بھی نہیں تھا۔ خیر میں خاموشی سے بیٹھا رہا کہ مجھے سولنگی نے کہا ''سائیں نے بلایا ہے۔''

اب میں وہاں گیا تو میرے لئے کوئی نہیں اٹھا اور وہ مجھے نظرانداز کرکے بات کرتے رہے۔ میں بیٹھ گیا ایک صوفے کے کونے پر۔ جتوئی صاحب نے سب کے لئے پیگ بنایا۔ مجھ سے بھی پوچھا ''آپ برف لیں گے یا سوڈا۔'' میں نے سادہ پانی کا کہہ دیا۔ انہوں نے بنادیا۔ مجھے سندھی وڈیروں کی وضع داری کا علم تھا۔ خاص طور پر تالپور شاعروں کی جو عزت کرتے تھے اس کا احوال فیض صاحب کے چاہنے والے کرتے رہتے تھے لیکن میں تو معمولی آدمی تھا۔ پھر بھی انہوں نے پیگ پیش کرتے ہوئے کہہ دیا ''سائیں پہلا پیگ میزبان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اپنا خیال خود رکھیں گے۔'' میرے

لئے یہ بات ٹھیک بھی تھی اور ٹھیک نہیں بھی تھی کہ میں سب کے بیچ اٹھ کر کیسے پیگ بناؤں گا۔ خیر مسئلہ حل ہو گیا کہ دو پیگ کے بعد سب اپنی اپنی گنتی بھول چکے تھے۔ اس دوران سیاست پر ان کے تبصرے بڑے دلچسپ تھے۔ بھٹو صاحب کے واقعات چلتے رہے۔ سب کے اپنے اپنے تجربے تھے۔ سب نے بھٹو صاحب کے جاہ وجلال کے تناظر قریب سے دیکھ رکھے تھے۔ مجھے پہلی بار سن کر اچھا محسوس ہوا کہ وہ واقعی بڑا آدمی تھا۔ پھر سب نے اندر خانے کے حالات پر تبصرے شروع کر دیئے کہ کس کی بیوی کے تعلقات کس جرنیل سے تھے اور کس سیاست دان کی بیوی بھٹو صاحب سے کام نکلوایا کرتی تھی اور کیسے گاڑی پر پردے لگ کے وہ نکلتی تھی۔ یہ ''سینہ گزٹ'' قسم کی گفتگو تیسرے چوتھے پیگ کے بعد عام طور پر ان محفلوں کی جان ہوا کرتی ہے۔ اس پر خوب کھل کے ٹھٹھہ مخول بھی ہوا اور محفل پہ جوبن بھی آیا۔ اب جتوئی صاحب چونکہ میزبان تھے تو آخری حصے کے طور پر شاعری کا تڑکا لگانا بھی سندھی کچاہریوں میں ایک مستقل فیچر ہوا کرتا تھا اور اس مقصد کے لئے خاص طور پر مجھے قادر سولنگی کے ذریعے دریافت کیا جا چکا تھا۔ جتوئی صاحب نے سب کی توجہ میری طرف دلائی اور بتایا کہ یہ شاعر شاہی قلعے سے سیدھا اسی فلائٹ میں بیٹھا ہے جس میں ہماری پارٹی کے ورکرز اور لیڈرز آئے ہیں اور تین تو اس محفل میں بھی بیٹھے تھے۔ وہ سب چونکے۔ ایک نے کہا ''ابھی تک تعارف کیوں نہیں کرایا گیا۔'' خیر میزبان نے بات بنالی اور وہ سب ہمہ تن گوش ہوئے کہ میاں کیا بیچتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ بھٹو صاحب کا عاشق ہوں۔ ان کی پھانسی پر نظم لکھی۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف مزاحمتی شاعری لکھی جیسے اور بہت سے شاعروں نے لکھی۔ بس اس طرح شاہی قلعے پہنچا اور اب یہاں ہوں۔ بیوی بچے سے دور کر دیا گیا ہوں۔ جتوئی صاحب نے کہا ''سائیں شاعر بیٹھا ہو تو ہم خالی جام لے کر کیوں بیٹھیں۔ آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے۔ اس کے بعد آئے جو عذاب آئے۔'' ایک نے یہ شعر سنایا۔ سب نے قہقہہ لگایا۔ کسی اور نے عدم کا شعر جو کہ کافی پھسپھسا سا تھا، جواب میں سنا دیا۔ ان سب کے ذوق کی آزمائش شروع ہوگئی۔ اس طرح کی کیفیت میں شعر یا نظم سنانا خاصا بے معنی عمل ہوتا ہے کہ شاعر کوئی دل بہلانے والا مسخرہ تو ہوتا نہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی لیکن میں نے پڑھ رکھا تھا اس طرح کی امراء اور رؤسا کی محفلوں میں فیض، فراز اور حبیب جالب کو بھی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ حبیب جالب کی تو ایسی محفلوں میں بے پناہ گنجائش ہوتی تھی کہ وہ بے حد سریلے شاعر تھے۔ تان ایسی لگاتے تھے کہ تان سین داد دینے آجاتے تھے۔ اوپر سے شاعری آگ لگا دیتی تھی۔ اب جتوئی صاحب نے کہا ''آپ کچھ سائیں عطا کریں۔''

میں نے بھٹو صاحب کی شہادت والی نظم سنائی تو ایک دو جگہ پر کچھ ہلکی سی داد نکلی جو جلدی دم توڑ گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک اور نظم سنائی جس میں مارشل لاء پر کچھ چوٹیں تھیں لیکن وہ اپنا اپنا پیگ بنانے میں لگ گئے۔ میری نظم بغیر توجہ کے گزر گئی۔ اب میں خاموش ہو گیا تو جتوئی صاحب بولے ''سائیں! حبیب جالب جیسی کوئی شے پڑھیں ناں۔''

جتوئی صاحب کو اپنی شام اور شراب ضائع ہوتی محسوس ہوئی تو ایک سابق وزیر نے کہا ''سائیں! حبیب جالب کو بھی ہم نے ایک گھونٹ شراب کے لئے گرتے دیکھا ہے۔ سائیں! یہ شاعر لوگ بس نعرے لگاتے ہیں، اندر سے بہت لالچی اور لوبھی ہوتے ہیں۔ میں نے جوش ملیح آبادی کا پیشاب نکلتے دیکھا ہے۔ ایک اور بولا میں نے عبدالحمید عدم کو گرتے دیکھا ہے اور بھئی اپنے فیض صاحب اور جگر مرادآبادی کون سے دودھ کے دھلے تھے۔ یار بس جس طرح سپین میں بل فائٹنگ میں بل کو سرخ کپڑا دکھاؤ تو وہ دوڑتا ہے، انہیں شراب کی بوتل دکھاؤ اور پھر ان سے جو مرضی سن لو۔''

میں یہ باتیں سن رہا تھا اور پھر اٹھ کر سولنگی کے اس کمرے میں آ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔ اس دوران وہاں سولنگی نے کھانا لگا دیا۔ وہ کھا پی کے نکل گئے۔ سولنگی سب کچھ سمیٹ سمٹ کے کمرے میں آیا۔ میں نیم مردہ سا تھا۔ اس نے آ کر مجھے جھنجھوڑا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہاں میری دال نہیں گلے گی۔ اس نے بوتل اٹھا کر میرے لئے ایک اور پیگ بنایا اور کہا ''صاحب سونے جا چکا ہے، جو کھانا بنایا تھا سب ویسے کا ویسے پڑا ہے، آپ کھانا لے لیں۔''

میرا دل رونے والا تھا لیکن اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے پیگ لیا کہ وہ میری ضرورت تھا اور پھر وہ کھانا لایا جو مجھے کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔ سو میں نے اپنی اَنا کو پلیٹ کے رکھ دیا اور کھانا کھایا۔ پھر میں وہیں سو گیا۔ اگلی صبح میں کب اٹھا، کب سولنگی نے ناشتہ کرایا اور کب میں نکل گیا، معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

....

میں لندن سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایسا کوئی ارادہ، خواہش اور وسیلہ بھی نہیں تھا۔ لندن میں سرما شروع ہو چکا تھا۔ درختوں کے پتے مختلف رنگ اپنی اپنی فطرت کے لحاظ سے بدل رہے تھے۔ کبھی کبھی تو کسی پارک میں جا کر دیکھتا تو خوبصورت پینٹنگ دور تک پھیلی دکھائی دیتی۔ یہ میری پہلی سردیاں تھیں۔ جا کر ایک ایسے اتوار بازار سے گرم کوٹ اور دوسرے گرم کپڑے معمولی داموں میں خریدے جو اترن کے ہوتے ہیں اور لوگ کسی نہ کسی ادارے کے لئے چیریٹی جمع کرنے کے لئے وہاں دے جاتے ہیں۔ میرا مسئلہ اب بھی تنہائی سے خوف کا تھا۔ میں لندن کے کسی بھی علاقے میں جڑ نہیں پکڑ رہا تھا۔ ایسٹ لندن میں جہاں مجھے پھینکا گیا تھا وہاں کوئی پاکستانی دور دور تک نہیں تھا البتہ کچھ کالے اور کچھ بنگلہ دیشی ضرور آس پاس چلتے پھرتے دکھائی دیتے۔ گوروں کا تو نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے کچھ ایسے سفرنامے معلوم نہیں کیوں پڑھ رکھے تھے جن میں ہر گوری پاکستان سے آنے والے کسی بھی کم ظرف، ندیدے اور خوش گمان سفرنامہ نگار کی گود میں بیٹھ جاتی ہے۔ سینٹرل لندن میں گورے اور گوریاں ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی تھیں اور کیوں دیکھیں، ہم ان کے لئے غلام ہی تو ہیں اور اگر کوئی پاکستانی کسی جگہ اپنی ذہانت اور علم کی بنیاد پر اپنی جگہ بنا لیتا ہے تو وہ کیوں گوری کو دیکھے گا۔ ہمارے لوگوں میں تصورات کی آبیاری یہ گھٹیا سوچ کے سفرنامہ نگار ہی کرتے رہے ہیں۔

لاہور سے میری بیوی نے جو دوسرا پتہ بھیجا تھا وہ ساؤتھ ہال کے پاس کسی کا تھا۔ اب میں ہر شام لائکپوری کے ہاں تو جا نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے لئے ہر شام بلیک لیبل تو نہیں نکال سکتا تھا۔ آخر مجھے بھی تو اس کے لئے کوئی شام سجانی چاہئے تھی۔ اس شرمندگی کے باعث دوبارہ میں وہاں نہیں گیا۔ اب میں سندھی سیاست دانوں سے تو تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ ویسے بھی وہ مجھے کیوں اپنے قریب رکھیں گے۔ نہ میں ان کا کامانہ ان کا نوکر چاکر نہ ان کا محفلی مصاحب، نہ میں فیض نہ جالب۔ تو ایسے میں اب میں اُس پتے کی

طرف چل پڑا اور بالآخر میں نے ایک ریستوران سے وہ پتہ پوچھا تو وہاں موجود ایک کارکن نے بتایا کہ اس نام کا پاکستانی ''لاہوری تکہ شاپ'' میں کام کرتا ہے۔ اب میں ساؤتھ ہال میں اس ریستوران پر پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑا اور خوبصورت ریستوران تھا اور مرکزی شاہراہ پر واقع تھا۔ سب کو اس کا علم تھا۔ اب میں جب ساؤتھ ہال پہنچا اور اس ریسترواں میں جا کر اس نام کے کارکن کا پوچھا تو بتایا گیا کہ اُسے آنے میں ذرا دیر ہے۔ وہ جب تک آتا ہے، آپ بیٹھیں۔ ابھی چونکہ ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا، سب تیاری کر رہے تھے۔ باہر بازار میں رونق شروع ہو چکی تھی۔ لگتا تھا انار کلی بازار کی کسی دکان میں بیٹھا ہوں۔ پاکستانی دیسی کھانوں کی خوشخبری ریستوران کے اندر باہر آویزاں تھی۔ میرے سامنے باربی کیو کی تیاری چل رہی تھی۔ ایک ماہر کارکن سلاد کاٹنے میں مصروف تھا۔ اس کے قریب تندور موجود تھا۔ اس کی تیاری بھی چل رہی تھی۔ ایک باہر سے لڑکا بہت سے اخباروں کا پلندہ اُٹھائے اندر آیا اور دو تین اخبار پھینک کے چلا گیا۔ میں نے دیکھا وہ ہر دکان میں یہ اخبار پھینکتا جا رہا تھا۔ ابھی چونکہ اس ریستوران کے مالک الطاف بٹ کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا جسے میں ملنے آیا تھا کہ اس کا پتہ لاہور سے میری بیوی نے بھیجا تھا جو اس کے دور پار کے کسی عزیز کا دوست بتایا گیا تھا۔ میں نے وقت بہلانے کے لئے اخبار اٹھا لیا۔ اخبار سے رشتہ ٹوٹے لگتا تھا ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اخبار اچھے کاغذ اور اچھی پرنٹنگ میں تھا۔ اس زمانے کے لحاظ سے اس کا لے آؤٹ بھی ٹھیک تھا۔ میں نے اخبار اٹھایا۔ اس کا نام ''صدائے پاکستان'' تھا۔ میں سمجھ گیا یہ یہاں کے پاکستانیوں کو ملک سے باخبر رکھنے کے لئے کسی نے جاری کیا ہے۔ اخبار کو اچھی طرح اندر باہر سے دیکھا تو یہ تو کچھ اور تھا۔ یہ لندن میں رہنے والے پاکستانیوں کے لئے روزمرہ کی معلومات کے ساتھ ان کے کاروباری کی تشہیر کا ایک ذریعہ تھا۔ اندر باہر دکانوں اور پاکستانیوں کے لئے وکلاء کی خدمات کے بے شمار اشتہارات شائع کئے گئے تھے مثلاً مختلف ریستورانوں اور پاکستانی علاقوں میں موجود گراسری کی دکانوں کے ساتھ ساتھ عروسی لہنگوں، عروسی مردانہ زنانہ پوشاکوں اور ساڑھیوں کے ساتھ شیروانیوں، ٹوپیوں اور حج کے احرام، جائے نماز تک کی دکانوں کے اشتہار موجود تھے۔ ایک کونے میں نماز کے اوقات اور مساجد کی علاقہ وار معلومات درج تھیں۔ پھر سب سے اہم اشتہاران وکلاء کے تھے جو امیگریشن کے معاملات پر معاونت کے لئے خدمات کا اعلان کر رہے تھے۔ بعض وکلاء پاکستان میں پراپرٹی کے تنازعات کو حل کرنے کے لئے بھی اپنی خدمات دے رہے تھے جس سے پتہ چلا کہ یہاں رہنے والے پاکستانی یہاں سے محنت کی کمائی سے اپنے ملک میں اپنے خاندان کے لئے زمینیں یا جائیدادیں خرید رہے ہیں اور شاید ان جائیدادوں پر رشتہ

داروں یا دوسرے لوگوں کے قبضے ہو رہے ہیں۔ یہ دو باتوں کی طرف اشارہ تھا۔ ایک یہ کہ جو پاکستانی یہاں روزی کمانے آئے ہیں وہ اپنی اولادوں کو جوان ہونے کے بعد پاکستان میں واپس لے جانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے بچوں کی شادیاں ہوں اور ان کے لئے مستقبل کا سامان وہ یہاں سے کرنا چاہتے تھے۔ میرے لئے اس وقت یہ بات چونکانے والی تھی کہ جو بچے لندن اور انگلستان کے سکولوں میں پڑھے ہوں گے اور یہاں کے ماحول میں بڑے ہوئے ہوں گے تو وہ کیسے پاکستان میں اپنے ہی خاندان میں جن سے ان کا کوئی جذباتی اور معاشرتی تعلق نہیں ہوگا تو وہ خود کو اس ماحول کے حوالے کر پائیں گے۔ اس اخبار نے مجھے برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کے بے شمار مسائل اور صورت حال سے آگاہ کرنے میں مدد دی مثلاً میں حیران ہو گیا کہ اس میں نہ کوئی عالمی خبر تھی نہ برطانیہ کی کوئی خبر تھی، نہ پاکستان کے سیاسی اور حالاتِ حاضرہ کی کوئی خبر تھی۔ اب جب خبروں پر غور کیا تو وہ احمدیوں کے فرقے کے امام کا بیان تھا۔ وہ شیعوں کے مختلف رہنماؤں کے بیانات تھے۔ سنی، بریلوی اور حنفی فرقوں کے رہنماؤں کے بیانات تھے۔ اس کا ایک مطلب ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان میں مذہبی فرقوں کی لڑائی ضیاء الحق ہی کے زمانے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ احمدیوں کا مسئلہ بھٹو صاحب نے متعارف کرایا تھا اور اب پاکستان میں فرقوں کی جو لڑائی لڑی جا رہی تھی اس کی آڑ میں برطانیہ میں سیاسی پناہ لینے والوں کے پاس فرقہ واریت کا کارڈ بھی موجود تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ پاکستان میں جو فرقہ واریت کی لڑائی لڑی جا رہی ہے وہ یہاں منتقل ہو گی اور یہاں کے منی پاکستان میں بھی لڑی جائے گی۔

اس اخبار نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ اس اخبار میں ادب، فنونِ لطیفہ یا پاکستانی سیاست کی خبریں نہیں ہیں۔ خبریں یا تو کاروباری سرگرمیوں کے حوالے سے ہیں یا مذہبی فرقوں کے رہنماؤں سے متعلق ہیں اور پھر میرے سوچنے کی بات تھی کہ یہ سارے مذہبی رہنما ویزہ کیسے لے کر آتے ہیں۔ اس پر انکشاف ہوا کہ برطانیہ اپنے ہاں منی پاکستان بھی ایسا آباد کرنا چاہتا ہے جیسا ہندوستان میں تھا اور وہ اسے یہاں اسی آہنی ہاتھ سے نمٹے گا جیسا وہاں اس نے نمٹا تھا یعنی ”Divide and Rule“۔

ابھی میں اس اخبار کے ذریعے لندن میں آباد پاکستانیوں کے مسائل کو سمجھ ہی رہا تھا کہ اس ریستوران کا مالک الطاف بٹ داخل ہوا جسے سب طیفا بٹ بولتے تھے۔ اس نے طِلّے کا کھسہ پہنا ہوا تھا۔ اوپر کلف لگی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ایک بلیک واسکٹ نے اسے لاہوری یا پنجابی ہونے کی سند عطا کر

دی تھی۔ اس کے آتے ہی اس کا سٹاف اور چوکس ہو گیا۔ میرا اس سے تعارف ہوا تو وہ بہت خوش ہوا کہ پاکستان میں اس کے رشتہ داروں میں اس کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے اور وہ وہاں ایک کامیاب بزنس مین تصور کیا جانے لگا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس بازار میں لاہور اور پنجاب کی بادشاہی ہے۔ سب ریستوران اور شاپس اپنے بھائیوں کی ہیں۔ کوئی منڈی بہاؤالدین سے ہے، کوئی وزیر آباد سے ہے، کوئی جہلم کا ہے، کوئی پنڈی وال ہے، سب اپنے ہیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی دھاک بٹھانے کے لئے کئی قسم کی شوخیاں اور شیخیاں مجھ پر ثابت کیں۔ میں تو ایک سائل تھا۔ ایک ضرورت مند تھا۔ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یہاں کام چاہئے۔ چاہے مجھے اپنے کچن کی صفائی پر رکھ لو۔ میں اس سے یہ بات نہیں کر سکتا تھا اور وہ اتنا ذہین نہیں تھا کہ میری خواہش کو بھانپ لیتا۔ اس نے خود جا کر کچن سنبھالا اور پھر ڈنر پر طرح طرح کی فیملیز آنا شروع ہوئیں۔ وہ ہر فیملی سے ذاتی تعلق ظاہر کر کے ان کے ساتھ گفتگو کرتا تھا کہ محسوس یہ ہونے لگا کہ سب ایک پاکستانی خاندان کے افراد ہیں۔ میں ایک طرف بیٹھا تھا اور دیکھ رہا تھا یہ ایک اور پاکستان ہے۔ مارشل لاء سے آزاد یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ پاکستان کو کس آکٹوپس نے جکڑ رکھا ہے اور اس کا خمیازہ پاکستان کو صدیوں تک بھگتنا ہو گا۔ اسے مصروف دیکھ کر میں نے اجازت چاہی تو اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے چھوٹے سے آفس میں لے گیا اور وہاں اس نے اپنے اور میرے لئے کھانا منگوایا۔ میرے ساتھ کھایا اور پوچھا کوئی میرے لائق خدمت ہو تو بتائیں۔ میں نے بتا دیا کہ یہاں بالکل اکیلا ہوں اور دور بھی رہتا ہوں۔ کوئی کام مل جاتا تو مصروفیت ہو جاتی۔ اس نے سوچا اور کل آنے کا کہا۔

میں جب اگلے روز آیا تو اس کے ساتھ ایک کردار بیٹھا ہوا تھا جس نے چمکدار سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ رنگ کی قمیص اور پیلے رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ میں سمجھا نہیں کہ مجھے کس سے ملوایا جا رہا ہے۔ طیفا بٹ اس روز بھی شلوار قمیص، واسکٹ، کھسہ اور شال اوڑھ کر اپنے لاہوری رنگ روپ میں موجود تھا۔ یہ لندن میں ایک اور شام تھی۔ مجھے محسوس ہوا میں لکشمی چوک لاہور میں بیٹھا ہوں مگر باہر شام لندن کی ہوا سے بھیگی ہوئی تھی۔ میں اس نئے کردار سے واقف نہیں تھا۔ طیفا بٹ کیوں مجھے اس سے ملوانا چاہتا تھا۔ میرے لئے بہت پراسرار پہلو تھا۔ طیفا بٹ نے تعارف کراتے ہوئے کہا ''آپ کے متعلق میں نے انہیں بتا دیا ہے۔ یہ شاعروں کے دل سے قدردان ہیں اور پھر یہ کہ بھٹو صاحب کے یہ بھی دیوانے ہیں۔''

''بہت شکریہ آپ کی تعریف کا۔''

''تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔ بندے کو شہنشاہِ صحافت، آفتابِ جمہوریت اور پیکر

خیال وسخن کہتے ہیں۔ ویسے میرا نام محمد نذیر خیالی پسروری ہے۔''

''اس نے جو کہا۔ وہ اپنی جگہ۔ کل میں نے ''صدائے پاکستان'' اخبار دیکھا اور پڑھا ہے یہ اس کا ایڈیٹر، پروپرائٹر، رپورٹر اور نمائندہ خصوصی لندن بھی ہے۔''

''چھوڑیں جی، اب میں آپ کو اپنا اصلی تعارف کراتا ہوں۔ میں دراصل پسرور کا رہنے والا ہوں۔ چٹا ان پڑھ ہوں۔ میں دسویں فیل ہوں اور پھر میں ایک پسماندہ علاقے پسرور ضلع نارووال سے ہوں۔ میں روزگار کے لئے لاہور آیا تو مجھے ایک جاننے والے نے ایک اخبار کے دفتر میں چائے لانے پر ملازم رکھوا دیا۔ میں اسی اخبار کے دفتر کے فرش پر سوجاتا تھا اور میں اخبار کے مالک سے لے کر رپورٹر اور کاتب سے لے کر کاپی بنانے والے کو دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ مجھے جلدی پتہ چل گیا کہ یہ اخبار دنیا کو بلیک میل کر کے اور اپنے اخبار ہونے کی اہمیت کی وجہ سے اشتہار بھی لیتا ہے اور خبروں کے پیسے بھی وصول کرتا ہے مثلاً کسی کارخانہ دار کو لیبر کے خلاف خبر لگوانی ہے تو اس کا ریٹ مقرر تھا۔ کسی لیبر نے اپنے مالک کے خلاف خبر لگوانی ہے تو ریٹ مقرر تھا۔ کسی تھانیدار نے آئی جی کے خلاف خبر لگوانی ہے تو ریٹ مقرر تھا۔ کسی آئی جی نے اپنے وزیر اعلیٰ یا گورنر کے خلاف خبر لگوانی ہے تو ریٹ مقرر تھا۔ کسی سیکرٹری نے اپنے چیف سیکرٹری کے خلاف خبر لگوانی ہے تو اس کا بھی ریٹ مقرر تھا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو مجھے اپنا مستقبل روشن دکھائی دینے لگا۔ میں نے وہاں سے یہ ساری تربیت حاصل کی اور پھر میں نے ایک اخبار کا ڈیکلریشن لے لیا۔ منت خوشامد کر کے اور کاغذی کارروائی پوری کر کے مجھے وہ ڈیکلریشن مل گیا۔ اس کا نام میں نے چالاکی سے رکھا ''خدمت پاکستان۔'' افسروں نے متاثر ہو کر مجھے پاکستان کی خدمت کے لئے ڈیکلریشن دے دیا۔ اس کے بعد میں نے کیا کیا کہ اپنے اُسی اخبار کے ایک رپورٹر سے ساز باز کر کے اس اخبار کی ڈمی بنوائی اور پھر اس اخبار کو ایک تحصیل میں شروع کر دیا۔ تحصیل میں ایک ایم پی اے ہوتا ہے اور ذرا آگے جائیں تو ضلع تک ایک ایم این اے ہوتا تھا۔ تو میں نے سوچا ان کو تو مقامی طور پر ہماری ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں میں نے اس اخبار کے ذریعے مقامی خبریں اپنے اخبار کے لئے جمع کرنا شروع کیں جن کی اہمیت بنتی تھی۔ اب میں نے اپنے اس مقامی اخبار کے ذریعے جو پہلی رشوت یا بھتہ وصول کیا وہ مقامی تھانیدار سے مجھے حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علاقے میں جرائم اسی تھانیدار کے ذریعے ہوتے تھے اور ان کی خبریں رکوانے کا کام بھی وہ میرے ذریعے سے کرتا تھا اور اس کا معقول معاوضہ مجھے دیتا تھا۔ شہر کے معمولی اشتہار بھی تھانیدار اپنے اثر ورسوخ سے مجھ دلواتا تھا۔ دوسرے معنوں میں وہ میرا ٹاؤٹ تھا

اور میں اس کا ٹاؤٹ تھا۔ کام چل نکلا۔ علاقے کا ایم پی اے بھی تھانیدار سے تعاون کر رہا تھا کہ اسے جس کو گرفتار کرانا ہوتا وہ تھانیدار سے کہہ کر اسے اندر کرا دیتا۔ پھر خود ہی اسے چھڑوانے آجاتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنا رعب علاقے پر قائم رکھا ہوا تھا۔ اب میں، تھانیدار اور ایم پی اے ایک دوسرے کے سہارے چل رہے تھے۔ اب میں نے اور اوپر اڑنے کے لئے پَر پھڑپھڑائے اور میں ضلع کی سطح تک پہنچ گیا۔ ''خدمت پاکستان'' اب ضلع سے شائع ہونے لگا۔ یہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ یہاں میں نے مقامی کاروباری طبقے کو شیشے میں اتارا اور مقامی سرکاری انتظامیہ کے خلاف انقلابی بن گیا۔ ٹرانسپورٹروں، مقامی منڈیوں کے آڑھتیوں اور وکیلوں کے دل کی آواز بن گیا۔ اس طرح مجھے اشتہار تو حاصل ہو ہی رہے تھے، ساتھ میں ایم این اے اور مقامی سیاست دانوں سے چھیڑ چھاڑ کے ذریعے کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔ پولیس اور مقامی انتظامیہ کے خلاف خبریں لگانا معمول بن گیا تھا۔ اس طرح عوام اور سیاست دانوں کے ڈر کر خوش رہتے تھے۔

جب ضلعی سطح پر پاکستان کی خدمت کا خواب پورا ہو گیا تو میں سیدھا لاہور پہنچا۔ میں نے وہاں سے اسے جاری کر دیا۔ مجھے معلوم تھا لاہور میں مجھے کوئی گھاس نہیں ڈالے گا۔ میں نے وہاں مقامی پریس کلب میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اپنا کارڈ بنوایا اور سرکاری پریس کانفرنسوں میں اگلی صفوں میں بیٹھنا اور سوال کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح میں نے وزیر اعلیٰ سے وزیر اعظم تک جان پہچان کے راستے نکال لئے۔ یہ جو اُن کے ترجمان یا سیکرٹری قسم کے نمونے نہیں ہوتے، ان سے لٹک کر میں ایوانوں میں پہنچ جاتا تھا۔ پھر میں نے اپنے اخبار کے لئے سرکاری پارٹی کی خوشنودی حاصل کر کے اسے پارٹی کا ترجمان قرار دے دیا۔ اس سے اُس پارٹی کے سارے ایم این اے، ایم پی اے اور وزیر میری مٹھی میں آ گئے۔ اس طرح میں نے سرکاری ریٹ پر پلاٹ الاٹ کرانے کا دھندہ سیکھ لیا۔ اُدھر پلاٹ نکلتا، اُدھر تین گنا قیمت پر کھڑے کھڑے بک جاتا۔ میں نے اس دھندے میں بڑا تجربہ حاصل کر لیا اور میں ایک مافیا چیف کا فرنٹ مین بن گیا۔ اس طرح میں نے کوڑیوں کے بھاؤ زمینیں خریدیں اور پھر سرکاری سرپرستی میں ان زمینوں کو قانونی طور پر ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں تبدیل کیا اور جب مارشل لاء رات کو لگا تو میں لندن بھاگنے کی پوری تیاری کر چکا تھا اور پھر میں یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسی تجربے کو یہاں جاری کیا۔

وہ ذرا خاموش ہوا تو میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اس نے پاکستان کے سیاسی اور عسکری نظام میں کس طرح اپنی جڑیں چھوڑی ہیں اور اوپر سے سچائی کے ساتھ سب تسلیم کر رہا ہے۔ اس کے اقبال

جرم کی داد دی اور پھر پوچھا ’’مجھے کیوں بلایا ہے، آپ کا اخبار ’’صدائے پاکستان‘‘ تو ٹھیک چل رہا ہے۔

’’نہیں سر جی، میرے اندر کیڑا سر اٹھا رہا ہے کہ اب ذرا اور پر پھیلا۔ میں پر اور پھیلانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کتنے پر پھیلانے ہیں؟‘‘

’’او سر جی، بات یہ ہے کہ یہ اخبار آپ نے دیکھ لیا۔ یہ کیا ہے؟ یہ میں نے پاکستانی کمیونٹی کے لئے سروس کی ہے۔ اب کمانے کا وقت آیا ہے۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں۔ کمائی تو ہو رہی ہے۔ اتنے اشتہار ہیں۔‘‘

’’یہ اشتہار نہیں، نفرت کے بیج ہیں جو برطانیہ کو مہنگے پڑیں گے۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ آ چکے ہیں اور مسلمانوں کے سارے فرقے سیاسی پناہ کی آڑ میں آ رہے ہیں۔ ابھی تو پاکستان میں فرقہ واریت کا بیج ضیاء الحق نے بویا ہے۔ فصل تو تیار ہونی ہے۔ ایک فصل احمدیوں کی ادھر آئی ہے۔ اب آہستہ آہستہ ہر فرقے کی فصل آئے گی جس کی وجہ سے برطانیہ ایک چھوٹے پاکستان میں تبدیل ہو جائے گا۔‘‘

میں حیرت سے محمد نذیر خیالی پسروری کو دیکھ رہا تھا کہ برطانیہ کو جس طرح وہ سمجھا ہے مجھے تو سمجھنے میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا ’’اس اخبار کو میری کیا ضرورت ہے؟‘‘

’’اپنے طیفا بٹ کا بھی جواب نہیں، دیکھو میں ہیرا پہچانتا ہوں، تم ہیرے ہو۔‘‘

’’میں تو ایک پردیسی قسم کا آدمی ہوں۔ میں اخبار کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔‘‘

’’او سر جی، آپ نے اِسے اُٹھانا ہے اور اب تک تو یہ ایک اشتہاری مہم ہے، آپ نے اسے اخبار بنانا ہے۔‘‘

’’میں کیسے اسے اخبار بنا سکتا ہوں۔ میں نے کبھی اخبار کا کام نہیں کیا۔ صرف کالج میں اردو ادب اور شاعری پڑھاتا رہا ہوں۔‘‘

’’بس تو ہیرے کو نہیں پتہ کہ وہ ہیرا ہے۔ دیکھو میرا اخبار ایک اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ یہ فری میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ بکتا نہیں ہے۔ میں ان اشتہاروں سے اس کا اور اپنا خرچہ پورا کرتا ہوں۔ میرا معاشرے میں مقام بونس ہے۔ ادھر سنگر آتے ہیں۔ آپ کے ٹی وی ایکٹر آتے ہیں۔ آپ کے فلموں کے یونٹ آتے ہیں۔ یہاں میرے بغیر نہ کوئی شو ہو سکتا ہے نہ کوئی شوٹنگ کر سکتا ہے۔ آپ کا بھائی عزت رکھتا ہے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے۔ میں اس اخبار کو کیسے زیادہ مقبول بنا سکتا ہوں۔‘‘

''ہاں اب آئے ہو لائن پر۔ تو سنو، یہ اخبار اس وقت دنیا کی نظر میں ایک چیتھڑا ہے۔ چیتھڑا سمجھتے ہو۔ بے کار کپڑے کا ٹکڑا۔''

''ہاں سمجھتا ہوں۔ مگر یہ تو کمائی کر رہا ہے۔''

''او جگر جانی سمجھو۔ میں اس اخبار کو پاکستانی فیملی میں خواتین کے پڑھنے کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتہ نہیں یہاں پاکستانی جو آباد ہوئے ہیں وہ یا تو اپنے ساتھ اپنا پاکستانی فیملی لائے ہیں یا انہوں نے شادیاں کر کے ادھر اپنا فیملی بنایا ہے۔''

اب میں برطانیہ میں آباد پاکستانی خاندانوں کی تاریخ سمجھنا چاہ رہا تھا جو مجھے بتائی جا رہی تھی۔ میں نے اس لئے ذرا سا کریدا۔ ''یہ اخبار پاکستانی فیملی کے لئے کیا کرے گا؟''

''یہ اخبار جیسا ہے وہ تو ہے، آپ کو کرنا یہ ہے کہ اس اخبار کو ''اخبارِ خواتین'' بنانا ہے۔ یہ ہر گھر کی خاتون کے قابل بن جائے۔ اصل قاری خاتونِ خانہ ہوتی ہے۔ یہ جو مرد ہوتے ہیں یہ اپنا فائدہ کاروبار میں ڈھونڈتے ہیں اور خواتین اپنا فائدہ اپنے جذبات و احساسات میں ڈھونڈتی ہیں۔ یہی فرق مرد اور عورت میں ہوتا ہے۔''

اب جو میں نے یہ بات سنی تو میں تو اس کے کاروباری گر کو سمجھ گیا کہ وہ اب پاکستانی گھرانوں میں نقب لگانا چاہتا ہے یعنی وہ اخبار کو خواتین کے لئے پڑھنے کے قابل بنانا چاہتا ہے کہ اسے پتہ ہے کہ پاکستانی لوگ گوریوں سے شادیاں نہیں کرتے یا پھر وہ شادیاں ناکام ہو رہی ہیں اس لئے پاکستانی ایک شادی گوری سے اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں وہاں ٹھہرنے کا قانونی سہارا مل جائے اور دوسری شادی وہ اس لئے کرتے ہیں کہ پاکستان میں اپنے والدین کو جذباتی طور پر خوشی دے سکیں کہ ان کے بیٹے نے فرمانبرداری کی مثال قائم کر دی۔ یہ ایک طرح کی منافقت تھی جو جاری تھی۔ اس پر میں نے اس سے کہا ''مجھے کیا کرنا ہوگا۔'' سیدھا سپاٹ جواب آیا ''آپ شاعر ہیں، تو اس اخبار کو شاعری کا تڑکا لگائیں کہ برطانیہ کے گھروں میں بیٹھی پاکستانی خواتین اپنے شاعرانہ تصورات کی قیدی ہیں جو فیض، اختر شیرانی، مجاز اور پھر احمد فراز نے انہیں دسویں یا بارہویں جماعت تک دیئے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، میں شاعری کا تڑکا لگا دوں گا اگر مجھے اخبار میں جگہ ملے۔''

''اخبار میں جگہ ملے گی۔ یہ جو مذہبی فرقہ واریت کے اشتہار ہیں یہ تو ہم چھاپیں گے۔ ایک اشتہار کے لئے ایک بیان اس فرقے کا چھپتا ہے۔''

''اخبار ان مذہبی تنظیموں کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔ایک اشتہار کے بدلے میں ان کے مولانا یا حضرت کا بیان شائع کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

''ہم ان کی ضرورت پوری کریں گے۔وہ ہماری ضرورت پوری کریں گے۔یہی کاروبار ہے ناں؟''

''ہاں اب آپ سمجھے ہیں۔اب ایک اور بات بھی سمجھ لیں کہ جو پاکستانی 1950ء کے بعد سے اب تک آئے ہیں اور آتے رہیں گے ان میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ایک وہ جو غریب دیہاتوں،قصبوں اور آزاد کشمیر سے آئے ہیں۔سب کے سب پنجاب کے ان علاقوں سے آئے ہیں۔لاہور، گوجرانوالہ، وزیرآباد، جہلم، کھاریاں، ٹوبہ ٹیک سنگھ، پنڈی اور پورا آزاد کشمیر۔''

''آپ نے لائلپور کا ذکر نہیں کیا؟''

''سمجھدار ہو بابو۔لائلپور حال حاضر فیصل آباد سے اس لئے لوگ نہیں آئے کہ وہاں ٹیکسٹائل انڈسٹری قیام پاکستان سے پہلے سے چل رہی ہے۔وہاں مزدوری بہت ہے اور پھر وہاں کاشت کاری اور بزنس بھی ہے۔وہ کیوں آئیں گے؟''

''یہ بات میں اس کے تجربے کے منہ سے کہلوانا چاہتا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ فیصل آباد سے ورکر برطانیہ نہیں آئیں گے۔''

''تو سرجی آپ برطانیہ کو سمجھیں کہ یہاں پاکستان سے قانونی غیر قانونی طرح سے لوگ روزگار کے لئے آرہے ہیں اور جو آچکے ہیں وہ بیچارے پیسہ کما کر واپس پاکستان بھیج رہے ہیں جہاں وہ اپنی نوبیاہتا بیوی چھوڑ آئے ہیں۔ان خوابوں میں صرف پیسہ کمانا ہی نہیں ہے۔ولایت میں آکر اپنی شہرت کا سامان بھی کرنا ہے اس لئے کچھ تو پیسہ کمانے کے جنون میں دن رات ایک کر رہے ہیں اور جن میں کچھ جراثیم شاعری، ادب، موسیقی یا اس قسم کی سرگرمیوں کے ہیں وہ کام کے ساتھ ان شعبوں میں شہرت کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔''

میرے لئے یہ بات بے حد دلچسپی کی تھی کہ یہاں بھی شاعروں کی بھنبھناہٹ سننے کو مل سکتی ہے۔ اگرچہ لائلپوری کی ترقی پسند شاعری میں بلیک لیبل کے ساتھ سن چکا تھا لیکن ابھی اور بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا اس کا پتہ نہیں تھا۔میں نے یہ بھید پانے کے لئے پوچھا ''تو یہ شاعر ادیب کون لوگ ہیں اور آپ اپنے اخبار کے ذریعے ان کی شہرت کا سامان کرنا چاہتے ہیں؟''

''ان کی شہرت سے زیادہ اپنا اخبار خواتین میں مقبول بنانا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ خواتین کچے پکے جذبات لے کر آئی ہیں۔ ان کی آبیاری تو اب ہم پر فرض ہے ناں۔ یہاں جیسے میں نے بتایا معمولی گھروں سے قرضے لے کر، زمینیں بیچ کر یہاں تک پہنچنے والوں کے پاس اپنے والدین کو دینے کے لئے ایک تحفہ تو خون پسینے کی کمائی ہے اور دوسرا تحفہ یہ ہے کہ پردیس میں نام بھی کمایا تو نام کمانے کا آسان نسخہ ان کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ شعر و شاعری پر ہاتھ صاف کریں۔ یہاں چار پانچ شاعر ایسے ہیں جو یا تو ٹیکسی چلاتے ہیں یا دن بھر دکان پر کام کرتے ہیں یا پھر کسی ریستوران پر کام کرتے ہیں۔ وہ ان اخباروں تک رسائی چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ہم ان کی خواہش پوری کریں گے۔''

''وہ ان اخباروں کے تراشے جب اپنے قصبے، گاؤں یا شہر میں اپنے دادا، اپنے والد یا اپنے تایا کو بھیجیں گے تو وہ فخر سے اپنے گاؤں یا شہر محلے کے لوگوں کو کسی نائی کی دکان پر، کسی سبزی کی دکان پر روک کر بتائے گا دیکھو ہمارا لڑکا ولایت جا کے مشہور ہو گیا ہے۔''

میں نذیر خیالی پسروری کے مشاہدے پر عش عش کر اٹھا لیکن اس نے مجھے مزید حیران کر دیا جب اس نے مستقبل کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔

''او سر جی، میں اِدھر یہی کام کرتا ہوں۔ پاکستانی شاعر، گلوکار، فن کار جو بھی آتا ہے آپ کے بھائی کی آشیرباد کے بغیر اِدھر کوئی فنکشن نہیں ہوسکتا۔ ٹکٹ تو میں نے بیچنے ہوتے ہیں اور ٹکٹ میں اپنے اخبار کے پڑھنے والوں کو بیچتا ہوں تو پھر سنو، بات یہ ہے کہ یہاں شاعروں اور گلوکاروں کو پتہ چل گیا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں کالم نویسوں اور ادبی پرچوں یا اخباروں کے ادبی صفحوں کے انچارجوں کو اگر یہاں بلایا جائے اور اپنے گھروں میں ٹھہرا کے لندن کا ایک چکر لگوا دیا جائے اور اگر کوئی چسکی لیتا ہے تو اُسے سکاچ ٹکا دی جائے تو وہ واپس جا کر ان کے قصیدے اپنے کالموں میں لکھیں گے۔''

اب میں اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تو مستقبل کا منظر نامہ ہے۔ یہ اس نے کیسے سمجھ لیا تو میں اس کی صحافتی زندگی کے تجربات کا قائل ہو گیا کہ مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ یہاں پاکستان سے شاعروں، فن کاروں اور گلوکاروں کو بلایا جائے گا اور اپنے ذوق کی تسکین کے ساتھ اپنی شہرت کا سامان بھی کیا جائے گا۔

اس پر میں نے پسروری سے پوچھا ''یہ آپ نے جو منظر نامہ دیا ہے اس کی کوئی معلومات بھی ہیں۔''

''اوئے سرجی، معلومات سن لیں۔ اُدھر پاکستان میں ایک نیا فتنہ جاگا ہے۔ اخباروں میں کالم نویسوں کو ضیاء الحق کے مارشل لاء نے معتبر بنا دیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ کالم نویس خبر نویس نہیں ہوتا، وہ بیچ میں کبھی مار دینے کے لئے مارشل لاء کو چکر دے سکتا ہے اور ایسے میں پاکستان میں کچھ اخباروں کے کالم نویسوں اور ادبی صفحوں کے انچارجوں نے اپنے قارئین پیدا کر لئے ہیں جس کی وجہ سے یہاں ان کی ایک اہمیت بن چکی ہے تو پھر وہ یہاں بلائے جائیں گے۔ ادھر مشاعرے اور ادبی تقریبات تو ہوتی ہی نہیں، پھر دیکھنا یہ مارشل لاء اخباروں سے صحافیوں کو کس طرح ٹکے ٹوکری کرتا ہے۔''

''صحافی اس مارشل لاء میں شدید دباؤ سے تو گزر رہے ہیں مگر انہیں ٹکے ٹوکری کیسے کیا جائے گا، یہ تو بتاؤ۔''

''او سرجی جب خبر کی جڑ ہی ماردی جائے گی تو صحافی کیا کرے گا۔ ضیاء الحق دیکھنا پاکستان سے صحافت اور صحافیوں کا جنازہ نکال کے رہے گا، لکھ لیں۔''

''تو پھر خبر کی جگہ کون لے گا؟'' میں ذرا تفصیل سے اس کا تجزیہ سننا چاہتا تھا۔

''خبر کی جگہ خبر ہی لیا کرتی ہے مگر ذرا گھوم پھرا کے۔ وہ ایسے کہ مارشل لاء کو سیدھی خبر گولی کی طرح لگتی ہے اس لئے اخبار والوں نے کالم نویسوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے رکھنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ کالم نویس کے پاس زبان کے چور دروازے ہوتے ہیں جن سے وہ جھانک کر قاری کو اندر کی خبر بتا سکتا ہے۔''

''پسروری یہ تو آپ ایسی باتیں کر رہے ہو کہ بڑے سے بڑا جغادری تجزیہ نگار بھی نہیں کر سکتا۔''

''بس پسرور میں جو پیدا ہو گئے۔ مول نہیں پڑا۔ ایسے تو آپ کو نہیں چنا۔''

''تو اس کا مطلب ہے کالم نویس ایک نئی تاریخ رقم کرے گا۔''

''دیکھو جی خبر تو ہر اخبار کے پاس ہوتی ہے اور ایک جیسی ہوتی ہے۔ اخبار کو اب اٹھائیں گے، کالم نویس اور ان کے لاکھوں کے معاوضے ہوں گے۔ جس کے پاس بڑا کالم نویس ہوگا وہ اخبار بکے گا۔ اخبار خبر سے کبھی نہیں بکا کرتے۔''

میں دیکھ رہا تھا مستقبل کی پاکستانی صحافت کو لندن کی شام میں ایک عطائی قسم کا اخبار کا مالک مجھے کیسی کیسی پیش گوئی سنا رہا تھا۔ میں نے مزہ لینے کے لئے پوچھا'' جب یہاں کے پاکستانی اپنی محبت میں

پاکستانی کالم نویسوں کو اور ادبی صفحوں کے انچارجوں کو بلائیں گے تو پھر انہیں گھروں کے کھانے کھلا کر رخصت کریں گے تو وہ جا کر کس طرح کا کالم لکھیں گے کہ انہیں اگلے سال پھر بلائے جانے کا سامان بھی کرنا ہوگا۔"

اس پر پسروری ہنسا اور میری شرارت کو بھانپ گیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا "آپ میرا "چیزا" لے رہے ہیں۔ آپ کو اندر سے سب پتہ ہے۔"

"نہیں یار، میں آپ سے متاثر ہو کر پوچھ رہا ہوں، مجھے مزہ آ رہا ہے آپ کو سن کر۔"

"اچھا تو پھر سن لیں۔ لندن پاکستانیوں کے لئے ابھی بھی جنت ہے اور ایک جہاز کی ٹکٹ میں بڑے سے بڑا فن کار، کالم نویس، شاعر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ ابھی لندن پاکستانیوں کے لئے اس طرح نہیں کھلا کہ ہم کہہ سکیں کہ کسی کو اس کا جلوہ دکھائیں اور وہ فریفتہ نہ ہو۔ تو ایسے میں جو کالم نویس یہاں کے شاعروں کے گھر ٹھہریں گے وہ واپس جا کر کیا لکھیں گے۔ بس اتنا بتا دو۔"

"او سر جی کیا لکھیں گے کہ جس کے گھر کا کھانا کھا لیں گے، اپنے کالم میں جا کر لکھیں گے کہ فلاں شاعر کے گھر ٹھہرے تھے۔ بھابی کے ہاتھ کے کوفتے اور کریلے گوشت کبھی نہیں بھول سکتے اور جس طرح فلاں شاعر نے ہمیں لندن گھمایا وہ زندگی کا بڑا تجربہ ہے۔ اس شاعر کے کلام میں ایک فطری تخلیقی ذائقہ بولتا ہے۔"

میں ہنسنے لگا کہ یار پسروری تم تو سب حال جانتے ہو۔ "اب میرے لئے کیا حکم ہے۔"

"کل دفتر آ جاؤ۔"

اب طیفا بٹ بولا "میں اتنی دیر سے یہ انٹرویو سن رہا ہوں، اب ذرا سی دارو پی لو اور کڑاہی گوشت بنواتا ہوں۔"

یہ شام تو انجام کو پہنچی اور مجھے ایک دروازہ مل گیا کہ میں لندن میں خود کو کچھ ثابت کر سکوں اور میرے لئے ایک بندوبست نظر آیا۔ یہ میرا لندن سے پہلا رشتہ تھا جو بنتا نظر آیا۔

دفتر "صدائے پاکستان" ساؤتھ ہال ہی کے ایک گھر کے باہر کے حصے میں قائم تھا۔ چھوٹا سا بورڈ لگا تھا۔ باہر کی طرف کھلتا دروازہ اندر داخل ہوں ایک کمرہ جس میں ایک دفتری میز، کرسی اور اخبار کو مرتب کرنے کا ساز و سامان موجود تھا اور یہ کام پسروری خود کرتا تھا۔ میرا کام صرف اخبار کے لئے مواد جمع

کر کے ترتیب دینا تھا۔ وہاں ایک بیڈ بھی تھا اور ساتھ میں باتھ روم بھی موجود تھا۔ میں نے اپنا سیاسی پناہ گزینی والا فلیٹ بھی رکھا اور پسروری سے پوچھ کر وہاں رہائش اختیار کر لی کہ میں اس جگہ سے دور رہ کر اپنا کام نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بارونق علاقہ تھا۔ میں اس علاقے کی اداسی اور تنہائی سے نکل آیا۔ پہلے پہل میں نے خواتین کا صفحہ اور ادبی تڑکا لگانے کے لئے شاعری کا حصہ مختص کیا۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ شروع میں عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، رضیہ بٹ، ہاجرہ مسرور اور اس طرح کی خواتین افسانہ نگاروں کی مختصر ترین تحریریں اِدھر اُدھر سے جمع کر کے چھاپنا شروع کیں۔ لائبوری کی لائبریری سے مجھے استفادے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ میرا کام چل نکلا۔ شاعری کے لئے میرے پاس احمد فراز، ناصر کاظمی تیر بہدف نسخے کے طور پر موجود تھے۔ یوں تو مجاز، مصطفیٰ زیدی اور منیر نیازی کا تڑکا بھی لگا لیتا تھا۔ ویسے میری جیب میں اختر شیرانی اور ساحر لدھیانوی بھی موجود تھے لیکن وہ اس زمانے میں ذرا آؤٹ آف فیشن ہو گئے تھے۔ اب ڈاک میں بھی خواتین کی تحریریں جو کہ کچی پکی تھیں، موصول ہونا شروع ہوئیں۔ میرے اندر کا ویران آدمی اندر سے خواب میں چہچہانے کے لئے انگڑائی لینے لگا۔ ایک خاتون کی تحریر نے چونکا دیا۔ ظاہر ہے وہ کسی افسانہ نگار کی تحریر نہیں تھی۔ عام سی گھریلو لڑکی کی تحریر تھی۔ اس نے لکھا کہ میں اپنی سچی کہانی اپنے نام سے نہیں دے سکتی۔ میں بی اے پاس ہوں اور یہاں شادی کے بعد آئی ہوں۔ میں لکھ نہیں سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کا دفتر میں نے دیکھ رکھا ہے۔ میں بھی اسی علاقے میں رہتی ہوں۔ میں کسی وقت موقع پا کر خود آنا چاہتی ہوں۔ آپ خط کا جواب نہ دیں۔ کسی وقت میں آپ کے دفتر آ جاؤں گی۔

اس خط نے مجھے بے چین کر دیا کہ اب کہانیاں میرے پاس آنے والی تھیں۔ ایسے میں دفتر سے میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے کہاں جانا تھا۔ میں یا تو لکھتا تھا یا بازار کا چکر لگا آتا تھا۔ ہر طرف ایک زندگی کئی طرح کے رنگ دکھا رہی تھی۔ جب بھی میں سڑک پر آتا، مختلف پگڑیوں کے سکھ بھائی آتے جاتے نظر آتے۔ پاکستانی کئی طرح کے لباسوں جن میں دھوتی سے لے کر چوڑی دار پائجامے تک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی شیروانی اور واسکٹ تو عام طور پر دکھائی دے جاتی تھی۔ شراب کی دکانیں آس پاس تھیں مگر مجھے دن میں شراب پینے سے نفرت تھی۔ صرف شام کے بعد جیسا لاہور میں منیر نیازی نے سکھایا تھا بس اتنا ہی پاک ٹی ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ پر جو لے لیتے تھے وہی روایت جاری تھی۔ اب میرے لئے لندن ایک تجربے کے طور پر ظاہر ہونے لگا تھا۔ اسی طرح کا ایک دن تھا، ایک خاتون کہ لڑکی نما تھی، شلوار قمیص دوپٹے میں آئی اور میرا نام لیا۔ میں نے اسے پہچان لیا اور پھر اس کی کہانی شروع ہوئی کہ اس کے پاس زیادہ وقت

نہیں تھا۔ کہانی جیسی سنی ویسی پہنچادی۔

''میں چیچہ وطنی کی بی اے پاس لڑکی ہوں۔ اپنے کالج کی بہترین ڈبیٹر تھی۔ سپورٹس گرل تھی۔ لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی تھیں۔ میرا باپ مارکیٹ کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ اب بھی ہو گا مجھے پتہ نہیں۔ ہم بہت خوش تھے۔ میرا بھائی میڈیکل میں پڑھ کے ڈاکٹر بن رہا تھا۔ ہم چیچہ وطنی کے بہت معزز گھرانے کے لوگ تھے۔ زمینداری بھی تھی اور کاروبار بھی۔ ایسے میں خاندان کے بڑوں نے میری شادی ہمارے ایک دور کے رشتہ دار سے طے کر دی کہ لڑکا لندن میں بزنس کرتا ہے۔ فیملی کا لڑکا ہے۔ کسی نے جا کر حقیقت ہی معلوم نہ کی۔ جانے کے لئے ویزہ چاہئے تھا۔ یہاں کس کے پاس وقت تھا۔ بس لڑکے کو بلایا۔ شادی کر دی اور پھر جب میرا ویزہ آیا تو وہ مجھے لے کر یہاں پہنچا۔''

''اگر آپ اپنی کہانی یہاں روک دیں تو اسے مکمل میں کر سکتا ہوں۔''

''آپ کر تو لیں گے مگر جس طرح یہ کہانی مجھ پر گزری یا گزر رہی ہے شاید آپ اسے مکمل نہ کر سکیں گے۔''

''ٹھیک ہے آپ اسے مکمل کریں۔''

''تو پھر میں جب لندن کے اُس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی جہاں میں اب رہتی ہوں تو وہاں ایک گوری عورت سامنے کھڑی تھی۔ اس نے کہا میں اس آدمی کی بیوی ہوں کہ میری وجہ سے اسے یہاں لندن میں رہنے کی قانونی اجازت حاصل ہوئی ہے۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔ اب میں اپنے ہوش کھو چکی تھی۔''

''مجھے معلوم تھا اندر سے یہی کہانی نکلے گی۔''

''کہانی تو آگے ہے۔''

''میں سن رہا ہوں۔''

''میں کچن اور اپنے کمرے تک محدود ہو گئی۔ مجھے پہلے دن اپنے شوہر سے شدید نفرت ہو گئی کہ اس نے پورے خاندان کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ میں اب کیا کر سکتی تھی۔ مجھ پر اس نے پابندی لگا دی کہ میں فون نہیں کر سکتی تھی۔ اگر پاکستان سے فون آتا تو وہ مجھے نہیں سننے دیتا تھا۔ جب پاکستان میں میرے گھر والوں کو محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کچھ ہو گیا ہے تو انہوں نے کسی کے ذریعے معلومات کرائیں۔ سب راز کھل گیا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرے شوہر نے معافی تلافی کرنے کی کوشش کی کہ مجھے پاؤں جمانے کے لئے گوری کے سہارے کی ضرورت تھی اور یہ کہ وہ جلدی مجھ سے الگ ہو جائے گی۔ میں نے اسے استعمال

کیا ہے اور جب وہ چھوڑ جائے گی تو میری اولاد اسی پاکستانی بیوی سے ہو گی وغیرہ وغیرہ۔''

''تو پھر تمہارے والدین نے یہ معافی قبول کر لی؟''

''وہ کر بھی کیا سکتے تھے، ہزاروں میل دور بیٹھے بیٹی کی قسمت کو رونے کے سوا وہ کیا کر سکتے تھے۔''

''اب تم نے کس طرح اس آدمی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔''

''میں برطانیہ کے قانون نہیں جانتی تھی۔ اب بھی نہیں جانتی ہوں کیونکہ میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔''

''تو اب کیسے باہر آئی ہو؟''

''یہ بھی ایک کہانی ہے۔''

''تو یہ بھی سنا دو۔''

''جب میں اس گھر میں آئی تو پہلی رات میرے خاوند نے مجھے بے آبرو کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ تم ایک عورت کا ریپ کر رہے ہو۔ اس نے کہا تم میری بیوی ہو۔ میں نے کہا میں اب تمہیں شوہر تسلیم نہیں کرتی۔ یہ حق مجھے میرے مذہب اور اللہ نے دیا ہے۔ اس نے کہا نکاح ہوا ہے۔ میں نے کہا نکاح میں دھوکہ ہوا ہے اور اگر نکاح ہوا بھی ہے تو بیوی کے ساتھ شوہر زبردستی نہیں کر سکتا۔ اس پر اس نے زبردستی کی مگر میں نے اسے تھپڑ مارا اور اس کی مردانگی کو میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ آپ کو حیرت ہو گی اس کی گوری بیوی نے اس کام میں اس کی مدد کی۔ اس طرح وہ ریپ کرنے میں کامیاب تو ہوا مگر اب وہ موقع پا کر معافیوں پر اتر آیا کہ کسی طرح میرا دل جیتنے کی کوشش کرے۔ میرا لندن میں کوئی نہیں کہ میں بھاگ کر وہاں چلی جاؤں۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ دیکھیں کب کامیاب ہوتی ہوں۔ پاسپورٹ اس نے چھین لیا ہے۔ اس کی گوری بیوی کا ہی یہ گھر ہے۔ وہ اس کے پیسوں سے سارا دن اور رات شراب پی کر گری رہتی ہے۔ جب کبھی ہوش آئے تو میک اپ کر کے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کو نہیں پتہ ہوتا وہ کیا کر رہی ہے، کہاں جا رہی ہے۔ وہ خود شام کو آتا ہے اور اس کے ساتھ شراب پینے میں لگ جاتا ہے۔ میں کھانا بناتی ہوں اور جو مجھ سے ہو سکتا ہے، کرتی ہوں۔ میں یہ کہانی اس لئے دینا چاہتی ہوں کہ پاکستان کی لڑکیاں میری طرح یہاں شادی کے فریب میں آ کر اپنی زندگیاں تباہ نہ کریں۔''

یہ کہانی دے کر وہ چلی گئی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا ''نام کبھی تھا، اب تو نام بھی

نہیں ہے۔ آپ سمجھ لیں کوئی صائمہ، سعدیہ، نازیہ، رخسانہ، پروین، سمین وغیرہ۔'' اس طرح اخبار کو ان کہانیوں کا تڑکا لگتا رہا اور مقامی شاعروں کی سرگرمیاں بھی کھلتی گئیں۔ اب میں کچھ دن اس اخبار کی اشاعت کو بڑھانے کے بعد اکتا گیا۔ کیا میرا مصرف لندن میں بس یہی ہے۔ البتہ میں اس ڈراؤنے خواب سے نکل آیا۔ اس دوران مجھے ایک دن سولنگی مل گیا۔ وہ بھی ایسے کہ وہ اپنے سائیں کا سیاسی بیان لے کر آیا کہ اسے ہیڈ لائن بنایا جائے۔ میں نے اس ہیڈ لائن کی قیمت جو پسروری نے طے کر رکھی تھی بتائی تو وہ اس نے ادا کر دی اور وہ ہیڈ لائن لگ گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جو جلاوطن سیاسی رہنما ہیں وہ یہاں کاروبار کے ساتھ عیاشی کو بھی اپنی زندگی کی اہم ضرورت سمجھ کے انجام دے رہے ہیں۔ لندن کے جوئے خانے ان کے انتظار میں تھے۔ یہ سارا کلچر سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں تھا کہ برطانیہ جس نے ہندوستان کو غلام بنا کر ایک حاکمیت کا سسٹم اور ذہنی تبدیلی کے ساتھ مکمل معاشی کلچر بنایا تھا وہ اس تجربے کو اب اپنے ملک میں دہرا رہا تھا۔ وہ جن راجوں، مہاراجوں، ٹھاکروں، نوابوں اور سرداروں کو لوٹ لاٹ کے چلا گیا تھا، اب ان کی اولادیں انہی جاگیروں، ضمیروں اور ذہنی رویوں کے ساتھ پل کر جوان ہونے کے بعد پاکستانی سیاست کی جڑوں میں سرایت کر چکی تھیں اور ضیاء الحق کے مارشل لاء نے انہیں بظاہر ملک اور سیاست سے بے دخل کر دیا تھا مگر اصل میں وہ انہیں مستقبل کے پاکستان میں بے حد مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر کراچی کو مہاجروں کے حوالے کرنے میں اس کا کردار مہاجروں کی خدمت کرنا نہیں تھا۔ مہاجر کارڈ پر بے شمار مافیا گروپوں کی تشکیل تھا۔ جو انہی مہاجروں کو لوٹ کر ایک نئی کلاس کو پیدا کرنا چاہتا تھا جو دبئی میں پراپرٹی خریدے گی اور یورپ میں لوٹی ہوئی دولت کو ٹھکانے لگائے گی۔ اس میں ضیاء الحق کے ساتھیوں نے بھی ہاتھ رنگنے تھے۔ پاکستان لیاقت علی خان کے وقت سے فوج کی ملکیت میں دے دیا گیا تھا اور اب فوج ہی سیاست دانوں کا احتساب بھی کر رہی تھی اور آنے والے زمانوں کے لئے انہیں وکٹری کا نشان بناتے ہوئے دوبارہ اسی سیاست کے بازار میں شان وشوکت کے ساتھ لانے کا سامان کر چکی تھی کیونکہ اسے تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی ایک سیاسی جماعت اس کا ساتھ زیادہ دیر تک نہیں دے سکتی تو پھر اسے دوسری سیاسی جماعت کو تیار کرنا ہوتا ہے۔ جب اسے ناکام بنایا جاتا ہے تو پھر تیسری سیاسی جماعت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کھیل ضیاء الحق نے شروع کیا اور اس کا ایک نیٹ ورک بھی بنا دیا اور اب وہ روایت اپنی آرمی کے حوالے کر کے آموں کی پیٹیوں میں دفن ہو گیا۔

اب جو میں نے لندن میں دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ بھٹو کے وارث لندن میں کیا کر رہے

تھے۔ پنجاب اور سندھ سے جاگیردار اور وڈیرے سیاسی پناہ کی آڑ میں ایک طرف تو پاکستان کے سادہ لوح عوام کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ لندن میں بھٹو کے جیالے سیاست دان جلاوطنی کا عذاب سہہ رہے ہیں اور دوسری طرف عربوں کے علاقے ایجویئر روڈ پر عیاشی کے تمام اڈوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اپنی اولادوں کے لئے مستقبل کا بندوبست کرتے ہوئے پراپرٹی خریدنے کے راستے تلاش کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں عیاشی کے راستے رک چکے ہیں۔ انہیں لندن میں جاری کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں مجھے سولنگی جو کہ ان سندھی اور پنجابی وڈیروں کا بے قیمت ملازم تھا، اس نے بتایا کہ کل آپ کو وڈیرے سائیں جتوئی نے بلایا ہے۔ بڑی کچاہری لگے گی۔ اب میں سوچنے لگا کہ جانا تو چاہئے کہ میرے پاس کون سی مصروفیت ہے۔ اور پھر میں ایک مقامی اخبار کی مقامی ضروریات کا اسیر بھی تھا اس لئے جا پہنچا تو وہاں کا منظر بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ پاکستان میں ضیاء الحق نے فلم انڈسٹری کو کیسے دیوار سے لگایا کہ صرف سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کی فلموں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہوئی۔ ہر طرح کی فحاشی کو بھی آزاد کر دیا گیا۔ اب اس کے پیچھے کیا منطق تھی، وہ یہ تھی کہ خواتین سینما کو خیرباد کر چکی تھیں۔ ضیاء الحق یہ چاہتا تھا کہ مرد حضرات افیون کی طرح فلموں میں مست ہو جائیں اور سینما ہال بھرے رہیں۔ ایسے میں صرف وہ مرد حضرات ہی سینما جا سکتے تھے جن کا ذوق نہیں تھا۔ جو موٹر ورکشاپ پر کام کرتے تھے یا معمولی دکانوں پر دیہاڑی کماتے تھے۔ وہ سینما جا کر دن بھر کی مشقت دور کرنے کے لئے گھٹیا ڈانس اور بے معنی فائٹ دیکھ کر اپنا کیتھارسس کر کے گھر چلے جاتے تھے۔

فلم انڈسٹری زوال کی طرف کا سفر شروع کر رہی تھی۔ کوئی تخلیقی مزاج یا تعلیم یافتہ طبقہ فلم کے کاروبار کا حصہ نہیں تھا۔ لاہور کے فلمی سٹوڈیوز میں صرف چند گیت نگار ہی اپنی روزی کا وسیلہ بنانے کے لئے موجود تھے۔ باقی وہاں جو فلم کے تخلیقی حصے سے تعلق رکھتے تھے ان کا کسی بھی طرح سے ادب، شاعری، تھیٹر یا فلم کی تعلیم و تربیت سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انہوں نے تو سکول کالج کی شکل ہی شاید دیکھی ہو گی۔ یوں تو لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے بس معمولی سی کوشش اس فن کیلئے اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے کی ہو گی جسے وہاں بیٹھے پیشہ ور جغادریوں نے ناکام بنا دیا کہ ان کا مضبوط نیٹ ورک اور مافیا تھا۔ اس لئے پاکستان میں کوئی قابل ذکر تخلیقی کام نہ ہو سکا۔ ضیاء الحق کا یہ زمانہ ایسا آیا کہ سٹوڈیو باقاعدہ سرمایہ کاروں کے لئے دلال کا کردار ادا کرنے لگے۔ پیشہ ور ڈائریکٹر فلم میں کام کرنے والی لڑکیوں کو ہیروئن بنانے کے خواب کے ساتھ باقاعدہ سپلائی کرنے کا دھندہ کرنے لگے۔ ٹبی گلی کا بازار حسن ماند پڑ چکا تھا۔ وہاں سے

گانے والیاں اور جسم کا کاروبار کرنے والیاں مختلف نئے آباد ہونے والے علاقوں میں منتقل ہو رہی تھیں اور وہ اپنا دھندہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں لے کر آ رہی تھیں۔ تماش بینی اور جسم فروشی کے اڈے کوٹھیوں اور بنگلوں میں کھل چکے تھے۔ ایسے میں جو لڑکی فلم تک رسائی پا لیتی تھی، راتوں رات وہ دھندے کی معراج پا لیتی تھی۔ ان کے گماشتے ہر وقت فلم کے سرمایہ کاروں کے لئے ان نئی لڑکیوں کو پیش کرنے میں مصروف رہنے لگے تھے۔ ایسے میں گماشتوں نے مقبول اور زیادہ اشاعت کے اخبارات کے ہفتہ وار فلمی ایڈیشنوں کے انچارجوں سے گٹھ جوڑ کیا اور ہر ہفتے اپنی لڑکیوں کے اوپر رنگین فیچر شائع کرا کے ان کی پروموشن کرانے لگے۔ جس سے ان لڑکیوں کی فلموں میں آنے کے بعد شہرت کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا کہ فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد تو کم ہوتے ہوتے صفر کے برابر ہو رہی تھی۔ اس طرح فلمی صحافی بھی دلالی کے دھندے میں برابر کے شریک ہو گئے۔

اب فلموں سے زیادہ شو بزنس کی لڑکیوں نے دوسرے راستوں سے امیر بننے کا ہنر پا لیا تھا۔ فلمیں محض شہرت کا پہلا زینہ تھیں اور بعض دلالوں نے تو فلموں میں سرمایہ کاری کر کے اپنی لڑکیوں کے لئے ہیروئن کا ٹائٹل حاصل کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔

اب فلمیں صرف اور صرف عورتوں کے دھندے کے کاروبار کا ذریعہ بن چکی تھیں جس میں سٹوڈیو مالکان، فلمی صحافی، ڈائریکٹر، تکنیک کار، ڈسٹری بیوٹر سبھی ملوث ہو چکے تھے کہ سب کی روٹی روزی عورتوں کی دلالی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ ان فلمی نام نہاد اداکاراؤں اور ہیروئنوں کو کراچی، دبئی اور ملک کے دوسرے حصوں میں رسائی کے لئے دلال موجود تھے۔ فلم کا ٹیگ لگا کے کسی بھی جگہ عورت کو بیچا جا سکتا تھا۔ ایسے میں سب سے اچھی منزل یورپ یا لندن تھی۔ یہ تھا سب کا خواب لیکن دبئی بھی کم منزل نہیں تھی کہ شاپنگ کا خواب اور دولت مند بننے کا وہ بھی ایک آسان راستہ تھا کہ وہاں عربی گاہک موجود تھے۔ ایسے میں پاکستان کے مختلف طبقوں نے دولت مند بننے کے مصنوعی راستے ایجاد کر لئے تھے اور اس کو ضیاء الحق اور اس کے ذریعے سے اوپر آنے والوں جن میں بیوروکریٹ، جرنیل، سرکاری صحافی اور ان کے کاسہ لیس تھے جن کا زیادہ تر تعلق ایک مذہبی جماعت سے تھا، شامل تھے۔ یہ دولت کا کاروبار آنے والے وقتوں میں لینڈ مافیا کے ذریعے فوجی جرنیلوں کی سرپرستی میں ایک بہت بڑے کارپوریٹ سیکٹر میں تبدیل ہونے والا تھا جسے اس وقت میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پاکستان تبدیل ہو رہا تھا اور ہمیں خبر ہی نہیں تھی۔

اب جو سولنگی کی دعوت پر میں سینٹرل لندن کے ایک بڑے اپارٹمنٹ میں شام سے پہلے پہنچا

جہاں سائیں جتوئی کی بڑی کچاہری لگنی تھی۔ مجھے سولنگی نے اپنے کمرے میں بٹھادیا اور حسب دستور وہ پارٹی کی ضروریات میں مصروف ہوگیا۔لندن کی شام اور غریب کی بیٹی کی جوانی کو آنے میں وقت نہیں لگتا۔اس کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔اب کچاہری لگ گئی۔معتبر لوگ آ گئے تو شام کے لوازمات شروع ہو گئے۔ مجھے جتوئی صاحب کے سامنے پیش ہونا پڑا۔

''اڑے بھئی، اپنے انقلابی شاعر آئے ہیں۔ بابا کوئی حبیب جالب والی تان لگاؤ ناں۔ یہ جو آپ کی آزاد شاعری ہے بابا یہ تو ہمارے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ہاں اپنے شیخ ایاز کی بات اور ہے۔''

''سائیں اب کہاں شیخ ایاز، حبیب جالب، میں تو سائیں قصوروار ہوں حکومت کا بھی اور شاعری کا بھی۔''

''بھل بھل بھل، بھئی جواب تو سٹھو آیا ہے۔''

''ابھی تو سائیں آپ کی کچاہری جوبن پر نہیں آئی۔ آئے گی تو کچھ خوش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ہاں ہاں سائیں اپنا گلاس پکڑو، ابھی تو گرمائش شروع ہوئی ہے۔''

اب وہاں لوگ آنے لگے۔ معانقہ ملاحظہ، مکالمہ چلنے لگا۔ ایسے میں ایک بیل بجی تو سب چونکے۔سائیں کے ساتھ پنجابی اور سرائیکی علاقے کے سیاسی رہنما بھی کھڑے ہو گئے۔ محسوس ہوا کہ کوئی بڑی شخصیت آ رہی ہے۔اب جو دیکھا تو پاکستان فلم انڈسٹری کی ایک ہیروئن جو بے حد مشہور ہو چکی تھی، اپنے میک اپ اور غیر معمولی لباس میں دو تین گماشتوں کے جلو میں داخل ہوئی۔اس نے اپنی بانہیں غلط انگریزی بول کر سائیں جتوئی کے گلے میں ڈال دیں اور پھر گالوں کی چماچاٹی کے بعد سائیں نے اسے اپنے وی آئی پی مہمانوں سے ملوایا۔اب اس کے گماشتے پیچھے کسی جگہ چلے گئے کہ ان کا کردار ختم ہو چکا تھا۔ محفل نے ابھی جوبن لینا تھا۔مخصوص ریستوران کے بیرے لاہوری مچھلی، تکہ، پران اور دوسری نعمتیں لا رہے تھے۔وہ محبوبۂ محفل گلاس لئے بیٹھی تھی اور اس کی بلائیں لی جا رہی تھیں۔ کچاہری کا رنگ بدلنے کے لئے میری طرف سب کا رخ ہوا کہ سائیں کچھ شعر و شاعری ہو جائے۔اب میں ساری بات بھانپ چکا تھا کہ جتوئی صاحب نے مجھے بھی سامان آسائش و عیاشی میں شامل کر لیا ہے ورنہ آج کی شام بھلا مجھے کیوں بلایا جاتا۔اس پر میں اپنے آپ کو ایک دلال اور بقول منٹو ایک بھڑوا لگا لیکن کیا کیا جاتا کہ لندن کی اُس شام ضیاء الحق نے مجھے بھڑوا ہی تو بنا دیا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اپنی نظمیں تو ان کے کام نہیں آئیں گی۔ اس وقت یہ سب بے ذوق لوگ پھڑکتے لفظوں پر ہی جان دیں گے تو ایسے میں حافظے سے کام لینے کا سوچا اور پھر میں نے عبدالحمید عدم کے کلام کا تڑکا لگایا۔ سب وڈیرے، جاگیردار وہ شعر سن کر ایسے دیوانے ہوئے کہ اس فلمی ہیروئن پر ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے پھر میں نے مجاز کا کلام دکھایا۔ پھر میں نے فیض کا ٹکڑا بھی لگایا مگر کسی نے کوئی جنبش نہ کی۔ آخر میں حبیب جالب ہی کام آیا اور پھر جو ہاؤ ہو مچا اس میں وہ فلمی ہیروئن کچلی گئی۔ اب بڑے سائیں جتوئی صاحب نے اسے بانہوں میں لیا اور اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔ اس پر باقی ماندہ وڈیروں نے ایک ایک گلاس چڑھایا اور جو کھانا لگا تھا اس پر ٹوٹ پڑے۔

میرے لئے یہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سیاسی پناہ کی آڑ میں پاکستان سے جو بھی آیا ہے وہ ملک کی جمہوریت یا عوام کی بھلائی کے لئے جدوجہد کرنے یا آواز اٹھانے کی بجائے لندن میں قدم جمانے یا اپنے پرانے آقاؤں سے اب اپنی گزشتہ غلامی کی کچھ قیمت پاؤنڈز میں لینا چاہتا ہے اور اس کی خبر ان آقاؤں کو بھی تھی۔ یہ سب کچھ ایک تاریخی جدلیات کے مطابق ہونے جا رہا تھا مگر میں محض ایک فضول سا گواہ تھا۔ اگلے روز پھر یہی ناٹک دہرایا گیا۔ میں بھی گیا کہ مجھے تو یہ سب دیکھنا تھا۔ اگلے دن اس فلمی ہیروئن کو پاؤنڈز میں شاید مکمل ادائیگی ہو چکی تھی تو اس نے فلمی گیتوں پر رقص کیا۔ یہ مجرا ایک گھنٹے جاری رہا۔ ٹیپ ریکارڈر پر یہ گانے ترتیب دیئے گئے اور ہر گیت پر اس نے مجرا کیا۔ اس پر سب جاگیردار اور وڈیرے خوش ہوئے۔

پاکستانی فلم انڈسٹری یہ نیا کردار ادا کرے گی، اس کے آثار تھے کہ مسلسل بدذوقی اور بے ہودگی نے سینما جیسے آرٹ کا جو حشر کیا تھا یہ اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ اب دنیا کا ایک بڑا آرٹ بھڑوے گیری اور دلالی پر مامور ہو جائے گا۔ پاکستان میں فلم کی چھتری کے نیچے یہ دھندہ شروع تو معلوم نہیں کب ہوا تھا مگر اسے عروج ضیاء الحق کے زمانے میں حاصل ہوا۔

اب میں اخبار سے بھی اُکتا چکا تھا۔ لندن میں پاکستانیوں کے جو بھی گروہ اور طبقے موجود تھے وہ سب میرے سامنے کھلتے جا رہے تھے۔ میں واقعتاً ایک جلاوطن تھا۔ ایک پاکستانی شاعر کی حیثیت سے میری کوئی پہچان نہیں تھی۔ میں صرف ایک سیاسی پناہ گیر تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پاکستان سے کس طرح کے لوگ غیر قانونی طور پر اور دھوکہ دہی کے تحت برطانیہ میں آ رہے ہیں۔ سیاست دانوں، تاجروں، ملکی مجرموں کے ساتھ قانونی مجرموں کے لئے بھی راستے کسی نہ کسی طرح کھلے تھے۔ چونکہ میں پسروری کا اخبار چلا رہا

تھا، مجھ تک اس طرح کی خبریں پسروری کے مخصوص ذرائع سے پہنچ جاتی تھیں۔ وہ خبریں اس طرح کی ہوتی تھیں کہ ایک ٹیلی ویژن فن کار نے پشاور میں قتل کیا۔ پولیس کو پیسے کھلائے اور اپنے فن کار ہونے کی وجہ سے دعوت نامہ منگوایا۔ اس پر ویزہ لیا اور فرار ہو کر لندن میں آ گیا۔ میں اس سے ملا بھی۔ وہ بتانے لگا کہ خاندانی دشمنی کی وجہ سے یہ قتل ان کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ٹیلی ویژن پر نظر نہ آیا۔ وہ وہاں ٹیکسی چلانے لگا۔ پھر یہ خبر ملی کہ فلم کی شوٹنگ کے لئے ویزے لئے گئے اور اس میں وہ لوگ دس دس لاکھ روپیہ دے کر کریو میں شامل ہوئے اور کوئی کیمرہ مین بنا، کوئی اداکار، کوئی میک اپ مین، کوئی اسسٹنٹ، کوئی وارڈ روب وغیرہ کے شعبوں میں آیا۔ حقیقت میں نہ فلم بننی تھی نہ شوٹنگ ہونی تھی۔ وہ سب کے سب روپوش ہو گئے۔ اسی طرح یہ خبر بھی ملی کہ کوئی صحافی بن کے آیا اور سیاسی پناہ لے لی۔ کوئی احمدی بن کے آیا اور پناہ لے لی جبکہ وہ اچھا خاصا مسلمان تھا۔ داڑھی بھی چپکا رکھی تھی۔ اہل سنت والجماعت کا پیروکار تھا مگر احمدی بن کے وہاں پہنچا۔ اسی طرح کچھ شاعر بن کے آئے اور غائب ہو گئے۔

اسی طرح جعلی نکاح ناموں کے ذریعے ویزے لئے گئے اور برطانیہ جو کبھی ہمارا آقا تھا، بے وقوف بنتا رہا اور پھر اس کو اس چالاک ہندوستانیوں کا علم ہوا جس میں اب پاکستان بھی شامل تھا اور بنگلہ دیش بھی تھا۔ میں نے وہاں محسوس کیا کہ وہاں ہندوستان کے تین علاقے اپنی اپنی شناخت کے علاقوں میں رہائش حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انگریز خود چاہتا تھا کہ ان کے سابق غلام ان کے علاقوں سے نکل جائیں اور اپنی اپنی پاکٹ بنا کے رہیں۔ وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ پاکستانی، انڈین اور بنگالی خود ہی انگریزوں کے علاقوں کی مہنگی رہائش گاہوں سے دور بھاگ رہے تھے لیکن دوسری طرف سینٹرل لندن پر عرب ملکوں کے امراء کی نگاہیں لگ چکی تھیں۔ پیٹرو ڈالر کا جلوہ سامنے آ رہا تھا اور سینٹرل لندن سے گورے بھاگنا شروع ہوئے اور عرب اپنی محبوباؤں کے ساتھ جواء خانوں کی رونق بڑھانے لگے۔ برطانیہ خوشی سے نہال ہو گیا کہ پیٹرو ڈالر نے پاؤنڈ کی طاقت کو انجکشن لگا دیا ہے۔

میں اب دیکھ رہا تھا کہ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے برطانیہ کو ایک اور معاشی نظام ترتیب دینے کے لئے کوئی ہوم ورک دے دیا تھا۔ میں اب اکتا چکا تھا اور میں اس اخبار سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ میں خود کو اس اخبار اور سندھ کے وڈیروں کا دلال محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میں نے لائلپوری سے رابطہ کیا۔ وہ اپنی آف لائسنس شاپ میں کام کر رہا تھا۔ اس نے شام کو مجھے بلا لیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں مقامی اخبار میں اس کے کاروبار کی کچھ خدمت کر سکتا ہوں اس لئے اس نے دکان خلاص کی اور بلیک لیبل لے کر میرے ساتھ

گھر آ گیا۔ وہاں میں نے کھل کے لندن میں ہونے والے واقعات پر بحث کی۔ وہ مسکرایا اور اتنا کہا کہ یہ ایک عالمی منڈی ہے جہاں برطانیہ کے باج گزار ملکوں کے باشندے اپنی اپنی کالونیاں بنا کے رہ رہے ہیں اور اپنے آقا کی خدمت کر رہے ہیں لیکن ایک وقت آئے گا جب ان کی آبادی برطانیہ کے مقامی گوروں سے کئی گنا بڑھ جائے گی کہ یہ لوگ بچے پیدا کرنے کی مشین بھی ساتھ لائے ہیں۔ اس وقت یہاں کا وزیر اعظم کوئی ایشیائی ہوگا یا مکس بریڈ ہوگا۔

....
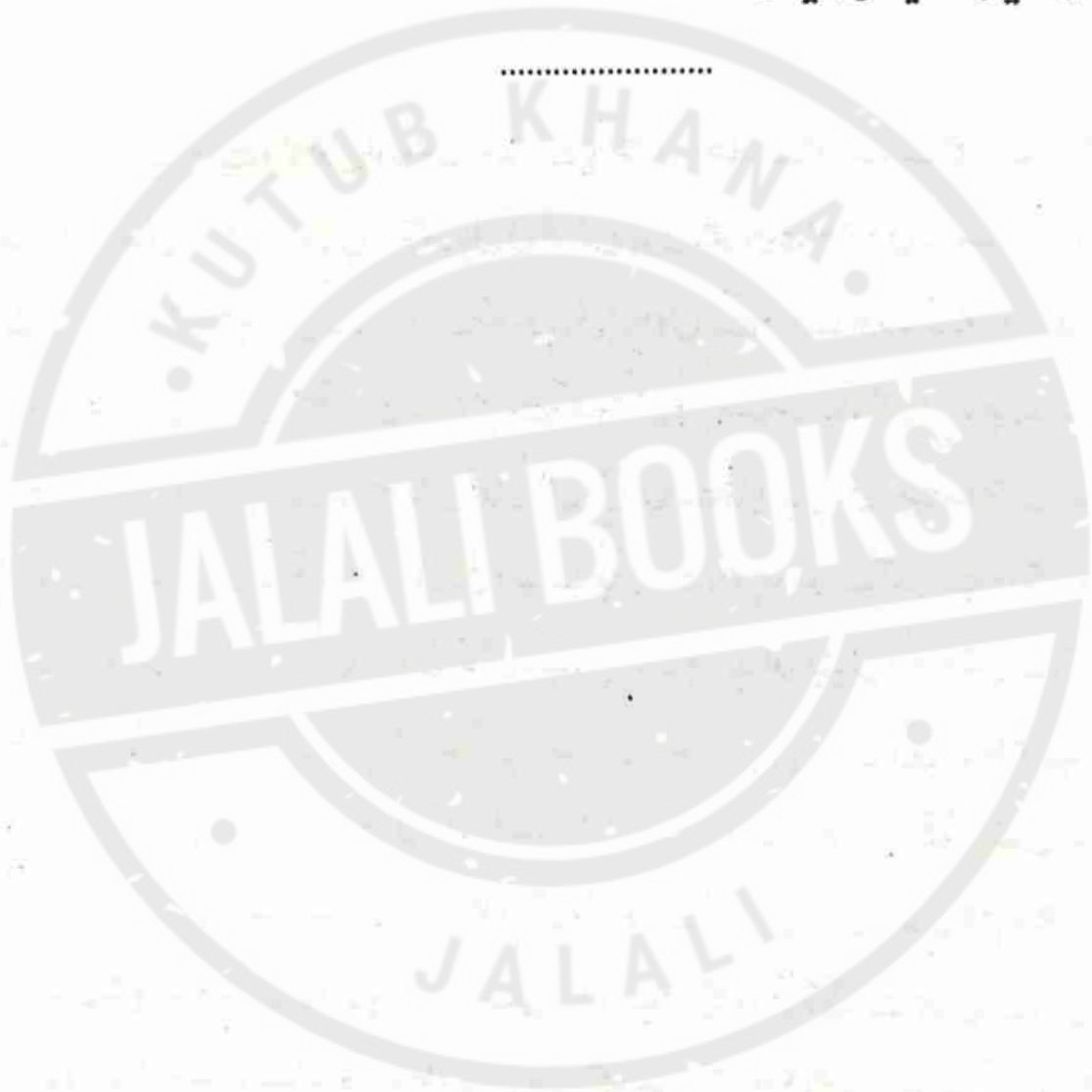
اب وہ پہلے والا جوش اور ولولہ ''صدائے پاکستان'' اخبار کے حوالے سے میرے اندر موجود نہیں تھا پھر بھی مقامی آبادی اور اہلیانِ ساؤتھ ہال کی نظر میں میری کچھ اہمیت موجود تھی۔ ایک شام میں طیفا بٹ کے ریستوران میں بیٹھا اس کے آئندہ کے کاروباری ارادوں سے واقف ہو رہا تھا جو وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سینٹرل لندن میں انڈین ریستوران کے نام سے ایک ہوٹل ٹورسٹ علاقے میں کھولنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا ''انڈین کیوں؟ پاکستانی ریستوران کیوں نہیں؟'' اس نے بتایا کہ پوری دنیا ہندوستان کو جانتی ہے۔ پاکستان کو اگر جانتی بھی ہے تو مارشل لاؤں کی وجہ سے جانتی ہے جو اچھا تعارف نہیں ہے اور پھر انڈین کا لفظ ہی ایسا ہے جس میں کئی صدیوں کی گونج شامل ہے۔ پورے یورپ اور جاپان وغیرہ میں بے شمار پاکستانی ریستوران انڈین ریستوران کے نام سے چل رہے ہیں۔ کھانا وہاں پاکستانی پیش کیا جاتا ہے جو بے حد لذیز ہوتا ہے، نام انڈین رکھنا مجبوری ہے۔ اب جو نام گردش کر رہے تھے وہ یہ تھے ''کندن ریستوران، مغل دربار، مہاراجہ نعمت خانہ، دہلی دربار، قلعہ معلیٰ ریستوران'' اور اسی طرح کے کئی نام موجود تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جو باسمتی چاول پاکستان میں پیدا ہوتا ہے وہ پہلے دبئی پہنچتا ہے جہاں سے اس پر انڈین کرنل باسمتی کا ٹیگ لگتا ہے اور پھر وہ ساری دنیا میں پہنچتا ہے۔ ہم معاشی طور پر بھارت کی ایک کالونی بن چکے ہیں۔ کیا کبھی ہمارے قائد نے ایسا سوچا تھا۔

میں طیفا بٹ کی باتیں سن رہا تھا کہ ایک اور کردار کہ چالیس سال کے لگ بھگ عمر تھی، ہاتھ میں وہسکی کی بوتل تھی جو وہ شاید اپنی گاڑی میں نیٹ پیتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے ٹھاہ کر کے بوتل رکھی اور کہا بٹ گلاس برف کا جو سب کچھ منگا۔ طیفا بٹ کے ملازم اسے پہچان کر آ گئے اور سب کچھ حاضر کر دیا۔ بٹ نے میرا تعارف محض اخبار کے حوالے سے کرایا اور شاعر وغیرہ بھی کہا۔ وہ بس ذرا سا چونکا۔ کوئی خاص اشارہ نہیں دیا۔ اب میرا گلاس بھی اس نے بنا دیا۔ بٹ نے بتایا یہ لندن کا بزنس کنگ ہے۔ میں نے ایسے کئی

کنگ اخبار کے اشتہارات کے حوالے سے سن رکھے تھے۔ بہر حال وہ واقعی کنگ نکلا۔ اس کی کئی گراسری کی دکانیں پورے برطانیہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ حلال گوشت کا سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ گوجرانوالہ کا چلتا پرزہ اور باتوں کا شہزادہ تھا۔ طیفا بٹ اس کے سامنے بچھ بچھ جاتا تھا جیسے چیونٹی کے گھر نرائن آ جاتی ہے۔ میں تو بس خاموش بیٹھا اس کی مہنگی وہسکی کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ یونہی ایک بات میری اس کو پاکستان کی تعریف میں اچھی لگی تو معلوم نہیں اس کے جسم میں کیا بجلی کوندی کہ بوتل اٹھائی، میرا ہاتھ پکڑا اور کہا اٹھو، یہاں کیا بیٹھنا۔ بٹ کی کڑاہی اچھی ہوتی ہے مگر ابھی ہم نے شغل میلہ کرنا ہے۔ چلو آج تمہیں اپنے ''وکٹوریہ کلب'' لے جاتا ہوں اور پھر وہ مجھے اپنی ''بنیٹلے'' کار میں لے کر بیٹھا جسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ لندن میں شوفر والی گاڑی پاکستانیوں کے پاس ہوگی یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب وہ شراب کی بوتل منہ سے لگائے پی رہا تھا اور مجھے بھی وہی بوتل آفر کر رہا تھا کہ گھونٹ لو۔ چونکہ بے حد قیمتی وہسکی تھی اس لئے اس کا نشہ فوری نہیں ہونا تھا۔ سرور کی کیفیت چل رہی تھی کہ کلب آ گیا۔ مجھے ایسے معلوم ہوا کہ سینٹرل لندن میں ماربل آرچ اور ہائیڈ پارک کے کنارے کہیں پر تھا۔ میں حیران کہ چند لمحے پہلے یہ آدمی ملا ہے اور مجھے یہاں لے آیا ہے۔ اس کا نام تک مجھے معلوم نہیں ہے لیکن بھلا ہو اس کلب کا اس نے اپنا نمبر بتایا اور دروازے کھل گئے اور پھر ایک مینیجر جو کلب سوٹ میں تھا، سامنے استقبال کے لئے آیا۔ وہ گورا تھا۔ اس نے کہا ''Wellcome to the Club Mr Javed Malik'' تو مجھے پتہ چلا کہ جاوید ملک ہے۔ جس کے بزنس کے اشتہار میرے اخبار میں تواتر سے شائع ہو رہے تھے۔

یہ کلب میں نے کیا دیکھنا تھا، میری تو لندن میں اوقات بس جتوئی صاحب کی محفل تک تھی۔ یہ مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ عربی اور ایشیائی باشندوں کی ضروریات اور نفسیات کو سامنے رکھ کے بنایا گیا ہے۔ تمام تر لوازمات بین الاقوامی کلب کے معیار کو سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے تھے لیکن وہاں برطانوی لوگ صرف اگر تھے تو وہ عملے کے ارکان تھے یعنی گورے ملازم ہر جگہ موجود تھے لیکن کوئی گورا خال ہی ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے لئے موجود تھا۔ ایشیائی، عربی اور افریقی لوگ موجود تھے۔ یہاں مجھے معلوم ہو گیا کہ برطانیہ میں پوری دنیا کو قابو کرنے کی جو صلاحیت تھی اس کا مظاہرہ یہاں ہو رہا تھا۔ اب میں تو پاکستانی کنگ کے ساتھ تھا۔ ہر طرح کی مہنگی شراب کا پروٹوکول سامنے آنے لگا۔ پھر ویٹر لیمب چاپس پرانز پلیٹر، فش فرائیڈ سے لے کر بٹیروں تک کی ڈشیں لے کر آئے جو میں نے لے لیں کہ میں زیادہ نشے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ جاوید ملک نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے رولیٹ پر لے گیا۔ یہ ایک طرح کا آسان جواء ہوتا

ہے۔اس نے مجھے بیس پاؤنڈ کا نوٹ دیا اور کہا یہ داؤ پر لگا دو کیونکہ ایک بات ہوتی ہے "Beginner's Luck" یہاں وہ چلتی ہے۔مطلب یہ کہ جو پہلی بار جواء کھیلتا ہے قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور پھر وہ جوئے کی لت میں لت پت ہو جاتا ہے اور اپنی ساری زندگی کی جائیداد اس کی نذر کر دیتا ہے۔دنیا کے تمام جوئے خانے اسی "Beginner's Luck" پر چل رہے ہیں۔میں نے وہ بیس پاؤنڈ لگائے جو سو پاؤنڈ لے کر آئے۔اب تو میں قائل ہو گیا کہ یہ جوئے کا دستور تو غلط ہو ہی نہیں سکتا۔بعد میں کہیں پڑھا کہ یہ جواء بھی جوئے خانے والے اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔آج تک جواء خانہ نہیں ہارا، ہمیشہ جواری ہارتا ہے ورنہ کوئی جواء خانہ دنیا میں موجود نہ ہوتا تو مجھے لگا مجھے جتوایا گیا ہے۔بہر حال اُس شام میں پندرہ سو پونڈ جیتا جسے جواء آتا ہی نہیں تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو اگلے دن آنا ہی نہیں تھا کہ میں تو ممبر ہی نہیں تھا تو میرا میزبان جاوید ملک بھی کھیلا۔اس نے بہت کچھ ہار دیا اور جب ہم وہاں سے نکلنے لگے تو کلب کے ایک آفیشل ممبر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا کہ "تم اس ممبر کے ساتھ تھے،تم کل آؤ گے؟"

میں نے کہا آف کورس، آؤں گا۔" اس نے وحشت بھری آنکھ سے دیکھا جس کا مطلب تھا تم نہیں آؤ گے اور جو تم جیت کے جا رہے ہو وہ ہم تمہارے اس مالک یا باس سے نکلوا لیں گے۔"

چونکہ مجھے دنیا کے جواء خانوں کا کلچر معلوم نہیں تھا، اس لئے میں نہیں جانتا تھا کہ یہ جواء خانے چل کن پیسوں پر رہے ہیں۔جاپان کے جواء خانے دنیا میں مشہور ہیں۔امریکہ کے جواء خانے تو سب کو معلوم ہیں۔اب وہاں ظاہر ہے ملکوں کی قیادت اور سیاست کی کرنسی لٹائی جاتی ہے تو میں تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن...... جاوید ملک نے مجھے ساؤتھ ہال گھر کے سامنے اُتارا جو اس اخبار نے مجھے فراہم کیا تھی۔ اس نے مجھ سے پندرہ سو پونڈ کا حساب نہیں لیا کہ اُس نے تو وہ کسی نہ کسی طرح کلب کو واپس کرنے تھے۔وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے کہ اس کے بعد شاید ان سے ملاقات کا امکان بھی نہیں تھا۔

اب ایسا ہوا کہ پسروری کے اخبار سے میں اُکتا گیا تھا کہ وہ خود ہی میری مدد کو آ گیا۔اس نے بتایا کہ یہاں جیلوں میں پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی قیدیوں کو ہر ہفتے اخلاقی تربیت دینے کے لئے ایک آسامی نکلی ہے جس پر تم بہت آسانی سے آسکتے ہو اور پھر جیلوں سے عدالتوں تک ان کی ترجمانی بھی تم کر سکتے ہو۔برطانوی حکومت اس کے لئے اچھا خاصا معاوضہ دیتی ہے۔اس پر میرے لئے تو ایک اور دروازہ کھل گیا۔

میرے لئے یہ نیا امتحان تھا۔میری ایک ٹریننگ ہوئی جس میں زبان اور ابلاغ پر قدرت کو جانچا

گیا پھر مجھے برطانوی قوانین کی ایک ہینڈ بک دی گئی جس میں ہر طرح کی معلومات تھی۔ اب میں تیار تھا کسی بھی جیل میں قیدیوں سے گفتگو کرنے کے لئے۔ کئی طرح کی جیلیں میرے پینل پر تھیں۔ بچوں کی جیل، خواتین کی جیل، عادی مجرموں کی جیل، معمولی جرائم کی جیل، پیشہ ورانہ امور کے جرائم کی جیل جس میں بینک فراڈ سے لے کر کھلاڑیوں پر جوئے کے الزامات تک شامل ہوتے ہیں۔ میرا کام ہفتے میں ایک بار کسی بھی جیل میں قیدیوں کی اصلاح کے لئے انہیں اخلاقی اور انسانی اقدار کی تربیت دینا تھا۔ پھر کسی بھی قیدی کو ترجمان کی ضرورت ہوتی تھی تو میں ایمرجنسی کال پر تھا۔ ایسے میں اس وقت تو لینڈ لائن کا فون ہوتا تھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو پیغام ریکارڈ کرنے کی سہولت ہوتی تھی۔ میں آ کر کال لے سکتا تھا۔

پہلے مجھے Juvenile جیل میں لے جایا گیا۔ ایک گھنٹہ میں نے گیارہ سال سے اٹھارہ سال تک کے قیدیوں کو زندگی کے مثبت رویوں اور برطانیہ کے معاشرے کی برکات اور قوانین سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ مجھے گھنٹے کے حساب سے معاوضہ ملنا تھا۔ میں جیل میں گیا تو سامنے چھوٹے سے ہال میں قطاروں میں تیس کے قریب لڑکے بیٹھے تھے۔ میرے سامنے ان کے جرائم کی شیٹ لا کر رکھی گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ پاکستانی لڑکے کیا کیا جرم کر سکتے ہیں۔ زیادہ جرائم یہ تھے کہ انہیں ڈرگز کی سمگلنگ میں کیریئر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا یعنی پاکستان سے ان لڑکوں کو بغیر والدین کے تعلیمی ویزے پر روانہ کیا گیا۔ جس تعلیمی ادارے میں ان کا داخلہ ہوا اس کی فیسیں ادا ہوئیں تب ویزہ لگا اور پھر ان کے بیگ کے خفیہ خانوں میں ہیروئن یا اسی طرح کی ڈرگز ڈال دی گئیں اور یہ بے چارے پکڑے گئے۔ یہ غریب گھروں کے لڑکے تھے جن کو سبز باغ دکھا کر منشیات کے نیٹ ورکس نے حاصل کیا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ میرے لڑکپن کے زمانے میں ملکہ ترنم نور جہاں کے خاوند اور اپنے وقت کے بے حد معروف ہیرو اعجاز کو بھی ہیتھرو ایئرپورٹ پر فلم ''ہیر رانجھا'' کی ریلیں ریلیز کرنے کے لئے لے جاتے ہوئے گرفتار کیا گیا اور اسے اس کمرے میں لایا گیا جو اس طرح کے مشکوک مسافروں کے سامان کی تلاشی کے لئے مخصوص ہوتا ہے تو اس فلم کی ریلوں میں ہیروئن چپکائی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے بے حد آسان اور محفوظ طریقہ تھا لیکن اس طرح کے محکمے ہر طرح کی جدت کو بھانپ لیتے ہیں۔ وہ ایسا نہ کریں تو ان کی روزی ختم ہو سکتی ہے۔ ایسے میں اعجاز پاکستانی فلموں کا ہیرو گرفتار ہو گیا۔ جج نے اسے موت کی سزا نہیں دی۔ اتنا کہا کہ چونکہ تم ایک ملک کے امیر آدمی ہو اور تمہیں اس کی ضرورت نہیں تھی تو میں تمہاری سزا کو لمبا کرتا ہوں اور عمر قید کی سزا دیتا ہوں۔ اب ملکہ ترنم نور جہاں سے اگرچہ اعجاز الگ ہو چکے تھے مگر دونوں کے بطن سے بچے تو تھے۔ ایسے

میں بچوں کا خیال آتے ہی نور جہاں نے حاکم وقت کے دروازے پر دستک دی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم کو اپنے اختیار استعمال کرنے پڑے اور اعجاز صاحب آٹھ نو سال کی جیل کاٹ کر پاکستان آ گئے۔ اب میرے سامنے وہ لڑکے تھے جن کا قصور کسی بھی طرح سے میرے سامنے نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ بچے تھے یا لڑکے تھے جو چوری چکاری اور سٹورز سے سامان چراتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ اب یہ دو مختلف جرائم کے لڑکے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا۔ میں نے پہلے ڈرگز میں پکڑے گئے لڑکوں سے بات کی اور سمجھایا کہ کسی پر اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ وہ تمہارا باپ، بھائی اور کوئی رشتہ دار ہی نہ ہو۔ ہاں صرف ماں پر اعتبار کرنا کہ ماں بیٹے کے لئے غلط نہیں سوچ سکتی۔ مجھے اس کا جواب یہ ملا کہ میری ماں نے مجھے یہ سامان دیا تھا۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ کیا تمہاری ماں تمہارے باپ سے آزاد تھی۔ کیا تمہاری ماں نے تم سے رخصت ہوتے وقت یہ سامان خوشی سے دیا تھا۔ کیا معلوم اسے پتہ ہی نہ ہو کہ تمہارے باپ نے تمہاری زندگی کا سودا کر دیا ہے۔

وہ نہیں بولا۔ پھر ایک لڑکا جو ہاتھ کھڑا کر کے مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا، اسے میں نے پاس بلایا اور پوچھا کیا کہنا چاہتے ہو اور تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے اپنا نام اللہ وسایا بتایا۔ میں نے پوچھا کہاں کے ہو؟ ''خان گڑھ۔''

میں چونکا۔ یہ خان گڑھ کہاں ہوگا۔ پھر یاد آیا پاکستان کا جغرافیہ کبھی کسی نے پڑھا نہ دیکھا۔ میں نے ایسے ہی پوچھا ''خان گڑھ کس طرف ہے؟''

''وہ ناں مدرفر گڑھ کے پاس ہے۔''

اب میں سمجھ گیا کہ وہ مدرفر گڑھ دراصل مظفر گڑھ ہے اور اس سے آگے خان گڑھ ہے۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو، کون ہو تم؟''

''مجھے نہیں پتہ، میرے ماں باپ نے مجھے ایک آدمی کے حوالے کیا تھا۔ اس نے انہیں بہت سے پیسے دیئے تھے اور ماں نے کہا تھا اللہ کے حوالے بیٹا۔ تم دبئی جا رہے ہو، وہاں بہت کچھ کھانے کو ملے گا۔''

اب میں جان چکا تھا کہ اسے دبئی میں اونٹوں کی دوڑ کے لئے خریدا گیا تھا اور پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ تو میں نے پوچھا ''تم جہاز سے دبئی گئے تھے؟''

''ہاں میں وہاں گیا۔ میں ڈر گیا تھا مگر میرے ساتھ جہاز میں کئی اور بھی لڑکے میری طرح کے

تھے اس لئے میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ جہاز میں ہمیں کھانے کو دیا گیا جو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں تھا اسے کیسے کھاتے ہیں۔''

''دبئی میں کیا ہوا جلدی بتاؤ۔''

''وہاں ہم سب لڑکوں کو ایک جگہ رکھا گیا۔ وہ عربی لوگ تھے۔ وہ اونٹوں پر ہمیں باندھ دیتے تھے اور وہ اونٹ جب دوڑ لگاتے تھے، ہماری چیخیں نکل جاتی تھیں۔ اس سے اونٹ اور زیادہ دوڑتے تھے۔''

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ خلاء میں دیکھنے لگا۔ میں چونکہ ساری بات جانتا تھا اس سے پوچھا تو پھر تم یہاں کیسے آئے؟

وہ پھر سوچنے لگا۔ شاید وہ کہیں اٹکا ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ نہ قانون جانتا تھا نہ کچھ اور۔ وہ تو محض ایک معصوم سادہ سا بچہ تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ دبئی سے اسے منشیات میں کس نے استعمال کیا۔ میں نے بہت کریدا۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ اتنا کہا کہ ''ایک چاچا تھا؟''

''چاچا کون تھا، اصلی چاچا تھا۔''

''نہیں، وہ اُدھر ہمارے ہی علاقے کا تھا۔ وہ اُدھر اُن کا کوئی راکھا تھا۔''

اب میں جانتا تھا کہ اس علاقے میں راکھا کسے کہتے ہیں۔ لڑکا نہیں جانتا تھا۔ جو سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ یو اے ای کے شیخوں نے پاکستانی منیجران بچوں کے لئے رکھا تھا تا کہ وہ ان بچوں کو اپنی زبان میں دلاسا دے کر سنبھال سکے۔ اس منیجر نے اس بچے کے بیگ میں ہیروئن رکھوا دی اور اس کا تعلیمی ویزہ عرب شیخ کے پیسوں سے لگوا دیا اور وہ ایئر پورٹ پر پکڑا گیا۔ اب اس میں کیا عرب شیخ بھی ملوث تھا یا صرف پاکستانی منیجر اور ان کا نیٹ ورک کیا تھا؟ ظاہر ہے یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے اس لڑکے کو تسلی دی کہ جب تمہارا کیس لگے گا تو تم ترجمان کے طور پر میرا نام لینا جو میں نے اسے دے دیا۔

اب میں دیکھ رہا تھا کہ پیسہ کمانے کے طریقوں میں لوگ بچوں کو بھی داؤ پر لگا رہے تھے اور ڈالر پاؤنڈ کے ساتھ پیٹرو ڈالر نے پاکستان کی غربت کو Exploite کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا انڈیا، بنگلہ دیش، سری لنکا اور کچھ افریقی ممالک میں بھی ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر انگلینڈ میں ایشیائی لوگوں کے لئے کوئی کردار ادا کر جاؤں تو یہ ضیاء الحق کے مارشل لاء سے اچھا انتقام ہو گا اس لئے میں نے یہ کردار لے لیا اور اب میرا وہاں کا قیام با معنی ہو گیا۔

ان میں ایک لڑکا جو گورے رنگ کا تھا لیکن مجھے وہ گوری ماں اور پاکستانی باپ کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انگریزی میں اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ تم کس جرم میں آئے ہو۔ وہ نہیں بولا اور خلاء میں دیکھنے لگا۔ وہاں موجود جیل کے ایک ملازم نے جو انڈین تھا، مجھے بتایا کہ اس کا باپ پاکستان سے آیا اور اُس نے یہاں ایک گوری سے شادی کی۔ وہ گوری معمولی خدوخال کی تھی اور پھر اس پاکستانی سے یہ لڑکا ضرورت سے پہلے پیدا ہو گیا اور پاکستانی نے اسے مسلمان نام دے دیا اور اس گوری کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوششیں کرنے لگا۔ ظاہر ہے وہ کوئی عالم دین تو تھا نہیں کہ تبلیغ کی ساری ضرورتوں کو سمجھتا اس لئے وہ فوراً ہی تشدد پر اتر آتا تھا اور توقع رکھتا تھا کہ اس کی گوری بیوی صبح اٹھنے سے لے کر سونے تک اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرے جبکہ وہ خود اسلام کی اے بی سی سے واقف نہیں تھا۔ وہ صرف پاکستان میں اپنے خاندان کو یہ خوشخبری دینا چاہتا تھا کہ وہ برطانیہ میں ایک کافرہ کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن وہ ''کافرہ'' کم سے کم اس سے تو قائل نہیں ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شراب پی کر اسلام کی تبلیغ میں اندھا ہو کر اسے مارتا تھا۔ وہ مار کھالیتی تھی اور پولیس کو اطلاع اس لئے نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جس کا بیٹا ہے وہی پالے۔ جب بات حد سے گزر گئی تو وہ بیٹا چھوڑ کر چلی گئی۔ کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں گئی۔ یہ بچہ تین سال کا تھا جب وہ گئی تو باپ نے اسے کسی سکول میں داخل نہ کرایا اور اسے اپنے اپارٹمنٹ میں چھوڑ کے اپنی دکان پر چلا جاتا تھا۔ بچہ روتا تھا کھانے کے لئے۔ چونکہ کچن میں سب کچھ ہوتا تھا وہ بھوک مٹا لیتا تھا اور روتے روتے سو جاتا تھا۔ باپ شام کو آتا تھا اور شراب پی کر کھا پی کے سو جاتا تھا۔ اس طرح بچے نے جینا سیکھ لیا اور وہ اب زندہ رہنے کے اپنے طریقے سیکھ گیا تھا۔ کیونکہ بچوں میں بہت جلدی اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے اسے معلوم ہو گیا کہ ٹیلی ویژن کیسے چلتا ہے۔

وہ سارا دن ٹی وی لگا کے دیکھتا رہتا تھا۔ باپ شام کے بعد گھر آتا تھا اور بچہ سہا ہوا کسی کونے میں پڑا ہوتا تھا۔ وہ شراب پیتا اور کھانا کھا کے سو جاتا تھا۔ بچہ اس طرح بڑا ہو رہا تھا۔ اس نے گھر سے باہر کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ باتھ روم کا استعمال سمجھ گیا تھا۔ باپ کا تعلق اس سے بس اتنا تھا کہ ایک اس کے جسم سے نکلا ہوا جرثومہ یہاں اس کی مجبوری ہے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ پاکستان اپنے خاندان کو پاؤنڈ بھیجنا تھا اس لئے وہ مسلسل مشقت کر رہا تھا اور یہ بچہ اس کی ترجیحات میں بالکل نہیں تھا۔ وہ گوری سے انتقام کیا لیتا، اس بچے سے اس کے دل میں کسی بھی طرح سے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے تھے بلکہ کسی بھی انسان کے

لئے جذبات اس کے پاس نہیں تھے۔ ایسے قصے پاکستان میں روز ہوتے ہیں کہ باپ نے یاماں نے بچوں کو دریا میں پھینک دیا یا زہر دے کے مار دیا وغیرہ۔ وہ یہ تو نہ کر سکا۔ جب اس نے دیکھا بچہ خود سے اپنے کام کر رہا ہے، فطرت نے اسے سکھا دیا ہے تو وہ بیٹے سے شراب پینے کے وقت دو چار باتیں کر لیتا تھا اور کچن میں جو کچھ وہ لے کر آتا، پڑا ہوا ملتا جو بچہ کھا لیتا تھا۔ پھر بچے نے ڈبل روٹی، دودھ اور فروٹ کو سمجھ لیا تھا کہ پیٹ کیسے بھرنا ہے۔ ٹیلی ویژن کا ریموٹ اس کی کل کائنات تھی جہاں بچوں کے کارٹون چینل تھے، فلمیں تھیں، ڈاکیومنٹری تھی، کرائم تھرلر تھے۔ وہ بچہ سکول کی بجائے ٹیلی ویژن چینل کے سکول سے پڑھنے لگا اور یہ سکول دوسرے سکول سے زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ سب کچھ چھوٹی عمر میں ہی سیکھ گیا۔ باپ نے کسی بھی طرح سے اس سے کوئی رشتہ استوار نہ کیا۔ جب باپ آتا تو وہ چھپ جاتا۔ باپ یہ تسلی کر لیتا کہ وہ موجود ہے اور پھر وہ یہ بھی دیکھ لیتا کہ اس نے خوراک لے لی ہے۔ یہ بچہ ایک جانور کے بچے کی طرح پل رہا تھا جیسے کوئی گھر کا کتا یا بلی ہوتے ہیں کہ وہ گھر میں رہتے ہیں اور خوراک مل جاتی ہے لیکن ان کو مالکوں کی محبت تو ملتی رہتی ہے۔ اس لڑکے کو یہ بھی نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایک روبوٹ بن چکا تھا یا جنگل میں پلنے والا جنگل بک کا موگلی تھا جسے رڈیارڈ کپلنگ نے لکھا تھا یا وہ ٹارزن تھا جو جنگل میں پلتا ہے۔ اب ایسے کردار اگر حقیقت میں موجود ہوں تو پھر وہ تو قیامت ڈھا سکتے ہیں۔ سو اس لڑکے نے قیامت ڈھا دی۔ وہ ایسے کہ وہ اسی ماحول میں قیدی کی حیثیت سے دو سال تک رہا اور پھر اس نے ٹیلی ویژن میں جو دیکھا اس پر عمل کر دیا۔

اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کو قتل کیسے کرتے ہیں، پستول سے۔ تو وہ تو اسے حاصل نہیں تھی۔ اس لڑکے نے صرف چاقو یا چھری سے قتل فلموں میں دیکھا اور کچن سے ایک چھری کو تلاش کر لیا اور پورا سکرپٹ فطرت نے جو اسے سمجھایا وہ اس نے بنا لیا۔ جب ایک رات اس کا باپ پوری بوتل خالی کر گیا اور جو کھانا وہ باہر سے لایا تھا وہ اس نے کھانے کی کوشش کی مگر دن بھر کا تھکا ہارا جب پوری بوتل اندر لے جائے گا تو پھر کھانا کھاتے ہی راستے میں ڈھیر ہو گیا۔ اسی جگہ صوفے کے نیچے قالین پر ڈھیر ہو گیا اور جلد ہی اس کے خوفناک خراٹے گونجنے لگے۔ اس لڑکے نے کچن کی سب سے تیز اور بڑی چھری اٹھائی اور جیسا اس نے ٹی وی میں دیکھا تھا، دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے سیدھا سینے پر وار کیا۔ جسم کے نرم حصے پر ایسا وار ہوا کہ آدھی چھری اندر ہو گئی۔ خون کا فوارہ اُبل آیا۔ پوری چھری وہ نیچے تک نہ لے جا سکا۔ اب اس نے چھری نکال کر اسی جگہ دوسرا وار کیا۔ اب چھری سیدھی نیچے تک چلی گئی۔ نشہ اتنا گہرا تھا کہ وہ تڑپا بہت مگر وہ ہوش میں نہ آ سکا اور پھر اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا اور خون کا تالاب لگ گیا۔ بچہ بالکل نہیں ڈرا۔ وہ صبح کا انتظار کرنے

لگا اور پھر دروازہ کھول کے باہر آیا اور جو بھی راستے میں ملا اسے بتایا ''میں نے اسے مار دیا ہے۔'' اسے معلوم نہیں تھا اس نے جرم کیا ہے یا اس کو کیا کرنا چاہئے۔ وہ سڑک پر بولتا رہا کہ کوئی سن لے۔ کسی پاکستانی نے اس کی بات سن لی جو اُدھر سے گزر رہا تھا کہ یہ گھر ایشیائی باشندوں کے علاقے میں تھا۔ اس کے بعد اس قتل کی اطلاع پولیس میں ہوئی اور یہ لڑکا گرفتار ہو کر وہاں آیا۔

میں نے اس سے بات کی۔ وہ نہیں بولتا تھا۔ بس یہ کہا ''میں نے مار دیا۔'' باقی کہانی پولیس نے خود سنبھال لی۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا وہ کون ہے؟ وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ ایک جیل سے دوسری جیل میں آ گیا تھا جہاں اس کی تعلیم کا انتظام بھی تھا اور اسے انسانوں کا قرب بھی حاصل تھا۔ اب یہ اس کا گھر تھا۔ میں نے جیل کے عملے سے کہا جب عدالت میں اس کے ترجمان کی ضرورت ہو، مجھے بلا لیا جائے۔

اب میں ایک دن عورتوں کی جیل میں گیا۔ میں نے لیکچر دیا جو میرا کام تھا اور پھر میں نے دیکھا زیادہ تر بائیس سال سے چالیس سال تک کی عورتیں وہاں تھیں اور ان کی اتنی ہی کہانیاں تھیں جتنی کہ وہ عورتیں وہاں موجود تھیں۔ میرے لئے پاکستان اور برطانیہ کے اس نئے رشتے کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور میں تاریخ کے جبر کو سمجھ رہا تھا کہ جو ہمارا حاکم تھا اس نے اب ایک نیا جال بچھایا اور پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں کے باشندے روزی کی تلاش میں یہاں آنے لگے۔ پاؤنڈ اور ڈالر کی حاکمیت کے ساتھ دینار اور درھم کی کرنسی نے پاکستان کو غلام بنا لیا مگر کیسے بنا لیا، میں نے غور کیا تو یہ وہ معاشرہ تھا جو ہندوستان کی ریاستوں، راجواڑوں کی رعایا اور پھر ان ریاستوں کے مشیروں، عمالوں، کارندوں، منیجروں اور کارگزاروں کی اولادوں کے ساتھ ان کے گماشتوں تک کو اس بیرونی کرنسی کے لالچ میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہی سکہ رائج الوقت ٹھہرا۔ پاکستان بننے کے بعد صرف امراء اور اشرافیہ کی اولادیں تعلیم کے لئے برطانیہ اور یورپ آتی جاتی رہیں۔ پھر ایک کاروباری طبقہ تجارت کی غرض سے آتا جاتا رہا لیکن بہت کم ایسے ہوں گے جنہوں نے وہاں مستقل آباد ہونے کا سوچا تھا لیکن ایوب خان کے وقت ایک بنیادی تبدیلی برطانیہ اور منقسم ہندوستان کے تینوں حصوں میں یہ آئی کہ روزگار کی تلاش کی ضرورت پیش آئی، جب کاشت کاروں پر تجارت نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ دولت تاجروں کی مٹھیاں گرم کرنے لگی اور وہ زمینوں کی تجارت میں مصروف ہونے لگے۔ کاشت کار غریب ہونے لگے۔ زمینیں ارزاں فروخت کرنے لگے۔ ملک کی معیشت کو مصنوعی دولت نے ایسا تڑکا لگا دیا کہ تاجروں نے مافیاؤں کو جنم دینے کا کام شروع کر دیا۔ ایسے میں ایوب خان نے جو ڈیم تعمیر کیے اس نے جن دیہاتوں اور علاقوں کو متاثر کیا، انہیں آباد کرنے کے لئے ایوب خان نے ملکہ برطانیہ

کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کئی ہزار ویزوں کا بندوبست ہوا۔ میر پور اور ملحقہ علاقوں سے نقل مکانی برطانیہ کو ہونے لگی۔ برطانیہ کو اس وقت مزدوروں اور کارکنوں کی بہت ضرورت تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک سنبھل چکا تھا۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کارکنوں کی ضرورت تھی جو گورے نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں ریلوے پولیس، کارخانوں، ڈاک خانوں، ہوائی اڈوں، جیلوں اور سڑکوں کے شعبوں سے لے کر فلاحِ عامہ کے شعبوں تک بے شمار نوکریاں موجود تھیں۔ ایسے میں انڈیا اور پاکستان سے نقل مکانی شروع ہوئی۔ زیادہ پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب سے، آزاد کشمیر سے اور کسی حد تک انڈیا کے کچھ علاقوں سے نقل مکانی شروع ہوئی۔ پھر جب بنگلہ دیش بن گیا تو وہاں سے بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر ایک ایسا معاشرہ وجود میں آنے لگا جس میں مقامی طور پر برطانیہ میں شادیاں کر کے آنے والوں نے یہاں بھی ایک آدھ شادی رچالی ہوئی تھی۔ یہ مسائل بڑھنے لگے اور ضیاء الحق کے اس وقت تک جعلی ویزوں، جعلی شادیوں کا کاروبار بھی شروع ہو چکا تھا۔ اسی میں ڈرگز کی نقل و حرکت نے نیا گل کھلایا۔ مذہبی فرقہ بندیوں نے ایک نیا چاند چڑھایا۔ پہلے احمدی غیر مسلم قرار پائے پھر مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں تفرقہ ڈالا گیا یا معلوم نہیں یہ بیج کس نے بویا۔ پھر آخر میں لسانی تفرقے کا بیج ضیاء الحق ہی کے زمانے میں کراچی میں بویا گیا جسے درخت بننا تھا اور وہ بنا...... اس درخت کی جڑوں میں لاکھوں انسانوں کا خون اسی طرح ڈالا گیا جس طرح ہندوستان کی تقسیم کے وقت سرحدوں کو مضبوط کرنے کے لئے ان سرحدوں میں ڈالا گیا۔

یہ جو جیل میں عورتیں میرے سامنے بیٹھی تھیں، وہ سب اسی ہجرت در ہجرت یا دوسری تیسری نقل مکانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جرائم کی پاداش میں سزا کاٹ رہی تھیں۔ ان جرائم میں منشیات، قتل، غیر قانونی حرکات، نفسیاتی سطح کی پیچیدگیوں میں ملوث جرائم جیسے کہ شیزو فرینیا میں کس طرح کے جرائم ہوتے ہیں۔

میں نے ان سب کے ساتھ وقت گزارا۔ کئی عورتوں نے تو مجھے بے عزت بھی کیا کہ تم کون ہو؟ تمہیں بھیجا گیا ہے کہ ہمیں جیل میں زہر دے کر مار دو۔ میں نہ تو کوئی نفسیات دان تھا نہ کوئی اصلاح پسند۔ میں تو بس ایک شاعر اور استاد تھا اس لئے میں نے اپنا اندازہ خود لگایا اور میں نے ان سے مکالمہ شروع کیا۔

ایک عورت میرے سامنے آئی اور اس نے کہا کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ یہ تو وہی تھی جو میرے اخبار کے دفتر گھر سے نکل کے آئی تھی اپنی کہانی دینے، جسے میں نے شائع کیا تھا۔ "ہاں تم وہی ہو جس کے اصلی نام سے نہیں دوسرے نام سے میں نے وہ کہانی جو تم پر گزری تھی،

شائع کی تھی۔اب اس کے بعد کی کہانی بتادو۔"

"میں چند دن ہوئے یہاں آئی ہوں، میں نے اسے مار دیا......"

"کسے؟ گوری کو یا خاوند کو۔"

"خاوند کو...... گوری بھاگ گئی۔"

"قتل کیسے کیا؟"

"اس رات دونوں نے بہت شراب پی اور پھر وہ گوری کو چوم چاٹ کے اس کے کپڑے نوچنے لگا۔اس نے منع کر دیا کہ اگر کچھ کرنا ہے تو اپنی پاکستانی بیوی کے ساتھ کرو۔ میں بھی دیکھوں گی۔"

"تم کہاں تھیں۔کیا تم یہ سب دیکھ رہی تھیں۔"

"ایسا اکثر ہوتا تھا۔ میں آوازیں سن رہی تھی۔ کچن کے سٹول پر خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر سیدھا میرے پیچھے آیا اور مجھے پکڑ کے بیڈ روم لے جانے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اسے اپنا ریپ نہیں کرنے دوں گی۔ وہ لڑکھڑایا اور میرے اوپر گرا۔ پھر اس نے میرے کپڑے نوچنے اور اتارنے کی کوشش شروع کر دی۔ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے مجھے ننگی گالیاں دیں اور بولتا رہا کہ حرام زادی، تجھے یہاں تہجد پڑھنے کے لئے نہیں لایا۔ کپڑے اتار۔ تجھے روٹیاں پکانے کے لئے نہیں لایا۔ وہ یہ سب بول رہا تھا۔ چونکہ شدید نشے میں تھا اس لئے اس کے ہاتھ اِدھر اُدھر پڑ رہے تھے۔ ایسے میں گوری بولی "Have a sex with your legal wife you son of a bitch" جب مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تو وہاں ایک بڑی چھری میرے ہاتھ میں آ گئی اور میں نے اس کے سینے میں سیدھی اتار دی۔ خون کا فوارہ اُبلا اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ گوری نے چیخ ماری اور فلیٹ سے نکل گئی۔ اگر وہ رُکتی تو میں نے اسے بھی مار دینا تھا۔ میرے اندر معلوم نہیں کہاں سے طاقت آ گئی تھی۔ میں نے اسے مارنے کے بعد اپنے کپڑے بدلے اور اس کے گندے خون کو غسل خانے میں جسم سے صاف کیا اور میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا پولیس جلد آ جائے گی۔ پولیس آ گئی کہ میں نے باہر کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ چونکہ پورے لندن میں میرا کوئی نہیں تھا، میں یہاں جیل ہی میں آنا چاہتی تھی اس لئے آ گئی۔" اس نے اپنی پوری کہانی بتا دی تھی۔ میں نے اُسے کہا جب بھی تمہیں عدالت میں ترجمان کی ضرورت ہو میرا نام دے دینا کیونکہ میں ان کے پینل پر ہوں۔ اور میں چلا گیا۔

میرے سامنے پاکستانی معاشرے میں راتوں رات امیر ہونے کی خواہش نے کئی سوالات کو جنم

دے دیا کہ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کیا اس میں بھٹو صاحب کے سات سالوں کا بھی کوئی عمل دخل ہے یا یہ اسی دور میں ہی جنم لینے والی لہر ہے۔ بہت سوچا، پھر میں نے بی بی سی کو روزانہ سننے اور مغربی اخبارات کے تجزیے پڑھنے کے بعد جن باتوں کو سنجیدگی سے لیا وہ درج ذیل تھیں۔ ضیاء الحق نے مذہبی جماعتوں کو پہلی بار کاروبار کا راستہ دکھا دیا۔ اس میں پہلے تو اس نے کاغذ کے پرمٹ کو کوٹہ بنایا اور تمام مذہبی جماعتوں سے کہا کہ کاغذ کا کوٹہ تب ملے گا جب کوئی اخبار، رسالہ یا پرچہ نکالو گے تو ایسے میں بے شمار ڈمی اور کم اشاعت والے یہ سب رسالے اور پرچے شروع ہو گئے اور سب کے سب ملک کو پیچھے کی جانب دھکیلنے کے لئے سرگرم ہو گئے۔ سب نے ملک کے بچوں اور بڑوں کو ضیاء الحق کی تعلیمات دینے کے لئے ڈمی اور کچے پکے رسالے اور اخبار جاری کر دیئے۔ ضیاء الحق نے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ ایک تو انہیں کاغذ کا کوٹہ ملنے لگا جسے وہ مہنگے داموں اردو بازار میں بیچنے لگے، دوسرا انہیں ڈمی اور معمولی اشاعت کے اخباروں کے لئے سرکاری اشتہار ملنے لگے۔ یہ محض ایک راستہ تھا اور کئی راستوں سے مذہبی تنظیموں نے جڑیں پکڑیں اور طاقت ور درخت بن گئیں۔ مدرسوں کے نام پر بے شمار فنڈز اور عطیات کا راستہ ضیاء الحق نے نکالا اور پھر مذہب کے نام پر تجارت کا ایک دروازہ کھل گیا جس نے آنے والی نسلوں اور معاشرے کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

اس کے ساتھ ہی منشیات کی تجارت نے کئی طرح کے مافیاؤں کو جنم دیا اور اس طرح لندن کی جیلوں میں جتنی عورتیں جرائم میں ملوث تھیں، ان سب کی شاخیں ضیاء الحق کے مارشل لاء سے جا کر مل رہی تھیں۔ یہ تھے امیر المومنین جنھوں نے ملک ہی نہیں، انسانوں کو بھی کولھو میں پلوا دیا۔ بیرون ملک پاکستانی پاسپورٹ کو مشکوک بنا دیا۔ پاکستانی دنیا کے ہر حصے میں الگ قطار میں کھڑے کرا دیئے۔ ان کی جامہ تلاشی الگ طریقے سے ہونے لگی تھی اور خود امیر المومنین کو آم کی پیٹی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن پاکستانیوں کو معافی ابھی تک نہیں ملی۔ پاکستان آج بھی قطار میں کھڑے ہو کر جامہ تلاشی کراتے ہیں۔

اب جو میں نے ان عورتوں سے ان کے جرائم پر بات شروع کی تو ایک بیس سال کی لڑکی سامنے آئی اور وہ بہت غصے میں تھی۔

''تم کون ہو؟ جو ہمارے جرائم دیکھنے آئے ہو؟''

میں نے کہا'' دیکھو یہ برطانیہ کی حکومت کا اصول ہے کہ مجرم کو اپنے دفاع کا موقع دیا جائے اور یہ موقع اگر ان کے اپنے ملک اور اپنی زبان کا آدمی دے سکے تو وہ انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہے۔

میں تو اپنے ملک پاکستان میں مجرم تھا اور مجھے وہاں سے نکالا گیا۔ میں اپنے ملک میں اب بھی مجرم ہوں تو پھر میں یہاں حکومت کی طرف سے ایک روزگار پر لگایا گیا ہوں۔ کیونکہ ایک سیاسی پناہ گزین کے طور پر میں انگریز حکومت کی ذمہ داری ہوں، مجھے آپ کی ترجمانی کرنی ہے۔ اگر کچھ بھی کہنا ہے تو میں سننے کے لئے تیار ہوں۔''

اس پر وہ سامنے آئی ''تم ہو کون؟ نیلسن منڈیلا ہو، چی گویرا ہو، مارٹن لوتھر کنگ ہو، مارکس ہو، ہوچی منہ ہو، لینن ہو، ماؤزے تنگ ہو، کیا بیچتے ہو؟''

''میں نے کیا بیچنا ہے، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، ایک معمولی سا شاعر ہوں۔ ویسے ہوچی منہ اور ماؤزے تنگ بھی شاعر تھے مگر میں وہ نہیں ہوں، معمولی سا استاد تھا، اب نہیں ہوں۔''

''شاعری تو میں بھی کرتی تھی۔ اپنے کالج کی اچھی شاعرہ تھی۔ نام سنا ہوگا لاہور کالج فار ویمن۔''

''ہاں میری بیوی وہاں کی پڑھی ہوئی ہے۔'' اب میں نے اسے اپنے کونسلنگ کے حربے سے قریب لانے کی کوشش کی۔

''احمد فراز کی شاعری ''جاناں جاناں'' کی کتاب میں مور کے پر رکھے تھے، پھول رکھے تھے جو کتاب کا حصہ بن گئے تھے۔ خیالوں میں احمد فراز سے محبت کرتی تھی۔ ناصر کاظمی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کی کتاب ''برگِ نے'' خریدی تھی۔ احمد فراز کی غزل کی طرح ناصر کی غزل بھی ریڈیو پر سن لی تھی۔ ''دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا'' مشاعرے جو کالجوں میں ہوتے تھے، میں جاتی تھی۔ انعام بھی لے آتی تھی۔ کچھ سٹوڈنٹس کہتے تھے تجھے انعام مردجہ شکل کا دیتے ہیں۔ لعنت میری شکل پر۔ دیکھو اب کیا ہوگئی ہوں، تب کیا تھی۔ شکل ہی میری سب سے بڑی دشمن بن گئی۔''

اب میں نے ذرا اپنائیت کے ساتھ اس کی کہانی سننے کے لئے اپنا حربہ آزمایا۔

''آپ نے جن شاعروں کا نام لیا ہے وہ میرے بھی پسندیدہ شاعر ہیں۔''

''ہاں مگر وہ میرے تو کسی کام نہ آئے۔''

''ہاں مگر آپ کے ساتھ ہوا کیا؟''

''سینے پر پتھر کی سل رکھی ہے۔ اسے ہٹاؤں گی تو کچھ کہہ پاؤں گی۔''

''اگر کچھ کوشش میں کروں تو وہ سل ہٹائی جا سکتی ہے۔''

اس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ شاید اندازہ لگا رہی تھی کہ میں واقعی اس اعتبار کا ہوں کہ جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کے رکھ دے۔ پھر اس نے کہا:

''مجھے بے شک یہ موت کی سزا دے دیں، الیکٹرک چیئر پر بٹھا کے یا زہر کا انجکشن لگا کے، مجھے فرق نہیں پڑتا لیکن اگر کبھی میں اس جیل سے سزا کاٹ کے باہر آ گئی تو۔''

وہ رُک گئی۔ میں چاہتا تھا وہ بولے ''ہاں ہاں تو پھر آپ کیا کریں گی۔ میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔''

''میں باہر آ کے ممبر پارلیمنٹ بنوں گی۔ کوئی مجھے ہرا نہیں سکے گا۔ میں لاہور کالج آف ویمن کی ڈبیٹر اور شاعرہ ہوں۔ یاد رکھنا۔''

''ہاں ہاں۔ اب جو بات آپ نے کی ہے مجھے یہ سننی ہے۔ آپ کیا بنیں گی۔''

''کیا تم پاگل ہو یا بہرے ہو، میں نے جو کہا وہ کہا۔''

''ہاں ہاں میں سمجھ گیا ہوں۔ تو پھر اپنی دیگ کا ڈھکن اٹھاؤ یا سینہ سے پتھر کی سل سرکاؤ۔''

''ایک لڑکی بی اے کے فائنل ایئر میں ہو اور اپنے کالج کی لاڈلی ہو اور اس کا رشتہ آ جائے برطانیہ سے اور سن ہو 1979ء تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے میں اس بات کو کتنا بڑا معجزہ سمجھا جائے گا جبکہ یہ سب ایک دھوکہ اور اس وقت کے پاکستانی معاشرے پر برطانیہ کی حکمرانی کی ایک اور توسیع قرار پائے گا کہ جو پاکستانی برطانیہ گئے اور انہوں نے برطانوی شہریت لے لی تو پاکستانیوں کے نزدیک ان کی وہی حیثیت قرار پائی جو وائسرائے کی سمجھی جاتی تھی۔ چاہے وہ پاکستانی یا میرپور یے وہاں جا کر بھنگی، نائی، باورچی، مالشیے یا دھوبی اور سبزی فروش ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ اگرچہ یہ سب معزز پیشے ہیں لیکن ہمارے پاکستانیوں نے ان پیشوں کی بھی ہتک کی۔ چونکہ جو یہاں سے روزگار کی تلاش میں وہاں پہنچے تو ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں تھا لیکن اصل قصور تو ان پاکستانی گھرانوں کا تھا جنہوں نے انہیں شہزادہ چارلس سمجھ کر اپنی لاہور کالج کی بیٹی کو آنکھیں بند کر کے جہاز پر چڑھا دیا۔''

''آپ بی اے میں تھیں اور آپ کی شادی لندن میں کسی پاکستانی سے کر دی گئی۔ کیا آپ نے اسے دیکھا تھا یا ملی تھیں؟''

''ابھی بھی آپ کو معلوم نہیں ہوا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

''میں بات ذرا باریکی سے سمجھنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا میری ترجمانی کرے گا۔ سنو! میرے گھر والوں تک یہ رشتہ آیا تو انہوں نے بالکل نہیں سوچا کہ لڑکا کون ہے، کیسا مزاج رکھتا ہے، کیا تعلیم ہے، کہاں رہتا ہے، اس کی تربیت کس نے کی ہے۔ بس یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ وہاں کوئی بڑا بزنس مین بن گیا ہے اور سات سمندروں کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اپنے سابق آقاؤں کے برابر رتبہ پا چکا ہے۔''

''کیا آپ بھی یہی خواب لے کر یہاں اُتری تھیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ میرا کوئی خواب اگر تھا تو میری تعلیم اور پھر ایک کامیاب رائٹر اور شاعر بننا تھا۔ مجھے ایک تصویر دکھا دی گئی جو میں بھول ہی گئی کہ وہ کیسا ہوگا۔ بس فون پہ نکاح اور پھر شادی کے سازوسامان کے ساتھ ہیتھرو ایئرپورٹ شادی کے جوڑے میں جا کے اُتر گئی۔ ایسے نظارے مجھے بعد میں کسی نے بتائے ہر دوسری یا تیسری فلائٹ میں دیکھنے کو ملتے تھے چاہے وہ انڈیا سے آرہی ہوتی تھی یا پاکستان سے۔''

''تو پھر تم اس جیل تک عجلۂ عروسی سے کیسی پہنچیں۔''

''وہ معمولی پڑھا لکھا تھا۔''

''تھا...... مطلب مر چکا ہے۔''

''وہ نہ مرتا تو میں مر جاتی۔ دونوں میں سے ایک کو مرنا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا۔''

''وہ شروع میں مجھے دھوکہ دیتا رہا کہ وہ کسی انگریز کی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ بارہ بجے جاتا اور رات بارہ بجے آتا۔ مجھے یہ سمجھ نہ آئی کہ یہ کیسا دفتر ہے۔ اس نے مجھے چکر دینے کے لئے جھوٹ بولا کہ یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر ہے اور وہ اس کا منیجر ہے۔ چونکہ اوورسیز اس کمپنی کے مختلف ملکوں میں کاروباری سلسلے ہیں اس لئے ٹائم کا فرق ہونے کی وجہ سے مجھے رات بارہ بجے تک کام کرنا ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی دفتری ملازمت کے حوالے سے پہلو موجود نہیں تھا۔ اس کی گفتگو کل ملا کے دس بارہ لفظوں کی تھی۔ وہ کچھ اور نہیں جانتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ وہ الفاظ کیا تھے، سنو گے؟''

''ہاں ہاں پلیز۔''

''اج کی پکائیں گی، تیرے لئی کی لے آواں، گھر گل کریں گی، میں باہروں تالا لا کے جاواں گا، اتھے کالے بہت نیں، تھکیا آیا آں، میں تیری لینی اے ستھن لاہ دے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں۔ کتنے دن تم نے ان جملوں کے ساتھ گزارا کیا؟''

''زیادہ دن نہیں لگے کہ وہ مجھ پر کھل گیا۔ وہ ایک گورے کے پب میں ملازم تھا۔ اس کے کچن میں برتن دھونے، سبزی کاٹنے اور گوشت صاف کر کے گورے شیف کی مدد کرنے کے لئے تھا۔ کبھی کبھی شراب کے آرڈر بھی لیتا تھا۔''

''وہ آپ پر کیسے کھلا؟''

''وہ ایسے کہ ایک رات اُس پب کی وردی میں شراب پی کر آ گیا اور ساتھ میں دو گورے بھی تھے۔ میں سوئی ہوئی تھی۔ مجھے اٹھایا اور میرے کپڑے اتارنے لگا۔ میں نے منع کیا تو مجھے تھپڑ مارے اور کہا ''حرام زادی، تجھے یو کے کا پاسپورٹ مفت میں نہیں ملے گا۔ تجھے پوری قیمت دینی ہوگی۔ چل گشتی ننگی ہو جا۔ پہلے میں لوں گا پھر میرے پب کا مالک اور دوست لے گا۔ یہ لندن ہے۔''

''تو پھر...... اس کا قتل کیسے ہوا؟''

''اتنی جلدی نہیں ہوا۔ اس نے مجھے ریپ کیا اور ریپ کرایا پھر وہ مجھے تالے میں بند کر کے جاتا تھا اور ہر شام اس نے گوروں کی لائنیں لگا دیں۔ وہ حرامی پاؤنڈ کمانے لگا۔ اس نے ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ فون کا نکاح کیا ہے، ایک ہوا میں بولا لفظ۔ تم نہ تو میری بیوی ہو نہ ہی تمہارا مجھ پر حق ہے۔ میں تمہیں برطانیہ کی شہریت دلوا رہا ہوں یہ اس کی قیمت ہے۔ اس پاسپورٹ کے بعد تم آزاد ہو کر جہاں چاہو دھندا کرنا۔ یہ میں تمہیں دھندے کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ لاکھوں پاؤنڈ کمانا۔''

''میں ساری بات سمجھ چکا ہوں۔''

''نہیں تم کچھ نہیں سمجھے۔ گوروں کے بعد اس نے کالوں کو لانا شروع کر دیا اور یہ کاروبار اس نے پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں تک پھیلا دیا۔ میں کمرے میں پڑی رہتی تھی اور وہ مجھے کھانا دیتا تھا جو مجھے کھانا ہوتا تھا۔ میں ایک جانور بن چکی تھی اور پھر میں واقعی جانور بن گئی۔ جب میں نے ایک موقع لیا کہ جب غلطی سے دروازہ کھلا رہ گیا تو پھر میں نے کچن سے تمام چھریاں اپنے پاس رکھ لیں کہ اب مجھے یا مرنا ہے یا مارنا ہے۔''

''اب میں ساری بات سمجھ چکا ہوں۔ میں نے کچھ اور نہ پوچھا۔ صرف اتنا کہا ''میں عدالت میں تمہاری ترجمانی کر سکتا ہوں، تم چاہو تو عدالت سے یہ خواہش کر سکتی ہو کہ تمہیں Interpreter کی ضرورت ہے اور میرا نام لے سکتی ہو۔ میں تمہیں ممبر آف پارلیمنٹ بننے کی کوشش میں کسی کام آ سکتا ہوں؟''

''میں جانور بن چکی تھی۔ میں نے تین جانوروں کو مار دیا۔ بس یہی کر سکتی تھی لیکن اب میں جانور سے دوبارہ انسان بن رہی ہوں۔''

میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے اب جیلوں میں پاکستانی قیدیوں سے ملنا اچھا لگنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا کیتھارسس انہی کے کیتھارسس میں شامل ہو رہا ہے۔ ایک اور لڑکی دیہاتی لگتی تھی مگر خوبصورت خدوخال، گورا رنگ، جیل میں بھی اسی طرح اُجلا ہی تھا کہ سامنے آ گئی۔ میں نے پوچھا ''کہاں سے آئی ہو؟''

نہیں بولی۔ پھر آہستہ سے بولی ''ہڈالی پنڈ۔''

میں نے کہیں ہڈالی کا نام پڑھ رکھا تھا۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ''یہ پنڈ کس شہر کے ساتھ ہے؟''

''اے پنڈ سرگودھا نال اے۔ جتھے ڈاکو چراغ بالی رہنداسی۔''

اب مجھے فلم چراغ بالی بھی یاد آ گئی اور مجھے خشونت سنگھ بھی یاد آ گیا جو اس گاؤں سے تھا۔ اسے خشونت کا کیا پتہ ہوتا۔ وہ ڈاکوؤں میں پلی بڑھی تھی اور اسے ایک ڈاکو ہی نے یہاں پہنچایا تھا۔ تو میں نے پوچھا اردو میں بات کر سکتی ہو۔'' اس نے کہا:

''ہاں میں نے ایف تک پڑھا ہے۔''

''یہاں کیسے پہنچیں؟''

''میرا چاچا کا بیٹا بچپن میں ساتھ ہی کے پنڈ میں تھا، آنا جانا، اور گھر میں آنکھ بھی اس عمر میں لڑا لیتا تھا مگر میں سب سے الگ رہتی تھی۔ ایک دن پتہ چلا اس کو ہمارے ایک اور رشتہ دار نے ادھر لندن بلا لیا ہے۔ زمین کا کافی ٹوٹا اس نے بیچا اور اُس رشتہ دار کو رقم ادا کر کے اِدھر لندن پہنچ گیا۔ پھر جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں اپنے پنڈ کی پہلی لڑکی تھی جو کالج جا رہی تھی کہ میرے والد کو احساس تھا کہ لڑکی اگر میٹرک میں سکول میں اول آئی ہے تو اس کی خواہش پوری کرنی چاہئے۔''

''تو پھر تم سرگودھا آ گئیں۔''

''نہیں وہاں قریب میں جوہر آباد کا لڑکیوں کا کالج تھا۔ میں وہاں سے پڑھی ہوں اور جب گھر میں لندن سے رشتہ اور وہ بھی چچا کے بیٹے کا آیا تو سب کی باچھیں کھل گئیں کہ پنڈ کا پہلا لندن جانے والا رشتہ مانگ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے لندن جانے والا ہر پاکستانی گوروں کی طرح خوبصورت علاقوں میں بڑے

سے کا میج میں اپنے پالتو کتوں کے ساتھ سوٹ بوٹ پہنے، سر پر ہیٹ لگائے دریائے ٹیمز کے کنارے ٹہلتا رہتا ہوگا اور گوروں کے معاشرے میں شیر وشکر ہو کر خوب عیش کی زندگی گزار رہا ہوگا۔ اس وقت کسی کو ہمارے جیسے دیہاتوں میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ پاکستانی یہاں ولایت میں کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے یہاں جو بھی آ گیا وہ پاؤنڈ اور ڈالروں کے کھیت میں فصل اُگا کر پاؤنڈ اور ڈالروں کا پھل اُٹھاتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں، آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوتی ہے کہ کچھ اور سوچنے کا موقع نہیں ہوتا۔''

''ایسے میں سب نے ہاں کر دی اور مٹھائیاں، کپڑے اور سوغاتیں گھر میں آنے لگیں اور جب ایف اے کے امتحان ہو گئے تو میری شادی کی تاریخ پکی ہو گئی۔ میرے چاچا کا لڑکا خود آ گیا اور یہاں بارات سے پہلے زیوات، کپڑے، جوتے اور دلہن کا دوسرا سامان بھی شادی سے صرف ایک دن پہلے پہنچا دیا۔ جب زیورات کو سب نے دیکھا تو حیران رہ گئے کہ وہ بہت ہی بھاری تھے۔ کٹھ مالا سات لڑیوں میں اتنا بھاری کہ جیسے لوہے کا طوق کسی کے گلے میں ڈال دیں۔ سب نے کہا یہ خاص طور پر بنوایا ہے کہ زیادہ سونا لندن تم اپنے ساتھ لے جا سکو۔ چونکہ وہ بہت پیسے والا ہے اس لئے وہ تمہیں بہت سا سونا دینا چاہتا ہے۔ ہاتھوں کے آٹھ آٹھ موٹے کڑے، جھمکے، پازیبیں سب اتنے بھاری کہ میرے لئے ان کو پہن کے چلنا مشکل ہو گیا جیسے کسی قیدی کو ہتھکڑیاں، بیڑیاں اور زنجیریں ڈال دی گئی ہوں۔ گھر میں سب خوش کہ میرا ہونے والا خاوند اتنا امیر ہے کہ اس نے بیوی کو سونے میں تول دیا ہے۔ جوتا بھی پہنا تو وہ بھی مجھے بھاری لگا۔ سینڈل تھا۔ سب نے کہا سینڈل ہوتا ہی بھاری ہے اور شادی میں اس لئے پہنا جاتا ہے کہ دلہن کو جم کر چلنے میں آسانی ہو۔ کپڑے بھی بہت وزنی تھے۔ ان پر زردوزی کا کام کیا گیا تھا۔ پھول بوٹے بہت ابھار کر بنائے گئے تھے۔ جس نے بھی دیکھا میری قسمت پر رشک کرنے لگا۔ سات دیہاتوں سے مہمان بلائے گئے۔ خرچے میں میرا ہونے والا خاوند پیش پیش تھا۔ بارات کے آگے دو تین بینڈ باجے والے جن پر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سب گاؤں کے لڑکے بالے نوٹ لوٹنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جا رہے تھے۔ دیگیں کھڑک چکی تھیں۔ دنیا دانتوں میں انگلی دے رہی تھی کہ کسی نے اس گاؤں میں ایسی بارات نہ دیکھی نہ سنی اور اس طرح میں بیاہ دی گئی۔ دو دن بعد لاہور سے میری لندن کی فلائٹ بک تھی اور مجھے کہا گیا کہ تمہیں اسی عروسی لباس اور زیورات کے ساتھ ایئرپورٹ لے جایا جائے گا کہ یہ دستور ہے اور پاکستان سے دلہنیں اسی طرح سج دھج کر لندن کے جہاز میں جاتی ہیں۔ میں نے یہ بات سن بھی رکھی تھی۔ چنانچہ مجھے فلائٹ کے لئے خاص طور پر تیار کرایا گیا۔ وہ سب کچھ پہنایا گیا۔ میرے ہاتھ میں وینٹی بکس جو

کہ بہت بڑا اور بھاری تھا، تھما دیا گیا۔ اب مجھے محسوس ہوا میرے معصوم سے جسم پر لوہے کا جال ڈال دیا گیا ہے اور مجھے یہ سفر اکیلے کرنا ہے کیونکہ میرا خاوند ایک دن پہلے لندن چلا جائے گا تا کہ وہ ایئر پورٹ پر میرا استقبال کر سکے۔ اب میں بہت خوفزدہ تھی کہ یہ میرا پہلا ہوائی سفر تھا لیکن دلہن ہونے کی وجہ سے سب میری مدد کر رہے تھے اور بالآخر میں جہاز میں سوار ہوگئی۔ سفر میں طرح طرح کے خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے لندن میں کس جگہ جانا ہے کیونکہ میرے خاوند نے ہی مجھے ایئر پورٹ سے لینا تھا۔ مجھے صرف خاوند کا نام معلوم تھا۔ یہ تک پتہ نہیں تھا وہ کہاں رہتا ہے، کیا کام کرتا ہے۔''

میں ساری بات سمجھ چکا تھا لیکن میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین اسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کہا ''پھر آپ لندن ہیتھرو ایئر پورٹ پر اتریں تو وہ خاوند آپ کو لینے آیا ہوا تھا؟''

''میں اتری تو ایک پاکستانی عورت کو معلوم ہو گیا کہ میں اکیلی ہوں اور اس طرح کی دلہنیں پاکستان اور انڈیا سے جاتی رہی تھیں تو اس نے میرا وینیٹی بکس مجھ سے لے لیا کہ میں تمہیں امیگریشن تک لے جاتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ امیگریشن کیا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا میں سیدھی باہر چلی جاؤں گی۔ جب اس پاکستانی عورت نے وہ اٹھایا تو اس نے کہا ''اوہ یہ کتنا بھاری ہے۔ اس میں کیا لوہا رکھا ہوا ہے۔'' میں بالکل نہیں سمجھی اور وہ وینیٹی بکس لے کر چلی اور پھر اس نے وہ میرے ہاتھ میں دوبارہ دے دیا کہ اس نے امیگریشن کی لائن میں لگنا تھا۔ اب وہ میں نے ہاتھ میں لے لیا۔ میرا برا حال تھا۔ پسینے کی وجہ سے ایک تو اتنا بھاری عروسی جوڑا، پھر زیورات اور پھر میری گھبراہٹ، تو میں معلوم نہیں کس طرح ایک قطار میں لگی جس کے لئے اس عورت نے مجھے بتایا کہ تمہیں یہاں پاسپورٹ دینا ہے اور وہ مہر لگائیں گے اور پھر تم باہر اپنا سامان لے کر جاؤ گی۔ میرے ساتھ بڑا سوٹ کیس بھی تھا جسے جہاز میں بک کرایا گیا تھا۔''

اب مجھ پر صورت حال اور واضح ہو چکی تھی کہ وہ معصوم دیہاتی لڑکی وہاں کیوں ہے؟ اس نے خود ہی بتا دیا ''جب میں ایئر پورٹ پر اس قطار میں آئی جہاں پاسپورٹ دینا تھا تو سب مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں کس حلیے میں وہاں اتنے بھاری زیورات پہن کر آئی ہوں۔ جونہی میں وہاں پہنچی، ایک وردی والے آدمی نے جو کہ کالا تھا، مجھے کہا آپ میرے ساتھ آئیں۔ اور اس نے پاسپورٹ بھی لے لیا۔ میں سمجھی میرے خاوند نے خصوصی انتظام کیا ہے مجھے آسانی سے ساتھ یہاں سے لے جانے کے لئے۔ لیکن وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے اور انہوں نے میرے زیورات اتروائے پھر میرا لباس اتروایا۔ پھر میرے

جو ۔۔ وینیٹی بکس اور پھر جو سوٹ کیس میرے ساتھ جہاز میں آیا وہ بھی کھلوایا۔ اب انہوں نے پہلے زیورات کو ایک ایک کر کے توڑا۔ اندر سے سفید سفوف باہر نکل آیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا تھا۔ انہوں نے بتایا یہ ڈرگز ہیں جن کی سزا موت ہے۔ میرے لباس کی کڑھائی کے اندر سے کپڑے کے اوپر چڑھے استر کے اندر سے، سینڈل میں سے، میرے بیوٹی بکس کی ہر شے میں سے، بکس کو توڑا، اس کی تہوں میں سے وہ سفید سفوف نکل رہا تھا۔ انہوں نے میرے کپڑے اتروائے اور مجھے انہوں نے اپنے کپڑے دیئے۔ ان کی عورتوں نے مجھے پہنائے۔ میرے بکس کو توڑا گیا۔ اس میں سے بھی یہ سفوف نکل آیا۔ اب انہوں نے مجھ سے میرے خاوند کا پوچھا۔ میں صرف اس کا نام بتا سکی۔ انہوں نے اس کا پتہ پوچھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے کہا وہ تمہیں لینے آیا ہوگا۔ میں نے کہا ہاں وہ آیا ہوگا لینے۔ اس پر انہوں نے کچھ فون پر کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ عروسی کپڑے تو لیر و لیر ہو چکے تھے۔ وہ مجھے میرے خاوند کو گرفتار کرنے کے لئے باہر لے کر آئے کہ میں اس کی نشاندہی کروں اور وہ اسے گرفتار کر لیں۔ میں باہر آئی تو وہ دور دور تک نہیں تھا۔ پولیس بہت دوڑی۔ وہ کہیں نہ ملا۔''

''ایسے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اندر کچھ ہو گیا ہے اس لئے وہ بھاگ گیا ہوگا۔ اسی لئے اس نے تمہیں پتہ بھی نہیں دیا ہوگا۔''

اب سب کچھ کھل گیا تھا اور وہ دلہن سیدھی جیل پہنچی۔

''وہ میرے چاچے کا بیٹا تھا جس نے یہ سب کیا۔ میرے گھر والوں کو نہیں معلوم میں جیل میں ہوں۔''

''میں اطلاع کر دوں گا، مجھے پتہ دے دو۔''

اس نے پتہ دیا جس پر میں نے انہیں سب اطلاع دے دی تھی۔

میں اپنے اس نئے کام میں بہت کچھ سمجھ رہا تھا کہ مجھے مردوں کی جیل میں بھی فرائض مل چکے تھے۔ میں ایک دن گیا تو مجھے وہاں زیادہ تر پنجاب کے مختلف علاقوں کے، مختلف عمروں کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ملوائے گئے کہ میں ان سے مل لوں اور وہ اگر چاہیں تو میں عدالت اور تفتیش میں ان کی ترجمانی کر سکوں۔ وہ لوگ گوجرانوالہ، منڈی بہاؤالدین، ٹوبہ ٹیک سنگھ، جہلم، گجرات، شیخوپورہ، سیالکوٹ اور راولپنڈی کے آس پاس کے دیہاتوں کے علاوہ ایک گروہ آزاد کشمیر کے رہنے والوں کا تھا جو میرپور، کوٹ اور مظفر آباد کے اطراف سے تھے۔ میں سوچ رہا تھا یہ کیا جرائم کر سکتے ہیں۔ یہ وہ وقت

ڈرگز یورپی ملکوں میں جانے لگی تھیں۔ سٹریٹ کرائمز چونکہ معمولی نوعیت کے ہوتے تھے تو ایسے مجرم اس جیل میں نہیں تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ قتل، ریپ، چوری، دھوکہ دہی، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے سے لے کر شراب پی کے چاقو چھری چلانے والے بھی وہاں موجود تھے۔ ایسے میں ان کو بتایا گیا کہ جس نے مجھے اپنا ترجمان بنانا ہے، سامنے آئے اور عدالت میں رہنمائی کے لئے میں حاضر ہوں۔ کئی چہرے کئی کہانیاں۔

ایک ادھیڑ عمر داڑھی ملگجی، سر سے آدھا صاف آدھا ملا جلا سا منے آیا اور اس نے کہا ''میں نے اپنی عورت کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ اب مجھے راتوں کو جنت کے خواب آتے ہیں۔ تم یہ جج کو بتاؤ۔ تم مسلمان ہوناں تو میری بات کافر جج کو سمجھا دو۔''

''میں نے اس سے پوچھا تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟''

''ہاں میں نے اس کا گاٹا لاہ دیا۔''

''مگر کیوں؟ وہ پاکستانی تھی، کون تھی؟''

''نہیں جی ادھر ایک گوری کو پھنسایا کہ مجھ سے شادی کر کے مجھ کو پکا کرا دے۔ پاسپورٹ مل جائے گا۔ ادھر رہنے کا قانونی ہو جاؤں گا۔''

''پھر تم نے اس گوری کو کیوں قتل کیا جس نے تمہارے لئے برطانیہ میں رہنے کے لئے سب کچھ کیا؟''

''وہ کافر تھی۔''

''جب کافر تھی تو شادی کیوں کی کافر سے؟''

''اس لئے کہ تبلیغ کرنی تھی۔ کافروں کو مسلمان بنانا تھا۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور میں نے تبلیغی جماعت میں حصہ لیا تھا اسی وجہ سے تو برطانیہ آیا تھا ورنہ کون مجھے برطانیہ میں گھسنے دیتا۔''

میں کچھ کچھ سمجھ چکا تھا۔ کیا برطانوی حکومت کو معلوم نہیں تھا کہ جو بیج وہ ہندوستان کی تقسیم کا بو کر آئے ہیں اس کی فصل بھی پک سکتی ہے۔ انہوں نے ایک مشترک ہندوستان کو تقسیم کرنے کے لئے تین قوموں میں تفرقہ پیدا کیا۔ ہندو، مسلم اور سکھ کا فرق نمایاں کیا۔ یہاں تک کہ مسلم پانی اور ہندو پانی ریلوے سٹیشنوں پر متعارف کرایا جس پر سعادت حسن منٹو نے طنز کے تیر چلائے مگر اس وقت کسی نے سنا۔ جب اس نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' افسانہ لکھا تو دنیا کو خبر ہوئی اور اسے دنیا کے بہترین فکشن میں شامل کیا گیا جس میں

''مہابھارت'' بھی شامل تھا۔

اب جو بیج بویا گیا تھا اس کا نشانہ خود برطانیہ کی خواتین بن رہی تھیں اور مجھے مستقبل کا برطانیہ اس فرقہ واریت کی لپیٹ میں آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک طرف احمدی اپنے جماعت خانے بنا چکے تھے۔ ہر فرقے اور مذہب کی عبادت گاہیں موجود تھیں۔ مساجد کو بھی فرقوں میں تقسیم کرنے کے قصے چل پڑے تھے۔ چونکہ ہر مسجد کے ساتھ مہنگی پراپرٹی وابستہ ہوتی ہے اس لئے مساجد پر قبضے کے واقعات اِدھر اُدھر سے سننے میں آ رہے تھے۔ ایک فرقہ کہتا تھا یہ ہمارے فرقے کی مسجد ہے، دوسرے فرقے کے کسی آدمی کو اندر نہیں آنے دیں گے۔ ساری بات مفاد اور پراپرٹی سے وابستہ تھی۔ اب میں نے اس سے پوچھا ''تم نے اس کافر سے پہلے شادی کیوں کی۔ جب وہ تمہارے مذہب کی نہیں تھی۔''

''وہ جی کافر عورتوں سے شادی کی جاسکتی ہے تاکہ انہیں مسلمان کیا جاسکے۔ یہ ثواب کا کام ہے۔''

''کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

''بارہویں تک پڑھا ہے۔ آگے نہیں۔''

''قرآن پاک اور حدیث کا علم کتنا پڑھا ہے؟''

''جو مولوی صاحب نے بتایا بس اتنا پتہ ہے۔ ہم کو تبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا تھا اور ہم کافروں کے ملکوں کی طرف نکلتے تھے۔ وہ تو ایسا ہوا کہ میں تبلیغ کی جماعت کے ساتھ جب ادھر آیا تو کھسک گیا اور واپس نہیں گیا۔''

''تم نے اپنی تبلیغ کے ساتھ بھی بے وفائی کی اور ایک انسانی جان بھی لے لی۔''

''تم نے جج کو بتانا ہے کہ میں نے اپنے ایمان اور اسلام کی سربلندی کے لئے کافر کا خون کیا ہے۔''

''اس ملک میں تو تمہارے مطابق کروڑوں کافر ہیں تو سب کو مارو گے تو یہ ملک تو صرف تمہارے پاس رہ جائے گا۔''

''تم بتانا جج کو کہ میں نے اس کو تبلیغ کی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ میں نے بہت کوشش کی۔''

''تمہیں پتہ ہے اسلام میں جبر اور زبردستی نہیں ہے۔''

''جہاد کیا ہے؟ تلوار ہی سے تو ہوتا ہے۔''

''جہاد کی بے شمار شرائط ہیں۔ وہ ایسے واجب نہیں ہوتا۔''

میں یہ ساری باتیں اس سے اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے سرکار اسی بات کے پیسے دیتی تھی کہ میں ان مجرموں کی کونسلنگ کروں۔ ان کے الٹے سیدھے خیالات کو درست کر کے اچھا شہری بننے میں مدد دوں اس لئے مجھے اس کے ساتھ ہر ہفتے وقت گزارنا پڑا لیکن میں شاید اس کے اندر راسخ رویوں اور آنکھوں پر پڑے پردوں کو نہ ہٹا سکا۔

اب ایک اور کردار کسی لمحے سامنے آیا۔ وہ میر پور آزاد کشمیر کا رہنے والا تھا اور وہ ایوب خان کے وقت منگلا ڈیم کے متاثرین میں شامل خاندانوں میں سے تھا جنہیں برطانیہ میں آباد کیا گیا اور وہ سب بریڈفورڈ کے ایک محلے میں آباد ہو گئے تھے۔ محلہ انہوں نے خود ہی بسایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنی دو بیٹیوں کو غیرت کے نام پر قتل کیا ہے۔ اب اس نے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی اور مجھے غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے اس جیسے بے شمار والدین کی کونسلنگ کرنی تھی۔ اس نے جو کہانی سنائی وہ وہی ہے جو ہر غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے پاکستان میں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اور اس کی بیوی جب برطانیہ آئے تو ان کی زیادہ تعلیم نہیں تھی۔ انہیں آباد کیا جانا تھا۔ وہ ولایت کو نہیں جانتے تھے۔ جب وہ آ گئے تو انہوں نے چھوٹے موٹے کام کر کے گھر چلایا۔ برطانیہ نے انہیں مواقع دیئے، روزگار عام تھا۔ یہ محنتی لوگ تھے کام چل نکلا۔ پتہ بھی نہ چلا کہ دونوں بیٹیاں بارہ تیرہ سال کی ہو گئیں۔ پہلے وہ سرکار کے سکول میں جاتی تھیں۔ پھر باپ نے مخلوط تعلیم کی وجہ سے اٹھا لیا اور برقعہ پہنا دیا اور گھر پر مذہبی تعلیم کے لئے ایک پیشہ ور پاکستانی مولوی جو اسی کام کی تلاش میں آیا تھا اسے لگا لیا۔ اسی نے ان دونوں بہنوں کو گھر کے اندر سے نقب لگا کر آزاد کرایا۔ وہ ایسے کہ پہلے خود ان کو بلوغت کی سرحد پر ریپ کیا۔ جب انہیں اس کی عادت ڈال دی تو پھر خود ہی انہیں رستہ دکھایا کہ یہاں کمائی کے لئے بے شمار راستے ہیں۔ ان بہنوں کو سب سمجھ آ چکی تھی۔

وہ ماں کے ساتھ جینز پہن کر اوپر برقعہ ڈال کے نکل جاتی تھیں۔ جب باپ کام پر ہوتا تھا اور باپ دو جگہ کام کر رہا تھا۔ ایک جگہ چھ گھنٹے کے لئے، ایک جگہ چار گھنٹے کے لئے۔ وہ جب تھک ہار کے گھر آتا تو وہ دونوں بیٹیاں اور بیوی گھر میں موجود ہوتی تھیں لیکن اصل میں بات یہ تھی کہ وہ دونوں بیٹیاں برطانیہ میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کا سکول بھی برطانیہ کا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ باپ انہیں کیا بنانا چاہتا ہے اور جب باپ نے میر پور ہی کے دولڑکے وہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالے جو میر پور سے روزی کمانے نئے نئے وارد ہوئے تھے اور انہیں پاؤں جمانے کے لئے برطانوی پاسپورٹ والی لڑکیوں کی تلاش

تھی تو ایسے میں باپ کو مسلمان رشتوں کے ملنے کی جو خوشی ہوئی وہ میری سمجھ میں آ سکتی تھی۔ شادی کے دن دونوں بہنوں نے پاسپورٹ اٹھائے اور غائب ہو گئیں۔ دولہے راہ دیکھتے رہے۔ دونوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ ماں سے بیٹیوں نے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ باپ کو جب اس بات کی بھنک پڑی تو اس نے کسی طرح ماں کا یہ اعتبار حاصل کر لیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو معاف کر چکا ہے اور انہیں کسی طرح راضی کر کے گھر لے آؤ۔ وہ اس کے جال میں آ کر بیٹیوں کو گلاسکو سے واپس لے آئی جہاں وہ ایک بار میں کام کر رہی تھیں اور اپنی مرضی سے دوستیاں بھی کر رہی تھیں۔ اب باپ موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک رات اس نے خون کی ہولی کھیلی۔ ماں اور بیٹیوں کو کچن کی چھری سے کاٹ کے رکھ دیا۔ اب وہ میرے سامنے کھڑا تھا کہ میں عدالت میں غیرت کا مطلب سمجھاؤں اور اسلام کی مثالوں سے ثابت کر کے اس کے لئے انصاف حاصل کروں۔

ایسے کئی کیس ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پاکستان اندر اور باہر سے کس تیزی سے بدل رہا ہے۔ روزگار نے عرب امارات، یورپ اور امریکہ کے ساتھ آسٹریلیا، تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی جانب کئی طرح کے راستے بنا دیئے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی نے پاکستانیوں کے لئے سیاسی پناہ کے جائز اور ناجائز دروازے کھول دیئے تھے۔ ضیاء الحق کو اپنی ناجائز حکومت کو آگے بڑھانے اور طول دینے کے لئے ایک تو روس کے خلاف افغانستان میں امریکہ، سعودی عرب اور یورپ سے ڈالروں کی مدد نے افراطِ زر کا شکار کر دیا تھا تو دوسری طرف پاکستانی کور کمانڈرز اور فوجی اشرافیہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کے فوج کے لئے کاروباری مواقع کا کارپوریٹ کلچر متعارف کرا دیا تھا۔ یہ سب عالمی معیشت کی طاقتور حکمت عملی کے باعث ممکن ہو گیا اور پاکستانی افواج نے رئیل اسٹیٹ میں قدم رکھ دیا جو کہ پہلے سے رکھا جا چکا تھا۔ تو ایسے میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی نے جنم لیا۔ پھر اس کی گود سے اور کئی سوسائٹیز نے جنم لینا تھا کہ قانون کے لئے اس طرح کی گنجائش پیدا کرنا معمولی بات تھی۔ ضیاء الحق نے اس موقع پر کئی مافیاز کی سرپرستی اس لئے کی کہ اسے صرف اپنے اقتدار کو آموں کی پیٹی تک لے جانا تھا۔

اب میں نے سوچا کہ کیا میں ان جیلوں کی حدود میں رہوں گا اور اپنا روزگار ان جرائم سے حاصل کروں گا۔ میں ایک شاعر یا کم سے کم ایک استاد ہوں تو مجھے تو کچھ اور دیکھنا ہے۔

اب میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ پاکستان کی سیاست کون سا رخ اختیار کرنے والی ہے۔

....

میں ہفتے میں تین دن جیلوں میں قیدیوں کی ترجمانی اور پولیس کے ساتھ عدالت میں رابطہ کار کے فرائض انجام دیتا۔ اس میں مجھے اچھے خاصے پاؤنڈمل جاتے تھے۔ میں سکاچ خرید سکتا تھا جبکہ وہ خاصی مہنگی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گھر اکثر فون کر سکتا تھا۔ کچھ اداسی کو دور کرنے کے لئے ذرا سا اِدھر اُدھر بھی گھوم لیتا تھا۔

پاکستان کے حالات ویسے ہی جا رہے تھے۔ میرا بیٹا نہیں جانتا تھا باپ کون ہے۔ پہلی سالگرہ پر میں نے فون کیا۔ سکہ ڈال کے فون کر رہا تھا۔ سکے پہ سکہ ڈالتا جاتا تھا۔ وہ بول کے نہیں دے رہا تھا۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ غوں غاں یا کچھ بھی۔ مگر ماں کے بلانے پر بھی نہیں بول رہا تھا۔ اسے اندر سے پتہ تھا کوئی اجنبی ہے جو فون کے دوسری طرف ہے۔ میں اس کے لئے اجنبی ہی تھا۔ وہ یا تو مجھ سے ناراض تھا کہ میں کیسا باپ ہوں کہ بیٹے کو سوتا چھوڑ کر چلا گیا۔ آدھی رات کی فلائٹ میں دھکا دے کر بٹھا دیا گیا۔ کیا بیٹوں کے ایسے باپ ہوتے ہیں۔ میں سکے ڈالتا گیا، وہ نہیں بولا۔ میں نے سعدیہ سے بات کی مگر کیا بات کرتا۔ ہمارے درمیان کچھ تھا ہی نہیں کہ بات کرتے۔ میں نے معلوم کیا کہ کیا کر رہی ہو۔ اس نے بتایا کہ سکول جاتی ہوں۔ آج اس کی سالگرہ پر گھر کے کچھ لوگ آئے ہیں۔ معمولی سا انتظام ہے۔ اسے تو معلوم ہی نہیں سالگرہ کیا ہوتی ہے۔ میری گود میں آ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ میں سکول جاتی ہوں تو پیچھے یہ ملازمہ کے پاس ہوتا ہے۔ اداس ہو چکا ہے۔ اس کا بچپن چھینا جا رہا ہے۔ کیا یہ تم نے چھینا ہے یا مارشل لاء نے، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں سکول اسے لے کر نہیں جا سکتی۔ شاید اگلے سال وہ اس قابل ہو کہ میں اسے ساتھ لے جا سکوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے تم یاد آتی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہوتا کہ ہر شخص اپنے حالات میں خود کو مطمئن کرنے کے لئے راستے ڈھونڈ لیتا ہے جس میں محبت اور تعلق کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا جیسے پتنگ ہوا پر اڑتی ہے۔ جیسے مچھلی سمندر کی لہر پر بہتی ہے۔ جیسے کوئی صحرا میں تیز

آندھی کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ میں نے فون نہیں رکھا، فون خود ہی بند ہو گیا۔ سکے ختم ہو چکے تھے۔ مجھے محسوس ہوا میری سانسیں ختم ہو گئی ہیں اور فون خاموش نہیں ہوا، میں خاموش ہو گیا ہوں۔ میں فون بوتھ سے نکلا اور سڑک پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے رونا شروع کیا اور میں نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ کوئی بھی دلاسا دینے کے لئے پاس نہیں تھا۔ لندن کی رات آ رہی تھی اور ٹریفک رواں دواں تھی۔ کوئی بھی فٹ پاتھ پر آ جا نہیں رہا تھا۔ یہ سردیوں کی ایک سرد ترین رات تھی۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا میں نے اپنا آپ کھو دیا ہے۔ یہ کوئی اور ہے جو لندن کی اس رات بھٹک رہا ہے۔ چند نظمیں میرے نامہ اعمال میں تھیں۔ اتنی بڑی فوج کا سربراہ معصوم سی نظموں سے ڈر گیا۔ پھر مجھے اپنی نظم کی آخری دو لائنیں یاد آ گئیں:

کبھی کبھی ایک نظم اتنی بہادر ہو جاتی ہے

کہ خود نہیں مرتی

بادشاہ کو مار دیتی ہے

لندن میں پاکستانی جو میرے ساتھ سیاسی پناہ کے لئے جہاز بھر کے آئے تھے وہ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ جہاں جس کے سینگ سمائے، بس کہیں کسی کی خبر مل جاتی تھی۔ لندن میں رہنے والے پاکستانیوں کو ضیاء الحق کے مارشل لاء میں بس اتنی دلچسپی تھی کہ انہیں چٹ پٹی خبریں مل جاتی تھیں اور انہیں پاکستان سے دور رہنے کی نعمت سے مالا مال ہونے کا ایسا احساس مل جاتا تھا کہ وہ پاکستان کے خلاف لطیفے بنانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

ایک دن مجھے بی بی سی اردو سروس میں ایک پرانے دوست نے بلایا کہ میں اپنی مزاحمتی شاعری بھی سناؤں اور پاکستان کی ادبی صورت حال پر تبصرہ بھی کروں کہ ان دنوں بی بی سی اردو سروس انڈیا اور پاکستان میں بے حد دلچسپی سے سنی جا رہی تھی۔ میں پروگرام کر کے بش ہاؤس کی کینٹین میں آیا جو بے حد بڑی تھی اور اس میں ڈرنکس ہر قسم کی تھیں۔ کھانے پینے کا وافر سامان تھا۔ لنچ، ڈنر تک کا بندوبست چلتا رہتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو جتوئی صاحب وہاں ایک پنجاب کے سابق ایم این اے جو ملتان سے تھے، کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ملتان کے ایم این اے رضوی صاحب تھے اور جتوئی صاحب کا تو تعارف ہو چکا ہے۔ اب مجھے اتنا پتہ تھا کہ 1970ء اور 1977ء کے الیکشن میں یہ نام بھٹو صاحب کے ساتھ گونجے تھے۔ میں الگ میز پر اپنے میزبان پروڈیوسر کے ساتھ بیٹھا تھا کہ آواز آئی ''سائیں ادھر بھی کچھ آپ کے خادم بیٹھے ہیں۔''

''میں نے مڑ کے دیکھا تو جتوئی صاحب کو پہچان لیا اور اُٹھ کر آیا ''سائیں قدموں پہ ہاتھ،

سائیں دیکھا نہیں، گستاخی ہو گئی۔''

''بابا گستاخی تو ہم کو قبول ہے۔ یہ تو ہم دن رات سنتے ہیں۔ بابا ادھر بیٹھو یہ پتہ ہے کون ہیں؟''

اب میں کیا کہتا۔ رضوی صاحب خود ہی بول پڑے ''میں احمد رضوی ہوں۔ ملتان کے قریب کے علاقے کا ایم این اے تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔''

جتوئی صاحب کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ ''بابا تم بھی کچھ لو۔ ہم ادھر بی بی سی کے مہمان ہیں۔ ادھر سب خرچہ ان کا چلتا ہے۔''

اب میں نے دیکھا کہ پنجاب کے دریا سندھو دریا میں مل رہے ہیں اور شاید یہی ہماری سیاست کا دھارا تھا۔ اب میں ظاہر ہے خاموش تھا تو ایسے میں جتوئی صاحب نے میرے متعلق بتایا کہ ''شاہ جی یہ شاعری کی وجہ سے ادھر جلاوطن کئے گئے ہیں۔'' رضوی صاحب چونکے ''کیا مطلب۔ بھئی یہ کوئی فیض احمد فیض یا حبیب جالب ہے۔ کون ہیں یہ؟ ضیاء الحق تو صرف فیض، فراز اور جالب سے ڈرتا ہے۔''

میں نے کہا ''میں معمولی شاعر ہوں اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بھٹو صاحب پر جو نظمیں لکھیں اس کتاب پر چھاپہ پڑا اور پھر وہ ضبط کی گئی اور مجھے شاہی قلعہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے میں اس فلائٹ کے ذریعے یہاں آیا جہاں ہائی جیک کرنے والوں کی دی گئی فہرست کے سیاسی قیدیوں کو بٹھایا گیا تھا۔''

رضوی صاحب کہ خوبصورت نقوش، گورا رنگ اور تن و توش کے مالک تھے، مجھے جم کر دیکھا۔ شاید پرکھ رہے تھے۔ پھر بات کا رخ موڑ کر بولے ''مجھے ملتان امروز کے ایڈیٹر مسعود اشعر نے فیض صاحب سے ملوایا اور فراز بھی میرے گھر آ چکے ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ ایم این اے بنا تھا۔ اکثر میں فیض اور فراز کی سیوا کے لئے شیواز ریگل، بلیک ڈاگ اور رائل سیلوٹ بھیج دیتا تھا۔ ویسے وہ اس سے کم پر بھی راضی ہو جاتے تھے اور حبیب جالب تو ٹھرے پر بھی آ جاتے تھے مگر میں نے کبھی کم تر شراب کو پسند نہیں کیا۔ مسعود اشعر نے ایک دن فون کیا کہ مصطفیٰ زیدی جو ساہیوال میں ڈپٹی کمشنر تھے، ملتان آئے ہیں۔ لو جی جتوئی صاحب میں دست بستہ قیمتی شراب لے گیا اور کیا محفل جمی۔ کیا کیا شاعری سنائی انہوں نے۔ وہ کیا شعر تھا ''انہی ریزوں پر......'' اب میں سمجھ گیا کہ رضوی صاحب کا ذوق اور حافظہ داؤ پر ہے تو میں نے خود ہی وہ شعر پڑھ دیا:

انہیں پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اس پر رضوی صاحب تو بہت متاثر ہوئے حالانکہ یہ سہ پہر کا وقت تھا اور ہم بی بی سی کی اس کینٹین میں بیٹھے تھے جہاں ڈرنکس کے ساتھ فوڈ بھی ہر طرح کی موجود ہوتی تھی۔ رضوی صاحب ڈرنک نہیں لے رہے تھے جبکہ جتوئی صاحب لے رہے تھے۔ اب میں سمجھ گیا کہ لندن میں سیاسی اشرافیہ آ چکی ہے اور ضیاء الحق بڑے سیاست دانوں سے جان چھڑانے کے لئے انہیں خود ساختہ جلاوطنی کے لئے موقع فراہم کر رہا ہے۔ ایسے میں صرف وہ اشرافیہ آ سکتی تھی جس کے پاس لندن میں رہنے کے لئے خاطر خواہ ذرائع موجود تھے۔ باقی جو ورکرز اور کمزور سماجی پس منظر کے جیالے تھے وہ تو اسی فلائٹ میں آئے تھے اور وہ سب سرکاری پناہ گاہوں میں تھے جسے میں چھوڑ چکا تھا کہ وہاں کوئی گرمائش کا انتظام سردیوں میں نہیں تھا اور پھر وہ بیرک نما عمارتیں تھیں جہاں کوئی بنیادی سہولت حاصل نہیں تھی۔ رضوی صاحب بھی بڑے زمیندار تھے اس لئے ان کا اپارٹمنٹ لندن میں تھا۔ وہ آسانی سے یہاں آ گئے۔ لندن میں اب اشرافیہ کے سیاست دانوں، دانشوروں، جیالوں اور سیاسی کارکنوں کا مسکن تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہاں بھی طبقاتی بنیادوں پر فرق موجود تھا اور ہر طبقے کو اپنے مفاد کے لئے اپنے حیلے وسیلے اختیار کرنے پڑ رہے تھے۔ اب میں تینوں طبقوں کے ساتھ تعلق میں موجود تھا۔ مجھے رضوی صاحب نے فوراً ہی اگلی شام کے لئے اپنے اپارٹمنٹ میں محفل کے لئے دعوت دے دی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہاں ہر پاکستانی کو اپنی شام بہتر بنانے کی فکر تھی۔ چاہے وہ لائکپوری شاعر ہو یا جتوئی صاحب یا کوئی اور......

میں کہیں بھی نہیں تھا۔ مجھے نہ تو ادب اور شاعری کی پاکستان میں کسی بھی قسم کی کیفیت کا علم تھا نہ ہی میں خود کو کسی جگہ پر محسوس کر رہا تھا۔ بس اڑتا ہوا ایک کاغذ کبھی کسی فٹ پاتھ پر رہ گیا، کبھی کسی راہ گزر پر ٹھہر گیا۔ روزی کا وسیلہ تو ہو رہا تھا لیکن جیلوں میں ترجمانی میرا مستقبل نہیں تھا نہ ہی وہ میری منزل تھی۔ وہ تو بس آسرا تھا کہ یہاں رہنے کے لئے مجھے پاؤنڈ چاہئے تھے لیکن میں جو بیوی بیٹے سے دور تنہائی کاٹ رہا تھا، کیا جنرل ضیاء الحق کو اس کا حساب دینا ہوگا کہ نہیں۔ وہ اللہ کے سامنے کس منہ سے جائے گا۔ میں تو محض ایک فرد تھا۔ ایسے لاکھوں اور بھی ہوں گے جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ اس سے پہلے کے جرنیلوں کے ہاتھوں کتنے بنگلہ دیش بننے سے پہلے مارے گئے بلکہ اب تک مارے جا رہے ہیں اور جنرل ضیاء الحق کے مرنے کے بعد جو بیج اس کے بوئے ہوئے تھے وہ اب تک جڑیں پکڑ چکے ہیں اور کئی لاکھوں نے جان سے ہاتھ دھوئے ہیں۔ کسی نے طالبان کے پہلے دور میں، کسی نے پاکستانی طالبان کے ہاتھوں، کسی نے کراچی میں متشدد لسانی جماعت کے ہاتھوں، کسی نے شیعہ سنی تنازع کے ہاتھوں، کسی نے ہزارہ قبیلے کو

مٹانے کے لئے۔ یہ سب خون ضیاء الحق کی گردن پر ہیں مگر گردن ہے کہ موٹی سے موٹی ہوتی گئی اور پھر بالآخر آموں کی پیٹی نے اس گردن کا نشان مٹا دیا۔

میں رضوی صاحب کے اپارٹمنٹ میں ایسے پہنچا جیسے کھڑکی سے ہوا کے زور سے کوئی پتہ اندر آتا ہے۔ رضوی صاحب جاگیردار تھے مگر سندھ اور ملتان کے جاگیرداروں میں فرق ہوتا ہے۔ ملتان کے جاگیردار اپنے مزارعوں اور ملازموں کو برابری پر رکھتے ہیں جبکہ جوں جوں سندھ کی طرف جائیں، جاگیردار ملازموں اور خدمت گزاروں کو فاصلے پر رکھتے ہیں، پاؤں کی جوتی سمجھ کر سامنے زمین پر بٹھاتے ہیں۔

میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو چند لمحوں بعد رضوی صاحب نے گلے میں کچن کا ایپرن باندھے دروازہ کھولا۔ میں پہچانا نہیں۔ ''وہ رضوی صاحب نے بلایا تھا۔''

''میں ہی رضوی ہوں، اندر آجائیں۔''

مجھے خفت سی ہوئی۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا رضوی صاحب کچن میں کھانا بنا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی چھوٹی سی لائبریری میں بٹھایا اور کہا ''آپ کی یہ بات مجھے اچھی لگی کہ آپ وقت پر آئے ہیں۔ میں اکیلا ہوں اور کھانا بنانا میرا شوق ہے۔ آپ اتنی دیر یہاں کتابیں دیکھیں، ویسے بھی آپ شاعر ہیں تو آپ کی پسند کا بہت سامان یہاں ہے۔ میں کھانا بنالوں۔''

اب جو میں نے لائبریری دیکھی تو پورا ترقی پسند ادب موجود تھا۔ کیا فیض، کیا فراز، کیا سبط حسن، کیا کیفی اعظمی، کیا علی سردار جعفری، کیا عصمت چغتائی، کیا سجاد ظہیر۔ میں بھٹو صاحب کا قائل ہو گیا کہ انہوں نے 1970ء اور 1977ء کے الیکشن میں کیسے کیسے جاگیرداروں اور وڈیروں کو ٹکٹیں دیں جو دنیا کی نظر میں جاگیردار تھے لیکن وہی پاکستان کی قسمت بدل سکتے تھے۔ اس میں ڈیرہ غازی خان کے شیر باز مزاری ہوں کہ سندھ کے مخدوم امین فہیم اور طالب المولیٰ ہوں یا تالپور خاندان، سب کے سب بڑی لائبریریوں اور دنیا بھر کی کتابوں کے عشاق میں سے تھے۔ میں دیکھتا رہا۔ اس دوران کچن سے کسی بھی چیز کے تلنے یا تڑکا لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ چونکہ لندن کا یہ فلیٹ ظاہر ہے دو بیڈروم کا تھا تو ہر شے ویسے بھی قریب قریب ہوتی ہے اس لئے میں سمجھ سکتا تھا کہ کیا پک رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ جب یہ آوازیں مدھم ہوئیں تو رضوی صاحب ایپرن اتار کر آئے اور میں اب پہچان پایا۔ انہوں نے کہا ''اب میں نے سب تیار کر لیا ہے۔ آپ ڈرائینگ روم میں آجائیں۔'' میں نے ان سے پوچھا ''لندن میں آپ نے یہ

اپارٹمنٹ عیاشی کے لئے بنایا ہے یا پڑھنے لکھنے کے لئے۔ میں تو کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔"

وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کہا "سنو! تم ابھی نوخیز ہو یا نئے پنچھی ہو۔ تم ترقی پسند خیالات کا شکار ہوئے ہو۔ ہم ترقی پسندی کے اسیر ہیں پنچھی نہیں ہیں۔"

"لیکن یہاں تو جو بھی نقل مکانی کر کے آتا ہے، عام تاثر ہے کہ وہ یہاں عیاشی کی غرض سے آتا ہے۔ یہاں سفید فام جسم ہیں، سیاہ فام جسم ہیں، شراب ہے، کباب ہے، کلب ہے، نشاطِ دوراں کی سلسلہ در سلسلہ سوغات ہے۔"

"ہاں یہ سب ہے مگر میں خاندانی آدمی ہوں۔ مجھے جو چاہئے وہ پاکستان میں نہیں مل سکتا اس لئے میں نے یہاں ٹھکانہ بنایا ہے۔ مجھے منافقت سے شدید نفرت ہے۔ یہاں میں آزادی سے کشادگی سے شراب کی قسمیں لا کر سجا سکتا ہوں۔ میں پیوں یا نہ پیوں، مجھے یہ بوتلیں جو سجی ہوئی ہیں انسان دوستی اور محبت کی علامت لگتی ہیں۔ میں جب لندن آتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں آزاد ہو گیا ہوں۔ کیا یہ احساس سو مربع زمین کے مالک ہوتے ہوئے پاکستان میں ممکن ہے۔"

اب میں سوچ رہا تھا کہ بات تو وہی ہو رہی ہے جو میں سوچ رہا تھا۔ ویسے ہی پوچھ لیا "آپ تو رائٹر نہیں ہیں۔ پھر یہ کتابیں آپ نے کیسے جمع کر کے لندن میں لائبریری بنالی ہے۔"

"چونکہ تم جانتے نہیں ہو اس لئے میں تم پر وقت ضائع نہیں کروں گا۔ یہ جو ملتان کے خانوادے ہیں، کیا تم جانتے ہو؟"

"جی میں جانتا تو ہوں قریشی، گیلانی، گردیزی، رضوی، درانی۔"

"ہاں تو پھر سن لو، گردیزی خاندان ان سب میں زیادہ کتاب اور علم دوست ہے۔ مجھے یہ کتابیں بہادر شاہ گردیزی، عباس علی گردیزی، حسن رضا گردیزی اور سید قسور علی گردیزی سے ملی ہیں اور پھر قریشی خاندان میں بھی کتب ذخیرہ کرنے کی روایت ہے۔ اور پھر گیلانی خاندان بھی یہ سلسلہ رکھتا ہے۔"

"تو آپ نے ملتان کی ثقافت اور علم کو گلے سے لگا رکھا ہے؟"

"اب کچھ مت کہو کہ کتابیں تو رکھتے ہیں، علم نہیں رکھتے۔"

میں چونکا اور مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں بھی علم نہیں رکھتا تو میں کیا سوال کروں۔ سو میں نے بس اتنا کہا "رضوی صاحب! آپ نے یہاں بھی برٹش میوزیم کی طرح لائبریری کے لئے ایک الگ گوشہ آباد کر رکھا ہے۔"

''ملتان کے جاگیرداروں میں صرف خاکوانی ایسا خاندان ہے جو کتاب اور علم دوستی سے واسطہ نہیں رکھتا تھا لیکن اب اس میں بھی کچھ لوگ نیا شعور لے کر آ رہے ہیں جیسے میرے ایک دوست اسحاق خاکوانی اور احسن خاکوانی ہیں۔''

''رضوی صاحب آپ جانتے ہوں گے کہ سندھ اس معاملے میں پنجاب سے بہت روشن خیال اور تہذیب دار ہے۔ وہاں جی ایم سید، مخدوم طالب المولیٰ، میر رسول بخش تالپور اور کچھ خانوادے قدیمی علوم کی لائبریریوں میں پلے بڑھے ہیں۔ چھ چھ زبانوں کے عالم وہاں سے دنیا کو حیران کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔''

اب جو رضوی صاحب نے دیکھا کہ بحث نکل پڑی ہے تو کچن کی طرف مڑے۔ ادھر انہیں ملتانی کوزین کے جوہر دکھانے تھے۔ وہاں کئی طرح کے پکوان ان کی توجہ چاہتے تھے۔ وہ ادھر گئے اور میں نے کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ مجھے وہاں سبط حسن، کیفی اعظمی، فیض، مخدوم محی الدین، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری اور تمام ترقی پسندوں کی کتابیں دکھائی دیں۔ وہاں ''روشنائی'' اور ''سوزِ وطن'' کے نسخے بھی موجود تھے جن پر برٹش حکومت نے پابندی لگائی تھی۔ اب یہ دونوں مجموعے خود برطانیہ کے شہر لندن میں موجود تھے اور انگریز کی بے وقوفی کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اب مہمان آنا شروع ہوئے۔ یہ لندن کی ایک اور رات تھی۔ سجاد ظہیر کے ناولٹ کو ہم کتنی طرح سے تجربہ کر رہے تھے۔ اس وقت سجاد ظہیر لندن پڑھنے گئے تھے اور ہندوستانی طالب علم ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے کے لئے ایک شراب خانے میں موجود تھے۔ اس شراب خانے نے ہندوستان اور پھر پاکستان اور پھر بنگلہ دیش کے لئے ایسا کردار ادا کیا کہ میں اس شراب خانے جسے پب کہتے ہیں، کو دیوانہ وار ڈھونڈتا رہا۔ جس نے اس خطے کو راجوں، راجواڑوں، مغلوں، ٹھاکروں، حضرت نظام جنگوں اور معلوم نہیں کن کن واجد علی شاہوں سے نجات دلائی۔ یہ بھی اسی قسم کی رات تھی جب پاکستانی ضیاء الحق کے خلاف یہاں جمع ہو رہے تھے۔ لندن ایک کردار تھا اور اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ تاریخ کا گھنٹہ گھر لندن کے گرد طواف کر رہا تھا۔ کالونیئل تاریخ میں ہندوستان کی وہ تاریخ بھی شامل ہو چکی تھی جو ہزاروں سال کی تاریخ تھی۔ انسانی غلامی کی تاریخ۔ جب ہندو ہریجنوں کو جو مسلمان کا فضلاء اٹھاتے تھے اور عیسائیوں کو جو مسلمان حکمرانوں کے پاخانے صاف کرتے تھے اور ان کی عورتیں رسوئی سے لے کر بچوں کی صاف صفائی پر لگی ہوئی تھیں، یہ سب ہندوستان کی وہ تاریخ ہے جس کا انتقام کبھی ہندو حکمران، مسلمانوں اور سکھوں سے لیں

گے اور اس بات کا محمد علی جناح کو علم نہیں تھا کہ تاریخ کی جڑیں اپنا انتقام ہزاروں سالوں تک لیتی ہیں جیسے افریقہ میں ہوا، جیسا امریکی سول وار میں ہوا، جیسا کہ دنیا کی تبدیلی لیڈروں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتی۔ تبدیلی تاریخ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جسے تاریخی جبر کا نام دیا گیا ہے۔ اب محمد علی جناح کو اگر تاریخی جبر سمجھانا ہو تو کیسے سمجھائیں گے کہ وہ ایک فلم دیکھ لیں جو بی بی سی لندن نے بنائی تھی جس کا نام تھا ''Viceroy's House'' اس فلم نے بتایا کہ تاریخ کوئی بنائے نہ بنائے جغرافیہ تاریخ کو بناتا ہے۔ جغرافیہ فیصلہ کرتا ہے کہ تاریخ کس سمت جائے گی۔ مشرقی پاکستان نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی تاریخ کیا ہو گی۔ ہندوستان کے جغرافیے نے فیصلہ کیا کہ اس کی تاریخ کیا ہوگی اور پھر افغانستان نے فیصلہ کیا کہ اس کی تاریخ کیا ہوگی۔ اس لئے تاریخ تابع ہے جغرافیے کے۔ لیکن ہم نے ہمیشہ تاریخ کو سر پر چڑھا کے رکھا اور تاریخی شعور، تاریخی ارتقاء، تاریخی تصورات کے نام سے بے شمار مقالے لکھے، بے شمار جھوٹ پھیلائے۔ کسی نے جغرافیائی شعور کی بات کی، نہیں کی۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ کوئی جغرافیے کی اہمیت کو نہ سمجھتا ہے نہ اس کے حوالے سے کوئی سوچتا ہے۔ ملک تقسیم جغرافیے کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ملک ٹوٹتے جغرافیے کی وجہ سے ہیں۔

جغرافیہ ہی وہ اٹل حقیقت ہے جس کی بنیاد پر تاریخ حرکت کرتی ہے بلکہ تاریخ کو جگہ ملتی ہے۔ جگہ نہ ملے تو تاریخ کیا کرے گی۔ اب ایسے میں رضوی صاحب کے فلیٹ میں محفل کے شرکاء آنے شروع ہوئے۔ رضوی صاحب سب کو دروازے سے لے کر آ رہے تھے۔ جتوئی صاحب تھے، بی بی سی کے دو چار لوگ تھے اور دو تین لوگ اس فلائٹ کے بھی تھے جو میرے ساتھ مختلف جیلوں سے لائے گئے تھے۔ اب رضوی صاحب کا دسترخوان سج گیا تھا۔ شیواز ریگل اور بلیک لیبل چل رہی تھی اور باتوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رضوی صاحب کچن اور پارٹی لاؤنج کے درمیان متحرک تھے۔ گلاس ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ گھوم پھر کر سارے دوستوں اور کھانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مجھے وہ گول مٹول، خوبصورت شخصیت اچھی محسوس ہو رہی تھی کہ جو پارٹی کو ہر طریقے سے اپنے لئے خوبصورت بنانے میں مصروف تھی۔ میں نے ان سے پوچھا ''آپ کچن کا کام میرے حوالے کر دیں۔''

''آپ کو معلوم نہیں میری زندگی اس وقت کچن میں ہے۔ میں محفل سے زیادہ اپنے کچن کی مصروفیت سے لطف اُٹھا رہا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔ ابھی آپ کو شاعری بھی سنانی ہے۔ اب جو باتیں میں سن رہا تھا وہ ملی جلی تھیں۔ اگر ان باتوں کو آواز کے گراف سے لکھا جائے تو اس طرح کا ایک گراف بن سکتا ہے:

''بھٹو کو امریکہ نے مروایا۔ وہ جو گاڑی میں خط لہراتے ہوئے پنڈی کی سڑکوں پر نکلے تھے۔''

''بھٹو کا عدالتوں نے Judicial Murdar کیا ہے۔''

''فوج نے بھٹو کو مارا ہے۔''

''اُدھر تم اِدھر ہم نے مروایا ہے۔''

''ضیاء الحق کے خلاف فوج میں سے بغاوت تیار کرنی ہوگی۔''

''بھٹو کو سعودی عرب بچا سکتا تھا۔''

''بھٹو کو اس کی ضد نے مروایا ہے۔ فوج سے معافی مانگ لیتا۔''

''بھٹو کو مرنے کا شوق تھا۔ ہیرو اپنی بڑی غلطی سے نہیں چھوٹی سی غلطی سے مارا جاتا ہے۔''

''شیکسپیئر کے تمام ٹریجک ہیروز کی طرح بھٹو بھی اپنی تقدیر کا شکار ہوئے۔''

''ضیاء الحق کو کلہاڑے کے وار سے میں دو ٹکڑے کروں گا۔ میں لندن سے سرنگ لگا کر جی ایچ کیو چلا جاؤں گا۔''

''بھٹو کو احمدیوں نے مروایا ہے۔ اس نے انہیں غیر مسلم قرار دلوایا تھا۔''

''بھٹو کو شرابیوں کی آہ مار گئی۔ شراب پر پابندی کیوں لگائی۔''

''پاکستان قائداعظم نے کیوں بنایا، فوج کے لئے؟''

''یار تم پاگل ہو، پاکستان قائداعظم نے نہیں بنایا۔''

''پاکستان سے پہلے ہندوستان تقسیم ہوا جس کے نتیجے میں گورے نے پاکستان بنادیا۔''

''پاکستان نہ گاندھی نے بنایا نہ جناح نے۔ پاکستان صرف ہندو اور گورے نے بنایا ہے۔''

''پاکستان نے بنگالیوں کو مروایا۔ بہاریوں کو مروایا اور بلوچیوں کو مروایا۔''

''او یار شراب کا مزہ لو، یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ کوئی عورت کی بات کرو۔''

''یار کوئی لندن میں موج مستی کی بات کرو۔''

''سنا ہے اِدھر دیسی عورت بھی مل جاتی ہے۔''

''جو مانگو ملتا ہے میرے یار۔''

''یار جہاں افریقی لڑکی ملتی ہے مجھے لے جاؤ۔ سنا ہے سوڈا لر ریٹ ہے۔''

''وہ افریقی تیرے دھوئیں نکال دے گی، تجھے پھس کر دے گی۔''

''سنا ہے اِدھر چھ فٹ کی لڑکیاں ملتی ہیں اور عربی ان کو لے جاتے ہیں۔''

''اویار اب اپنی اوقات دیکھ۔ قد کو رکھ ایک طرف۔ سنا ہے چار فٹ کے بنگالی لڑکی کا عرق نکال دیتے ہیں۔''

''اب بات ذرا لندن کی ہو جائے۔ ادھر شراب مہنگی ہے۔''

''پاکستان میں تو ہے ہی نہیں۔''

''ہم بی بی سی سے جو خبر نکالتے ہیں وہ انڈیا پاکستان میں تسلیم کی جاتی ہے۔''

''اس وقت صرف بی بی سی دنیا پر راج کر رہا ہے۔''

''بی بی سی کب تک پاکستان کو بچائے گا۔''

''اگر بی بی سی نے پاکستان بچانا ہے تو پھر انگریز سے کہے کہ ہندوستان کو کیوں تقسیم کیا تھا۔''

اس طرح کی بھنبھناتی آوازیں آرہی تھیں اور جام سے جام اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔ میں محض ایک تماشائی تھا کہ لندن میں پاکستانیوں کا یہ اجتماع احمد رضوی نے کس طرح ترتیب دیا تھا۔ کچھ تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ جلاوطنوں کو بلایا تھا۔ ایسے سیاست دانوں کو بلایا جو چاروں صوبوں سے تعلق رکھتے تھے اور بھٹو صاحب کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ دو چار عوامی نیشنل پارٹی کے بھی تھے اور بلوچستان سے بھی تھے۔ یہاں مستقبل کی مخلوط حکومت بنانے کا خواب بھی ترتیب پا رہا تھا کہ شاید آنے والے وقتوں میں پنجاب یا سندھ کی کسی بھی جماعت کو چاروں صوبوں میں اکثریت حاصل نہ ہونے دی جائے گی کہ حکومت سازی کا کھیل اب جن کے ہاتھوں میں آ چکا تھا وہ شطرنج کو اپنی مرضی سے مرتب کرنے کا فارمولا لندن کی اس رات میں دریافت کر لینا چاہتے تھے۔ میں نے سنا تھا اور اب تجربے میں یہ بات آ رہی تھی کہ دنیا کے بڑے بڑے فیصلے شراب کے جام پر ہی طے ہوتے ہیں۔ شاید شراب میں یہ تاثیر بھی ہے کہ وہ انسان کو فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ دنیا کے بڑے حکمرانوں نے قبل مسیح وقت سے آج تک جو بھی فیصلے کئے ان میں شراب کی تاثیر شامل تھی اور جو حکمران شراب نہیں پیتے تھے ان سے اکثر غلط فیصلے ہوتے تھے۔

احمد رضوی شریک ہو جاتا تھا اور پھر گلاس لے کر کچن میں چلا جاتا تھا۔ میں گویا باہر سے اندر کی صورت حال دیکھ رہا تھا۔ مستقبل کے پاکستان کو کوئی نہیں جانتا کیا ہوگا لیکن وہاں خوش فہمیوں کی فصل اُگائی جا رہی تھی۔ اب جو آوازیں آ رہی تھیں وہ یہ تھیں:

''جنرل ضیاء الحق مارا جائے گا۔ فوج میں بغاوت ہے۔''

''امریکہ ضیاء الحق کو خود صاف کر دے گا۔''

''اگلی حکومت بھٹو کی بیٹی کی ہوگی۔''

''سر جی آپ کو کون سی وزارت ملے گی۔''

''آئی ایس آئی کراچی کے مہاجروں کو استعمال کرے گی۔''

''کراچی کے مہاجر کیا ہیں؟ کیا ان کی اوقات ہے۔ غریب دو وقت کی روٹی کھالیں بہت ہے۔ سیاست اب کروڑوں میں جا رہی ہے۔''

''کراچی ہیرے کی کان ہے۔ اسے جس نے لوٹ لیا، لوٹ لیا۔''

''او بھائی! پنجاب بڑا بھائی ہے۔ پنجاب فوج میں اوپر ہے۔ بیوروکریسی میں اوپر ہے۔ جو پنجاب چاہے گا وہ ہوگا۔''

''پنجابی بکاؤ مال ہیں۔ جب چاہو خرید لو۔ پھر وہ جو پنجابی کارڈ استعمال کرتا ہے وہ دوسروں کو خرید لیتا ہے۔ بلوچیوں کو، پشتونوں کو، سندھیوں کو۔''

''سندھی نہیں خریدا جاتا۔''

''جانے دو یار۔ ضیاء الحق نے کتنے سندھی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ اب بھی ہیں۔ جونیجو، تالپور، بھٹو کا کزن، جام صادق وغیرہ۔''

''فیصلہ پنجاب نے کرنا ہے۔''

''فیصلہ سرائیکی علاقے نے کرنا ہے۔''

''سرائیکی کون ہیں۔ افغان حملہ آوروں کے آگے کاغذ کی طرح لیٹ جاتے تھے۔''

''اب وہی افغان ملتان کے حکمرانوں میں ہیں۔ انہیں کون کاغذ کی طرح لٹائے گا۔ وہ اب اپنا حصہ لیں گے۔''

''او یار چھوڑو! ایکٹریس بابرہ شریف کو ادھر لاؤ یار، انجمن کو لاؤ، گوری کو لاؤ، لندن میں گوریوں کی اوقات نہیں، اپنے علاقے کا مال چاہیے۔''

''میں تمہیں پاکستانی لڑکیاں ہر رات دے سکتا ہوں۔''

''تم دلال ہو؟''

''نہیں میں دوستوں کی دلالی کو عبادت سمجھتا ہوں۔''

''پھر لاؤ یار کیا مال چھپا کے رکھا ہے۔''

''آپ کے لئے نہیں۔''

''تم نے میری توہین کی ہے۔I will kill you۔''

''چڑھ گئی ہے۔''

''رضوی صاحب کچھ کریں، سب کو نشہ ہو گیا ہے۔''

''گاڑی منگا تا ہوں، سب جائیں۔''

''لندن میں ایسی پارٹی نہیں ہونی چاہئے۔''

''آؤ جتوئی صاحب میری گاڑی پر چلتے ہیں۔''

''مسٹر رضویWe are respectable politicians, so we cant stay۔''

''آپ جا سکتے ہیں۔''

روزانہ لندن میں اس طرح کی پارٹیوں کا یہی انجام ہوتا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک ایسی پارٹی جو لندن کے ایک بڑے تاجر نے ان جلاوطن سیاسی کارکنوں اور سیاسی رہنماؤں کو دی تھی، آخر میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے اور ایک دوسرے پر شراب کے گلاس الٹانے پر ختم ہوئی۔ یہ کلچر اور یہ جلاوطن پاکستان بتا رہا تھا کہ ملک تقسیم در تقسیم ہونے کے لئے آمادہ ہے اور جنرل ضیاالحق اس تقسیم کے لئے آئی ایس آئی اور دیگر اداروں کو استعمال کر کے اسی مشن پر ہے کہ پاکستان نسلوں، زبانوں، علاقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو جانا چاہئے تا کہ اس پاکستان پر کاٹھی ڈالنا آسان ہو جائے۔ بار بار مارشل لاء نہ لگانا پڑے۔ بس ایسا نسخہ ہاتھ آ جائے کہ کسی کو کسی قسم کی طاقت ہی حاصل نہ ہو سکے اور جب بھی اپنی مرضی کی حکومت لانی پڑے تو جیپیں نہ دوڑانی پڑیں۔ بس بیٹھے بیٹھے اپنی مرضی سے حکومت چلتی رہے یا ناکام ہو کر چلتی بنے۔

میں لاہور کو پاکستان کو یاد کیا کرتا۔ میں تو جڑے اکھڑ چکا تھا۔ بیوی بچہ کس حال میں ہو گا۔ اب بچہ دوسرے سال کو عبور کر رہا تھا۔ اسے نہیں پتہ تھا باپ کیا ہوتا ہے۔ وہ ممی کہنا سیکھ گیا تھا۔ ماں نے اسے پاپا سکھانے کی کوشش کی تو وہ گونگا ہو جاتا تھا کہ پاپا سامنے ہی نہیں تھا تو بچے کی نفسیات کے مطابق وہ ایسا لفظ نہیں بول سکتا تھا جس کی شہادت موجود نہ ہو۔ آپ بچے سے کہیں یہ امرود ہے تو امرود کا ہونا ضروری ہے۔ آپ بچے سے کہیں یہ گوبھی ہے تو گوبھی کو اس کے سامنے رکھنا ہو گا۔ اس کی تصویر اس کے خیال میں محفوظ ہو

جائے۔ پاپا کا وجود ہی نہیں تو پاپا کہاں سے اس کی زبان پر آتا۔

لندن میں کئی لندن سمائے ہوئے تھے۔ اس کا ادراک مجھے کچھ کچھ تھا۔ میں لندن میں چارلس ڈکنز کا ''اولیور ٹوئیسٹ'' ڈھونڈ رہا تھا کہ ایف اے میں پڑھا تھا۔ ایک دن مجھے مل گیا۔ کسی نے بتایا کہ ایسٹ لندن جانا ہو تو سنبھل کے جانا۔ وہاں کالوں کا بھی ایک علاقہ ہے اور ایشین کی آبادی بھی ہے یعنی پاکستانی، بنگلہ دیشی، بہاری اور انڈین وہاں ہوتے ہیں۔ میں کالوں سے متعلق اچھی رائے اس لئے رکھتا تھا کہ میں انہیں غلامی سے نکلتے، اُن کے شاعروں کی شاعری میں دیکھ رہا تھا اس لئے مجھے ان سے خوف نہیں آتا تھا اور پھر محمد علی کی باکسنگ نے میرے دل میں ان کے لئے جذبات اور عزت پیدا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ نیلسن منڈیلا، مارٹن لوتھر کنگ اور اس طرح کی ٹی وی سیریز جس میں ''Roots'' ناول کی سیریز بھی شامل تھی، دیکھ چکا تھا۔ میرا ڈر دور ہو چکا تھا۔ سو میں ایک دن اُدھر کو اس لئے گیا کہ میرا پہلا جلاوطنی اپارٹمنٹ اُدھر ہی تھا جس کی چابی میرے پاس تھی اور میرے کچھ بے معنی کپڑے اُدھر پڑے تھے یا شاید جوتے بھی تھے۔ میں آوارہ اور بے کار گھومتے ہوئے، انڈر گراؤنڈ ریل سے اِدھر سے اُدھر نکلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ یہ کوئی شام کے قریب کا وقت تھا، میں انڈر گراؤنڈ ریل سے نکلا اور مجھے بہت دور تک پیدل چلنا تھا۔

جلد ہی میں اس علاقے میں تھا جہاں سے سیاہ فام آبادی کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ میرے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے میں بے دھڑک جا رہا تھا۔ ویسے بھی دن کا وقت تھا۔ مجھے وہاں لندن کے مختلف علاقوں کی صفائی کے مقابلے میں گندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ سب رہنے والوں کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ ایک جگہ سے میں گزرا تو آواز آئی:

''اے You need a girl......''

میں سمجھ گیا۔ پھر اسی آواز نے کہا ''You need any thing to comfort۔''

پھر ایک اور آواز آئی ''Need any drug۔''

اب میں سمجھ گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں چلتا رہا کہ ایک چھ فٹ کا کالا میرا رستہ روک کے آ گیا ''Oh man..... don't need any thihg۔'' میں راستہ کاٹ کے نکل گیا۔ اس نے مجھے پھر کاٹا اور روکا ''Aay you۔'' وہ کالا میرے سامنے چاقو نکال کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا ''کیا چاہتے ہو؟'' وہ بولا ''ہم سے ڈرگز لو یا لڑکی لو۔'' یہ اس نے انگریزی میں کہا۔ میں نے کہا ''میں تو ایک شاعر اور رائٹر ہوں۔ میں یہاں ان جلاوطن افریقی شاعروں اور ناول نگاروں کو تلاش کر رہا ہوں جو تم لوگوں کی آزادی

کے لئے مسلسل لکھ رہے ہیں اور تم بے خبران کو مایوس کر رہے ہو کہ تمہارا امیج ایک گینگسٹر اور لٹیرے کا ہو چکا ہے۔اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا کہ ایک رائٹر جلاوطن ہو کے تنزانیہ سے آیا ہے۔وہ اپنی غلامی کی تاریخ سے بھاگ کے آیا ہے۔وہ انگریزی پڑھ رہا ہے۔اس کا نام عبدالرزاق گرناہ ہے۔سنا ہے وہ یہاں رہتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے میں نے اس کی توجہ ہٹا دی تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔بس یہی لمحہ تھا کہ میں بھاگ کھڑا ہوا اور اس علاقے سے بمشکل ڈیڑھ سو پاؤنڈ بچا کے نکل گیا۔عبدالرزاق گرناہ کون تھا،کون نہیں تھا، مجھے اس کا قطعی پتہ نہیں تھا۔صرف میں ایک برطانوی اخبار میں اس نام کے رائٹر کا نام پڑھا کہ کوئی بھاگ کے آیا ہے......اور پناہ لے چکا ہے۔

اب میں وہاں سے نکل چکا تھا اور پھر میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی علاقے میں آ گیا تھا کہ لندن تو تقسیم ہو چکا تھا عربوں، ایشین اور روسی بلاک میں...... یہ علاقہ ایسٹ لندن کہلاتا تھا۔یہ لندن کا سب سے غریب علاقہ سمجھا جاتا تھا اس لئے گلیوں اور سڑکوں پر کہیں کہیں گندگی کا احساس ہوتا تھا۔یہاں یورپی اقوام کے باشندے یا لندن کے گورے آباد نہیں تھے۔سیاہ فاموں کے علاقے سے ذرا فاصلے پر بنگلہ دیشی باشندوں کا علاقہ تھا۔میں اُدھر سے گزر کر اس علاقے میں آ گیا تھا جہاں جہاز اغواء ہونے کے بعد جیلوں سے پاکستانی سیاسی قیدیوں کو یہاں لا کر بسایا گیا تھا۔یہاں مجھے کہیں کہیں چارلس ڈکنز کے "اولیور ٹویسٹ" کی گلیوں کا گمان گزرنے لگا تھا۔جب میں پاکستانی علاقے میں آیا تو مجھے محسوس ہوا میں پاکستان میں کسی محلے کے اندر گھوم رہا ہوں۔کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی انہی پاکستانیوں کی تھیں۔میں تلاش میں تھا کہ میرا اپارٹمنٹ جسے میں چھوڑ تو نہیں چکا تھا، کبھی دوبارہ رہنا پڑ سکتا ہے اس لئے اس کی چابیاں میرے پاس تھیں۔ابھی میں اس علاقے سے مانوس ہو رہا تھا کہ ایک جانا پہچانا چہرہ سامنے آیا۔دھیان دیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ کوئی بھٹو صاحب کا ایم پی اے سردار مظہر علی خان تھا جو اپنے خاندان کے ساتھ آیا تھا یا اہل خانہ بعد میں آئے تھے۔اس نے بھی مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔اب بات آسان ہو گئی۔اس نے دعوت دی کہ یہاں جلاوطن ترقی پسند انقلابیوں کا ایک ضروری اجلاس ہو رہا ہے، جس میں کچھ فیصلے کئے جانے ہیں کہ اب ہم یہاں آزاد ہیں اور ملک کو فوجی آمریت سے بچانے کے لئے کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔سب سے بڑھ کر بی بی سی کی نشریات ہمارے پاس ہیں۔ہم اس کے ذریعے اپنے ملک کے غلام عوام تک حوصلے کا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔میں اور کیا چاہتا، میں فوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔ایک اپارٹمنٹ ظاہر ہے سینٹرل لندن میں

رہنے والے جتوئی صاحب یا رضوی صاحب جیسا نہیں تھا، وہاں ایک صاحب سرائیکی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، لاشاری صاحب کہلاتے تھے، یہ ان کا اپارٹمنٹ تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو تقریباً ہم ہی آخری لوگ تھے۔ مختصر سا کمرہ اور ساتھ کا حصہ کہ اس کمرے سے پیوستہ تھا، بھر چکا تھا۔ اب جو وہاں سٹڈی سرکل شروع ہوا تو اس میں لاہور، کراچی اور راولپنڈی کے بائیں بازو کے سبھی گروپوں کے نمائندے موجود تھے۔ مجھے پھر سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' یاد آ گیا۔

پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کی ساری بحثیں اب یہاں دہرائی جا رہی تھیں۔ مارکسسٹ، سوشلسٹ اور جدید مارکسی فلسفوں کے کئی برانچوں کے دانشوروں کے اقوال کو دہرایا جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پاکستان گویا کوئی ایسی تجربہ گاہ ہے جس میں ان سب کا سیاسی نظریات اور فلسفوں کو ٹیسٹ کیا جانا دنیا کے لئے بے حد ضروری ہے اور ایسا ہی ہو رہا تھا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد اب پاکستان ہی وہ واحد Myth تھی جس کی معنویت کا تعین ہونا باقی تھا کہ بنگالی تو اپنی دھرتی کے ساتھ اپنے کلچر اور اپنی اکائی سے جڑنے کے لئے تیار بھی تھے اور جدوجہد بھی کر چکے تھے۔ رہ گئے بہاری، تو ان کو انڈیا نے بھی بے یار و مددگار چھوڑ دیا کہ یہ انڈیا کے حق میں جاتا تھا اور پاکستان نے بھی ان کی کوئی مدد نہ کی کہ وہ غلط طریقے سے بہار سے کاٹ کر مشرقی پاکستان میں بسائے گئے تھے اور انہی کی بنیاد پر محمد علی جناح نے ڈھاکہ میں اردو کو قومی زبان بنانے کا اعلان کیا تھا جہاں سے مشرقی پاکستان میں دو زبانوں کا ٹکراؤ پیدا ہوا۔ اور یہ بات بھی سب جانتے ہیں بنگالیوں نے اردو کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کی بے شمار سچائیاں موجود ہیں۔ 1966ء کے آس پاس ڈھاکہ میں اردو سینما کا سٹوڈیو حرکت میں آیا اور 1971ء تک بیالیس (42) فلمیں اردو کی مغربی پاکستان میں ریلیز ہوئیں اور سب نے بہت بڑا بزنس کیا کہ مغربی پاکستان کے فلم بنانے والے بالکل فارغ تھے اور بمبئی کے شاگردوں کے بھی شاگرد تھے جو نوابوں، جاگیرداروں اور امراء کی زندگی کے گلیمر میں گرفتار تھے۔ اس لئے پاکستان کی فلم انڈسٹری چلی ضرور کہ عوام کو تفریح چاہئے تھی اور پھر وہ سب جادو بکھرنے لگا اور پنجابی فلم کے سینما نے معصومیت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے بالآخر تشدد اور لاقانونیت کے کلچر پر آ کر دم توڑا۔ بیچ میں مشرقی پاکستان کے سینما نے موسیقی اور حقیقی کہانیوں کے ذریعے سینما کو بدلنے کی کوشش کی۔ 1971ء میں یہ سفر تمام ہو گیا اور آج لندن میں ہم دو مختلف علاقوں میں تقسیم دکھائی دے رہے تھے۔

اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں سیاسی فلسفوں کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ ترقی پسند تحریکوں کی

ناکامیوں کے اسباب پر دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ پاکستان میں فوجی حکمرانوں کے تسلسل کی وجوہات کو پنجاب کے کھاتے میں ڈالا گیا۔ پنجابی وِلن بن کر سامنے آیا جس نے سندھی وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکایا۔ سندھی وزیراعظم کو برطرف کیا۔ پنجابی فوج باقی صوبوں کو غدار سمجھتی ہے اور وہ پورے ملک کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات میں دنیا سے مدد مانگنے کے لئے کئی تجاویز آئیں۔ ایک تجویز تھی کہ فوراً روسی حکومت سے اپیل کی جائے کہ اپنے نظریات کی حفاظت کے لئے پاکستانی عوام کی مدد کے لئے دنیا کو جگائیں اور پاکستانی عوام کو بدترین فوجی آمروں سے بچائیں۔

کسی ایک نے کہ کبھی لائلپور حال فیصل آباد میں کسان مزدور پارٹی کا ورکر بھی تھا اور سٹڈی سرکل بھی چلاتا تھا، ذرا بہتر دلائل کے ساتھ سامنے آیا کہ انقلاب کے لئے نیچے سے جدوجہد ضروری ہے اور اگر روس یا روسی بلاک کے عُمال کو بھی پڑے تو وہ کیا کرلیں گے۔ بنگلہ دیش کیسے بنا کہ بنگالیوں نے عوامی سطح پر آپ کے پنجاب کے خلاف تحریک چلائی اور پھر انڈیا نے اس کا فائدہ ایسے اٹھایا جیسے مسلم لیگ نے جب پاکستان بنانے کے لئے تحریک شروع کی تو اس کا فائدہ برطانیہ نے اٹھایا اور ہندوستان کو تقسیم کر دیا۔ ہماری غلطیوں کا فائدہ کسی نے تو اٹھانا ہوتا ہے۔

اب ایسے میں ایک اور تجویز آئی کہ لندن کے ہائیڈ پارک میں کسی ورکر سے خودکشی کی کوشش کراتے ہیں۔ جونہی وہ خودکشی کرے گا، ہمارے لوگ کمبل لے کر اسے دبوچ لیں گے۔ سٹوری بن جائے گی۔ بی بی سی اسے نشر کرے گا۔ پورا پاکستان اور اس کی اسٹیبلشمنٹ الٹ جائے گی۔ اس پر کسی نے بتایا کہ بھٹو صاحب کی پھانسی پر کئی خودکشیاں ہوئی تھیں اور کسی کو کوئی نہیں بچا سکا تھا۔ قومی حافظہ تو بس اتنا سا ہی ہوتا ہے ہمارا۔

اب ایک نابغہ روزگار نے ایک آئیڈیا یہ دیا کہ ہمیں لندن میں پاکستان کی جلاوطن حکومت بنا لینی چاہئے۔ اب اس پر سب چونکے کہ یہ انوکھا آئیڈیا سامنے آیا ہے۔ اب اس پر زوردار بحث ہوئی۔ ساتھ میں میزبان نے چھوٹی پیالیوں میں کچن سے چائے کی پتیلی تیار کر کے کامریڈی چائے بھی سب کے ہاتھوں میں پہنچا دی۔ اس پر دنیا کے مختلف ملکوں میں جلاوطن حکومتوں کے قیام کے واقعات کو دہرایا گیا جس میں افریقی، عرب اور ایشیائی ممالک شامل تھے جہاں بادشاہت اور آمریت کے خلاف جلاوطن حکومتیں بنائی گئی تھیں اور علامتی حکومت کا تصور آیا تھا۔ اس پر بہت جذباتی باتیں ہوئیں۔ بیٹھے بیٹھے صدر پاکستان، وزیراعظم پاکستان، چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وفاقی کابینہ بنا دی گئی۔ مجھے بھی وزیر تعلیم کا عارضی

چارج دینے کی منظوری ہوگئی۔ ایسے میں اُن سندھی اور سرائیکی علاقوں کے جاگیرداروں کو اس جلاوطن حکومت میں شامل نہیں کیا گیا تھا جیسے کہ جتوئی صاحب، رضوی صاحب اور لغاری صاحب لندن میں آچکے تھے۔ انہیں اس جلاوطن حکومت میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ گویا درمیانے اور نچلے طبقے پر مشتمل ایک آئیڈیل پاکستان کی جلاوطن حکومت تھی، گویا مستقبل میں پاکستان کو جمہوریت دینے کا یہ ایک سچا خواب ہوسکتا تھا جو سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں دیکھا تھا۔ وہ خواب تو پھر کئی سال چلا اور کم سے کم ادب، فلم اور مصوری میں تو اس خواب نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ یادوں کا خزانہ، فکشن اور شاعری کا انمول ذخیرہ، لیکن یہ جلاوطن حکومت کن انڈوں پر بیٹھنے جارہی تھی، اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ کیا انڈے تھے بھی کہ نہیں۔ اس جلاوطن حکومت نے ہائیڈ پارک کے اس کارنر میں جنم لینا تھا جہاں جو کوئی بھی حکومتوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے تو نکال سکتا ہے۔ وہاں میں نے دو دفعہ دیکھا ڈھائی لوگ کھڑے ہوتے تھے۔

ایسٹ لندن میں یہ ڈرامہ دیکھنے کے بعد میں وہیں کسی کے ہاں وہسکی پی کر انقلاب کا خواب دیکھنے کے لئے سو گیا تھا۔

....

پاکستان کی جلاوطن حکومت ایسٹ لندن کے چھوٹے سے فلیٹ میں تشکیل پا گئی۔ بعض جغادری ترقی پسند جو سٹڈی سرکل کا طویل تجربہ رکھتے تھے، اس حکومت کے مینی فیسٹو پر سینگ پھنسا کے بیٹھ گئے تو میرے جیسے بے صبروں نے دہائی دی کہ شام گزرتی جارہی ہے، کچھ دارو اور درد کا سامان ہونا چاہئے۔ ایسے میں گلی کی نکڑ سے دو بوتلیں چاہت کے ماروں نے پیدا کیں اور کچن کے مختصر سے برتنوں کی آزمائش شروع ہوگئی۔ کسی کو گلاس تو کسی کو پیالہ تو کسی کو جگ تو کسی کو اور کچھ نہیں تو پلیٹ نصیب ہوئی۔ کسی نے شراکت میں پینی شروع کی۔ مجھے جو کامریڈ لایا تھا اس کو یہ شراب کچھ ہلکی محسوس ہوئی۔ ویسے بھی مفت کی شراب ہلکی ہی ہوا کرتی ہے۔ ایسے میں دو تین گلاس تو ہم لے ہی چکے تھے اور محفل میں اب اختلاف کی گرمی کے ساتھ اپنے اپنے تعصبات کی گہما گہمی بھی شروع ہوگئی تھی۔ مجھے بمبئی میں ترقی پسند تحریک کے مرکزی ہیڈ کوارٹر کی بے شمار شامیں یاد آ گئیں جو میں عصمت چغتائی، حمید اختر، کیفی اعظمی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کی یادداشتوں میں پڑھ چکا تھا۔ یہ لوگ ایک ایسے احاطے میں رہتے تھے جسے وہاں کی زبان میں چال کہتے تھے۔ مختلف کمروں میں دفاتر، پارٹی پیپر اور دیگر معاملات کے لئے مخصوص کمرے اور پھر جس کے سینگ سمائے وہاں رہ رہا تھا۔ میرا جی، منٹو، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، حمید اختر، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر اور ان کے رومان اور شادیاں بھی اسی میں طے ہو رہی تھیں۔ مجھے ایسٹ لندن کا یہ فلیٹ بھی ایسے ہی لگا جیسے وہاں بھی شام کو شراب کی تلاش میں طرح طرح کی بوتلیں تلاش کی جاتی تھیں اور سب اپنی اپنی بولی بول کر لیٹ جاتے تھے یا اندھیری کی ٹرین لیتے ہوئے کھسک جاتے تھے۔ اندھیری وہ علاقہ تھا جہاں اکثر فلم سے وابستہ لوگ آڑھے ترچھے، اِدھر اُدھر پاؤں پسارے ہوئے تھے۔ مجھے بھی یہ فلیٹ ایسا ہی لگا۔

جب مجھے لانے والے کامریڈ نے اشارہ کیا کہ نکلتے ہیں تو ہم دونوں وہاں سے نکلے اور نیچے گلی میں آئے۔ گلی سنسان تھی۔ ہمیں وہاں مقامی پب یا شراب خانے کی تلاش تھی۔ ایک موڑ پر ایک پب نظر

آیا۔ اس کا نام تھا "Three Rabbits"۔ ہم تین خرگوشوں کے مہمان ہوئے۔ وہاں کچھ پاکستان اور اِدھر اُدھر کے لوگ تھے۔ ماحول سوگوار تھا کہ یہ کوئی ویک اینڈ نہیں تھا۔ ہم دونوں نے گزری محفل پر بک بک کی اور اپنی اپنی پسند کے دو دو مہنگے ڈرنک منگوائے اور ہماری گفتگو جلاوطن حکومت کے رومانوی تصور تک محدود رہی۔ وہاں سے نکلے تو اب مجھے واپس سنٹرل لندن جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں مل سکتا تھا تو میں نے اپنی جیب میں اپنے جلاوطن اپارٹمنٹ کی چابی تلاش کی جو مل گئی۔ اب چابی تو مل گئی، اپارٹمنٹ ملنا بھی ضروری تھا کہ سلطنت برطانیہ کے تو ہم غلام رہے ہی تھے، اب ایک دوسری غلامی میں آچکے تھے جو پہلی غلامی ہی کی توسیع تھی۔ اب میں اس علاقے میں اپنا علاقہ اور اپارٹمنٹ تلاش کر رہا تھا کہ ایک کھمبے کیساتھ ایک گوری عورت مخصوص لباس میں کھڑی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ رات کے وقت جب کھمبے سے کوئی لڑکی یا عورت میک اپ کئے مخصوص لباس مطلب یہ کہ شوخ رنگوں کا مختصر چولی چڈی کا ملاپ اور پلاسٹک کے چمڑے کے لانگ شوز وغیرہ کے ساتھ دکھائی دے تو سمجھ لو وہ گاہک تلاش کر رہی ہے۔ اب ایسے میں مجھے سعادت حسن منٹو کا افسانہ "شکاری عورتیں" یاد آ گیا۔ وہ لاہور کی شکاری عورتیں تھیں جو رات کو نہیں دن میں بس سٹاپوں اور تانگوں میں بیٹھ کر کالے برقعوں میں گاہک تلاش کرتی تھیں۔ اب اتنا تو یورپ اور پاکستان کا فرق ہونا چاہیے۔

میں نے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گوری تھی۔ قد پانچ فٹ سے نکلتا ہوا اور اس کے چہرے کے نقوش بھی اُبھرے ہوئے تھے لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ میں چار پانچ پیگ لئے ہوئے تھا اور اپنا فضول سا گھر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے مجھے گزرتے ہوئے آواز دی:

"I need only thirty pounds"۔

میں رک گیا اور اس کے پاس آیا۔ میں اس کے قریب آیا تو مجھے عورت کی خوشبو ایک عرصے بعد محسوس ہوئی۔ یہ اس کے پرفیوم کی خوشبو نہیں تھی۔ یہ خالص عورت کی خوشبو تھی۔ وہ ایسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں پولیس کم ہی ادھر کا رخ کرتی تھی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی اس شام کی کوئی مجبوری محسوس ہوئی ورنہ پچاس سو پاؤنڈ کا میں نے سن رکھا تھا۔ جب سے لندن آیا تھا کسی نے مجھے اس طرح کی عورتوں سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا، نہ ہی میں کبھی ان مقامات سے گزرا جہاں یہ کھمبوں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔ سنا تھا عام طور پر بارہ بجے رات کے بعد شرابیوں اور کلب سے جواء ہارنے والوں کے لئے یہ سڑک پر آتی ہیں۔ یہ قریبی گلیوں میں کہیں موجود ہوتی ہیں۔ پولیس کی گاڑیوں کی انہیں بہت پہچان ہوتی

ہے۔ دیکھتے ہی بغلی گلیوں میں روپوش ہو جاتی ہیں۔

مجھے اس گوری کا آگا پیچھا کچھ معلوم نہیں تھا مگر اس کی گرمائش مجھے محسوس ہونے لگی۔ میں تو پاکستان آنے کے بعد عورت کی گرمی سے محروم چلا آتا تھا۔ اب جو اسے دیکھا تو اس کے بھرے بھرے ہونٹوں نے دہائی دی کہ مسافر اگر دو یا تین پیگ لے چکے ہو تو میری مجبوری کا فائدہ بھی نہیں اٹھاؤ گے۔ اب مجبوری کیا تھی؟ اس کا نہ تو میں پوچھ سکتا تھا نہ پوچھنا مناسب تھا۔ میں نے اسے کہا ''تم کہاں سے ہو؟'' اگرچہ یہ بے معنی سوال تھا پھر بھی اس نے جواب دے دیا ''I am Irish۔'' مجھ جواب مل گیا کہ برطانیہ نے آئرلینڈ کے ساتھ کیا کیا اور آئرلینڈ نے کتنے بڑے شاعر، ادیب اور ناول نگار پیدا کئے، مصور اور میوزک میں بھی ان کا کیا کردار رہا۔ میں نے فوراً اس سے کہا آ جاؤ میرے ساتھ اور پھر میں اپنے اس اپارٹمنٹ کی تلاش میں اسے ساتھ لے کر نکلا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا میں کون ہوں؟ اس کے چلنے سے آواز آ رہی تھی جو اس کے جوتے کی ایڑی سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اب محفوظ تھی کہ اگر پولیس آ بھی گئی تو وہ اسے گرفتار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ایک گاڑی سائرن بجاتی آئی۔ وہ پولیس کے بجائے ایمبولینس نکلی۔ اب میں نے اپنا پتہ جیب سے نکالا اور اسے دکھایا کہ کیا تم یہ سٹریٹ اور یہ نمبر دیکھ کر بتا سکتی ہو ہم کہاں ہیں۔ اس نے پہچان لیا اور کہا پچھلی سڑک پر تمہارا اپارٹمنٹ ہے۔ میں نے کہا تو پھر مجھے لے چلو۔ اس نے مجھے میرے اس اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے سامنے لا کھڑا کیا جو مجھے سلطنت برطانیہ نے ترس کھا کر الاٹ کی تھی۔ ہم دونوں اوپر گئے۔ ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں جیسے کہ برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم کے قیدیوں کے لئے تعمیر کی ہوں گی اور قیدی بھی کون ہوں گے؟ روسی، جرمن اور جاپانی وغیرہ......

اب مجھے محسوس ہوا کہ یہاں کون کون رہ چکا تھا۔ تصور میں یہ سب کردار گھوم گئے۔ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد اپنا فلیٹ کھولا، بتی جلائی، کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی بوسیدہ پرانا فلیٹ۔ ایک فضول سا بیڈ، کچن زنگ آلودہ، برتن پرانے گھسے پٹے۔ اب میں کیا کر سکتا تھا، وہ لڑکی یا عورت ایک بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں ایک خوفزدہ آدمی تھا کہ میں اتنے عرصے بعد ایک لڑکی کے پاس جا رہا ہوں تو میرا کیا ادھیکار ہے ایک عورت پر۔ میں تو گنوایا ہوا ایک مرد ہوں تو پھر لندن کی ایک لڑکی جو معلوم نہیں کتنے جنم کی پیاسی ہو، وہ مجھ سے کیسے اپنی پیاس بجھا سکتی ہے۔ اس نے دیکھا اور پوچھا ''تم یہاں رہتے ہو؟''

''نہیں میں نہیں رہتا۔ صرف آج ادھر آیا تھا۔ یہ مجھے سرکار نے الاٹ کیا تھا۔ کچھ دن رہا۔ اب کسی کے ساتھ سنٹرل لندن میں رہتا ہوں۔''

''آج یہاں رہو گے یا صرف میرے لئے آئے ہو۔''

''آج میں یہاں رہوں گا۔ بس سونا ہی تو ہے۔ پھر صبح نکل جاؤں گا۔''

پھر اس نے اپنی پوزیشن میرے بستر پر سنبھالی اور اس نے کہا''میں پہلے اپنی قیمت وصول کرتی ہوں، شرابی اکثر دھوکہ دیتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا تھا۔ میں بھی شرابی تھا لیکن ظاہر ہے میں شاعر بھی تھا۔ تو میں نے اسے تیس پاؤنڈ کی جگہ پچاس پاؤنڈ نکال کے دیئے اور کہا تم چاہو تو اِدھر سو جاؤ، صبح چلی جانا اور چاہو تو چلی جاؤ۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا کہ میں تم سے چیریٹی نہیں مانگ رہی۔ تم میرے Customer ہو جیسے تم میرے سٹور سے کچھ لینے آئے ہو۔ تم کچھ لو گے تو میں یہ پیسے لوں گی۔''

''میں عورت کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھاتا۔''

''میں تمہاری مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں کیونکہ تم اکیلے ہو۔''

''میں نے ایک سال سے عورت کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

اب میں نے دیکھا تو اس نے اپنی چولی اُتاری، بریزیئر میں اس کی چھاتیاں اور اس کے جسم کا اوپر کا حصہ مجھے دکھائی دیا۔ یہ تو کوئی مصور ہی بتا سکتا ہے کہ عورت کے شانے، گردن، چہرہ اور پھر چھاتیاں کس تناسب سے ہوں تو وہ خوبصورت کہلا سکتی ہے۔ اس وقت اتنا سوچ نہیں سکتا تھا۔ بس وہ منظر نگاہ میں جامد ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ پھر اس نے اپنی ناف سے نیچے کی میکسی اتاری، نیچے مہین جالی کا جانگیہ تھا جسے وہ ایک جھٹکے سے اتارنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اب میں نے اس کے جسم کو دیکھا۔ اس نے ایک محبوبہ کی طرح میری قمیص کے بٹن کھولنے شروع کئے۔ پھر اس نے لائٹ بجھا دی۔ باہر سے روشنی کی ایک لکیر اس کے بدن کے ابھار کو روشن کر رہی تھی۔ اب میرے لئے خوامخواہ مردانگی کا فضول سا مظاہرہ کرنے کا چیلنج سامنے تھا جس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے ظاہر ہے لندن میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر روشنی کی لکیر کو تیرتے دیکھا۔ میں اس میں ڈوبنا چاہتا تھا۔ جونہی میں نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھنا چاہے، اس نے منع کر دیا کہ یہ صرف میرے بیٹے کے لئے ہیں۔ باقی جسم تمہارا ہے۔ میرے اندر جو آندھی تیزی سے چلی تھی، اچھا ہوا وہ کچھ آہستہ ہو گئی۔ میں نے اس کی گردن پر خفت مٹانے کے لئے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کے جسم کا نمکین ذائقہ

محسوس ہوا تو میرے ہاتھ اس کی کمر میں تھے۔ معلوم نہیں وہ یہ جملہ کہ یہ ہونٹ صرف میرے بیٹے کے لئے ہیں، کتنی دفعہ کہہ چکی ہوگی اور اس کے اس جملے کی ادائیگی کی ٹائمنگ بھی شاید یہی ہوگی۔ اب میں نے محسوس کیا کہ جسموں کی اپنی انانیت اور حکومت ہوتی ہے۔ وہ کسی محبت نام کے فریب سے آشنا نہیں ہوتے۔ کسی عشق کے بے معنی فلسفے کے تابع نہیں ہوتے۔ جب جسموں کا ملاپ ایک ازلی تجربہ ہے تو پھر اسے کسی ایسے دھوکے کی قطعی ضرورت نہیں ہونی چاہئے جسے شاعروں سے لے کر صوفیاء نے ایک آفاقی اور نایاب دائمی انسانی تجربہ بنا دیا۔ اس رات میں نے محسوس کیا کہ مردانہ انانیت اور غیرت بے معنی الفاظ ہیں۔ عورت ہی شروع کرتی ہے اور عورت ہی ختم کرتی ہے۔ آخر میں مردانگی کی سند بھی عورت ہی دیتی ہے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ میرا سانس نہ پھولے۔ میں جذبات کو روک روک کر چل رہا تھا۔ وہ مجھے جان چکی تھی کہ اس کا تجربہ کہیں زیادہ تھا اس لئے اس نے مجھے خوامخواہ اکسانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا مرد کی اوقات کتنی ہے اور کیا ہے اس لئے وہ اب یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہے جبکہ معاملہ الٹ تھا۔ میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ ایک جھٹکے اور سسکی سے مجھے فارغ کر سکتی تھی۔ شاید وہ یہ نہیں چاہتی تھی اور اس طرح اس نے اس تجربے کو کرافٹ کیا کہ جنسی تجربہ کرافٹ کرنا پڑتا ہے جیسے افسانہ یا ناول کرافٹ کیا جاتا ہے، جیسے موسیقی کی سمفنی کو موسیقار کرافٹ کرتا ہے۔ گویا تمام فنونِ لطیفہ بلکہ فلسفہ اور ادب ایک طرح کی Craft's man ship کا کمال ہے۔ تو میں نے یہ تجربہ کیا کہ جنسی تجربہ اگر فن کارانہ طریقے سے پرفارم کیا جائے تو وہ بھی ایک طرح کا آرٹ ہے۔ اب میں نے راسپوٹین، ہیولاک ایلس اور اس طرح کے نامی گرامی جنس پرستوں کو نہیں پڑھا تھا البتہ میں اتنا جانتا تھا کہ ہندوستان کے تمام راجوں، مہاراجوں، نوابوں، جاگیرداروں، ٹھاکروں اور وڈیروں نے اپنی جنسی بالادستی کے لئے حکیم، وید، جڑی بوٹیوں اور خاندانی نسخوں کے سینہ بہ سینہ علم کے ماہرین سے لے کر ماہرین جنسیات کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس سب کے باوجود اکثر واقعات میں رانی، ملکہ، شہزادی، ٹھاکرانی، وڈیری اور نواب زادی کسی غلام یا کسی محرم یا کسی عاشق یا کسی دوسری ریاست کے شہزادے کے ساتھ بھاگ جایا کرتی تھی۔ اب میرے پاس مردانہ بالادستی کا کوئی سامان کیوں ہوتا کہ میں تو سڑک پر پکڑا گیا تھا۔ اب جب وہ مجھ سے الگ ہوئی یا شاید میں الگ ہوا تو اس نے صرف اتنا کہا "You are a perfect man"۔

اب اس سے میری اَنا کو تو تسکین مل گئی لیکن میں وسوسے میں پڑ گیا کہ کیا یہ اس کا ٹریڈ سیکرٹ ہے۔ کیا یہ ہر مرد کو اس طرح سند جاری کرتی ہے اور مردانگی شام کے لئے خود کو مہیا کر دیتا ہے۔

میں تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ میرے مکمل انسان ہونے کی سند کے پیچھے شام کی وہ وہسکی ہے جو میں وقفے وقفے سے لے رہا تھا اور اس نے میرے جسم اور جذبات میں ایک تناسب قائم کر دیا تھا۔ باقی تو محض محبت کا ایک فریب تھا جو جھونکے کی طرح گزر گیا۔ اب وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''کیا تم یہاں نہیں رہتے۔''

''ہاں میں آج ایک عرصے بعد یہاں آیا ہوں۔ میرا ایک ساتھی بھی تھا۔ وہ بھی اب یہاں نہیں رہتا لیکن یہ حکومت نے ہم دونوں کے نام کر رکھا ہے۔''

''اگر تم چاہو تو میں اس کا کرایہ دے سکتی ہوں؟''

''کیا مطلب؟ تم یہاں رہ لوگی۔''

''ہاں میں ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ ایک نرس کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں۔''

''پھر پرابلم کیا ہے؟''

''وہ نرس ہسپتال ہی میں گاہک پھنسا لیتی ہے۔ وہ میری طرح کھمبے کے ساتھ لگ کر دھندا نہیں کرتی۔ اس کا دھندا مجھ سے زیادہ بھی ہے اور عزت دار بھی ہے۔''

''تو تمہیں اس سے اس بات پر پرابلم ہے۔''

''نہیں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو سکول میں ہے اور وہ سکول یہاں سے اگلی گلی میں ہے۔''

''تو اب تم کہاں رہتی ہو۔''

''ہمارے گھروں کا فاصلہ کھمبوں سے بتایا جاتا ہے۔ میں جس کھمبے پر کھڑی تھی اس سے بارھواں کھمبا میرے گھر کی گلی کو لگتا ہے۔''

''تمہیں نرس سے اور کوئی پرابلم نہیں۔''

''وہ نرس کبھی کبھی اپنا گاہک فلیٹ میں لے آتی ہے۔ میں نہیں لے جا سکتی کہ میں کھمبے والی جسم فروش ہوں۔''

''وہ بھی تو یہی کام کر رہی ہے۔ پھر وہ کیوں لا سکتی ہے۔''

''وہ بوائے فرینڈ کہہ کر لا سکتی ہے۔ بس یہی میرا اس کا فرق ہے۔''

''تم ایسا کیوں نہیں کر سکتیں۔''

''اس کے پاس نرس ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ بس یہ لباس جو بتاتا ہے کہ

میں کون ہوں۔اس پر مجھے دھندے کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے۔''

''وہ کیا پرابلم کرتی ہے۔''

''میرے بیٹے کو نہیں معلوم میں کیا کرتی ہوں۔ جب وہ کسی کو لاتی ہے تو میرے بیٹے کو معلوم ہو جاتا ہے اندر کیا ہو رہا ہے۔''

''تم نے بیٹے کو کیا بتایا ہے کہ تم کیا کرتی ہو۔''

''وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی میک اپ سٹور پر کام کرتی ہوں جو ''سیون الیون'' کہلاتے ہیں اس لئے مجھے یہ لباس پہننا ضروری ہوتا ہے۔''

''یہ سیون الیون کیا ہے؟ میں نے کئی جگہ سٹوروں پر پڑھا ہے۔''

''یہ چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں اس لئے میں نے بیٹے کے سامنے یہ جھوٹ بول رکھا ہے۔ معلوم نہیں کب تک رہے گا۔''

''تو اب نرس سے کیا مسئلہ ہے۔''

''وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ وہ پولیس کو کسی وقت بھی بلا کر مجھے وہاں سے نکلوا سکتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کسی سستی سی جگہ پر آجاؤں اور اس سے سستی جگہ مجھے کہاں ملے گی۔''

''تو گویا میں سستی جگہ پر رہ رہا ہوں۔''

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن یہاں اسے معمولی جگہ سمجھا جاتا ہے۔''

''او کے تو تم نرس سے الگ ہونا چاہتی ہو۔''

''ہاں ایک کام اور کر سکتی ہوں۔اگر تم کرایہ نہ لو تو جب چاہو مجھے یہاں آ کے مل سکتے ہو۔ میں تیس یا پچاس پاؤنڈ نہیں لوں گی۔''

اب مجھے یہ بات عجیب لگی کہ میں اپنی جنسی خواہش جب چاہوں ایک گوری عورت کے ساتھ پوری کر سکتا ہوں جس میں کوئی احساسِ ندامت بھی نہیں ہوگا۔تو میں نے چابیاں اسے دے دیں مگر یہ ضرور کہا کہ میں اس آفر کا فائدہ نہیں اٹھاؤں گا کہ جب چاہوں آجاؤں۔ مجھے تمہارا احترام بھی کرنا ہوگا۔

''تھینک یو۔ میرے بیٹے کا سکول اگلی گلی میں ہے۔وہ پڑھ جائے گا تو میرے جسم پر پڑے داغ دھل جائیں گے۔''

وہ وہاں سے جا چکی تھی مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور نہیں آئی۔اب صبح ہوئی تو میں نے محسوس کیا

کہ رات کو میرے ساتھ کسی نے دوستی نبھائی تھی۔ اب خمار اترا تو میں نے دیکھا کہ زندگی کتنی عجیب ہے اور ہم اسے سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ گناہ اور نیکی کے بیچ کتنا مختصر سا فاصلہ ہوتا ہے جسے ہم عبور کرنے میں ایک عمر خرچ کر دیتے ہیں۔

صبح جب میں اٹھا تو پاکستان کی جلاوطن حکومت کے ایک وزیر کی حیثیت سے اس صبح کو گلے سے لگایا۔ جلاوطن حکومت کا حال جلاوطنوں سے مختلف تو نہیں ہو سکتا تھا تو جس فلیٹ میں بیٹھا تھا وہ گواہی دے رہا تھا کہ تم لوگوں کے غلام تھے۔ تمہارا باپ دادا غلام تھے بلکہ وہ تو اس سے بھی پہلے کسی نہ کسی ریاست کے راجے مہاراجے، ٹھاکر، نواب یا کسی بہادر جنگ کے غلام تھے یا کسی نظام الملک کے غلام تھے اور اب یہ غلامی کا دوسرا جنم تھا جو آقاؤں کے اپنے ملک میں ہو رہا تھا۔ میں اپنی ایک چابیاں جیسمین کو دے چکا تھا۔ یہی نام اس نے بتایا تھا۔ مجھے اب محسوس ہوا کہ اس کا ایک نام ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے پاکستانی اور مسلمان دیکھتے ہوئے اس نے اپنا نام جیسمین بتایا کہ یاسمین ہمارے ہاں لڑکیوں کا نام ہوتا ہے۔ وہ بندے کا مذہب، رنگ اور نسل دیکھ کر گاہک کو نام بتاتی ہوگی۔ بہر حال لندن میں یہ ایک رشتہ عورت سے قائم تو وہ گیا مگر جلد ہی رات کا تجربہ ذہن اور دل سے ڈھل گیا۔

سوچا سنٹرل لندن جایا جائے۔ بہت دن ہو گئے طیفا بٹ کے ہوٹل نہیں گیا تھا۔ اپنے اخبار کے دفتر میں ڈاک دیکھنی تھی اور جیل حکام کی طرف سے کسی نہ کسی پاکستانی قیدی کی وکالت یا ترجمانی کا کوئی پیغام بھی ملنا تھا۔ سو پہلے اخبار کے دفتر پہنچا۔ سنسان ویران دفتر کہ وہاں کس نے ہونا تھا۔ میں ہی ایڈیٹر، میں ہی چپڑاسی، میں ہی سب کچھ تھا البتہ ڈاک پاکستان سے آئی ہوئی تھی۔ بیوی کے دو خط اور پرچے موجود تھے۔ پاکستان سے آئی ڈاک کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا تھا۔ اللہ سے دعا کرتا تھا کہ اچھی خبر ہو۔ اچھی نہ سہی، بری خبر نہ ہو۔ دونوں خطوں میں بیٹے کا ذکر تھا یا سکول میں ملازمت کے حوالے سے واقعات تھے۔ بیٹا بولنا سیکھ رہا تھا۔ گونگی قوم کا بچہ کیا بولنا سیکھے گا۔ جس سے اس کی مادری زبان چھین لی گئی۔ جس سے اس کی ثقافتی شناخت چھین لی گئی وہ انگریزی کے لفظوں کی غوں غاں کر کے تھک ہار کے سو جائے گا۔ میں اپنے اندر ایک باپ اور ایک خاوند کو مرتے دیکھ رہا تھا جیسے دریاؤں کے خشک ہونے کا عمل بہت آہستہ ہوتا ہے۔ میرے اندر کے انسان اور باپ کے جذبات کی موت قسط وار واقع ہو رہی تھی اور مجھے اس کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ رات کے تجربے نے اور بتا دیا کہ تم ایک سڑک کنارے معمولی سے راہ گیر ہو۔ نہ کوئی نام نہ کوئی شناخت۔ جیسمین نام کی عورت جسے تم جانتے نہیں ہو وہ جھونکے کی طرح آئی اور تمہیں ایک معمولی

سے جسم میں تبدیل کر کے چلی گئی۔

اخبار کے معاملات دیکھے۔ مجھے اس سے کچھ زیادہ تو فائدہ ہو نہیں رہا تھا۔لندن کے اطراف میں ہر فرقے کے مولوی جتھوں کی شکل میں برطانوی حکومت سے نہ صرف چندے اور ویزے لے رہے تھے،اپنے جماعت خانوں،مساجد اور رہائش گاہوں کے لئے مراعات لے رہے تھے اور گوری حکومت ان کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار تھی۔ مجھے جو وجہ سمجھ میں اس وقت آئی وہ یہ تھی کہ وہ برطانیہ میں ایک چھوٹے ہندوستان کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جسے وہ اپنے پرانے اصول کے تحت چلا سکیں۔وہ اصول Divide and Rule کا تھا۔تو اب وہ انگلستان میں ہندوستان کے مختلف طبقوں،قوموں،مذاہب اور فرقوں کو اسی اصول پر چلائیں گے۔ یہ تو بڑا مہنگا سودا ہو سکتا ہے۔ یہاں تو پھر 1947ء کے فسادات دہرائے جا سکتے ہیں اور شاید برطانوی حکومت اسی کی تیاری میں ہو کہ ان سے جان چھڑانے کا جو طریقہ 1947ء میں آزمایا تھا، اب بھی اُسے آزمایا جائے کہ یہ آپس میں لڑ مریں۔

میں طیفا بٹ کے ہوٹل گیا۔ابھی شام کا ستارا دکھائی نہیں دیا تھا۔ ماحول شانت تھا۔طیفا بٹ ابھی ہوٹل نہیں آیا تھا۔ملازم کام کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے سب سے علیک سلیک کی اور بیٹھ گیا۔ باہر سڑک پر ابھی بہت زیادہ چھل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔طیفا بٹ کے آنے کا یا جلوہ افروز ہونے کا وقت ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔میں نے سڑک پر نگاہیں جمائی ہوئی تھیں کہ ایک ویٹر میرے پاس آیا اور اس نے تین چار دعوت نامے سامنے رکھ دیئے۔اب جو دیکھا تو وہ ایک تو جیل کی میری مصروفیات کے لئے تھا۔ایک سولنگی کی طرف سے تھا اور ایک لائلپوری شاعر کی جانب سے تھا۔تینوں کی نوعیت مختلف تھی۔ لائلپوری شاعر کا پیغام تھا کہ فلاں ہوٹل میں کراچی کے مہاجروں کی پریس کانفرنس ہے،آنا ضروری ہے۔ دوسرا سولنگی کی طرف سے تھا کہ جتوئی صاحب کے ہاں پارٹی ہے۔تیسرا رضوی صاحب کی طرف سے تھا کہ یہاں ایک شام ہے،آجاؤ۔

اب میں نے سب دیکھا اور پھر طیفا بٹ کے آنے کا وقت ہو گیا۔وہ اب کے کھسہ نہیں سلیم شاہی جوتی پہن کے آیا اور اس نے سفید شلوار کے اوپر بوسکی کی لمبی قمیص پہن رکھی تھی۔ظاہر ہے خوبصورت لگ رہا تھا مگر دیکھنے والا صرف میں تھا۔اس نے آتے ہی اپنا نظام سنبھالا۔ آج معمول سے زیادہ کچن میں گہما گہمی تھی اور باربی کیو کے لئے اتنے تکوں کی سیخیں پروئی جا چکی تھیں کہ لگتا تھا کوئی پارٹی ہے۔طیفا بٹ اپنے عملے کی کارکردگی دیکھنے کے بعد فارغ ہوا تو میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''بٹ صاحب آج کوئی خاص پارٹی ہے۔''

''ہاں آپ کو پتہ ہے پورے انگلینڈ بلکہ پورے یورپ اور سکینڈے نیویا میں جہاں جہاں پاکستانی آباد ہیں وہاں وہاں مذہبی تنظیموں نے جنت برائے فروخت کے بورڈ لگا دیئے ہیں اور جو پاکستانی وہاں سے مفلوک الحال آتے ہیں یا کسی پیکیج کے ساتھ مزدوی کے لئے انگریزوں نے انہیں یہاں آباد ہونے کی اجازت دی تھی، اب وہ یہاں قدم جما چکے ہیں۔ ان کی دوسری نسل تیار ہو چکی ہے۔ اب انہیں مذہب کی طرف رجوع کرنے کا موقع ملا ہے اور وہ دنیا کمانے کے بعد جنت کمانا چاہتے ہیں۔ اس موقع سے پاکستان کے مذہبی طبقوں، گروہوں اور فرقوں نے فائدہ اٹھالیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کو دنیا کی نظر میں دوسرے سعودی عرب کے طور پر شوکیس کر دیا ہے۔ جس کے پاس تیل کی دولت نہیں ہے لیکن فوجی اسلحہ ضرور ہے اور فوج بھی وہ جو دنیا کی بے حد منظم اور مرتب فوج ہے۔ جو افغانستان سے لے کر فلسطین اور عرب دنیا کے کسی بھی اہم ملک کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ ان مذہبی طبقوں اور فرقوں کو پالنے کی ذمہ داری لے چکے ہیں۔ وہ ان سے کئی فائدے اٹھائیں گے۔''

''مثلاً کیا فائدے ہوں گے۔''

''تم شاعر ہو، میں ایک معمولی باورچی ہوں پھر بھی سن لو۔ ہندوستان پر ان کا راج جس اصول پر تھا وہ اسی اصول کو یہاں چھوٹے ہندوستان اور چھوٹے پاکستان کی سطح پر لاگو رکھنا چاہتے ہیں یعنی Divid and Rule۔''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو ہندوؤں اور سکھوں میں تقسیم رکھیں گے اور پاکستانیوں کو مذہبی فرقوں میں۔''

''یہی بات ہے اس لئے یہ مولانا حضرات یورپی ملکوں کے آنکھ کے تارے ہیں۔ جتھے کے جتھے آ چکے ہیں یہاں باقاعدہ۔ بارہویں شریف، محرم اور دوسرے تمام فرقوں کے مخصوص تہوار منائے جا رہے ہیں۔ ناروے کتنا چھوٹا ملک ہے۔ یہ جتھے ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک حتیٰ کہ ناروے، ڈنمارک بھی ان کے اڈے ہیں جہاں ان کے ماننے والے موجود ہیں۔''

''وہ یہ سب خرچے اٹھالیتے ہیں کہ مولانا حضرات تو بہت بڑے گروہ لے کر چلتے ہیں۔''

''ان کے ویزے یہاں کے سب تاجر لگواتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ جسے دیکھ کر گورا مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کاروبار بہت پھیل چکے ہیں۔ کنسٹرکشن، گراسری، سپر سٹور،

ویئر ہاؤس امپورٹ ایکسپورٹ، گارمنٹس سے لے کر سپورٹس اور ہوزری تک اِن کی حکومت چلتی ہے۔ ان کو یورپی قومیں کیسے ناراض کر سکتی ہیں۔ اب وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے ان مولویوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں جو ارزاں نرخوں پر ان کے ہاتھوں جنت کا سودا کر رہے ہیں۔''

طیفا بٹ بولے جا رہا تھا۔ وہ مجھے ایک اعلیٰ درجے کا تجزیہ نگار معلوم ہوا۔ میں نے پوچھا آج کس فرقے کی باری ہے کہ اتنا بڑا ڈنر تیار ہو رہا ہے۔''

''آج تم سن کر حیران رہ جاؤ گے کہ کس جماعت کے خلیفہ یا حضرت جی آج ہمارے ریسٹورنٹ میں تشریف لا رہے ہیں۔''

''میں کیسے جان سکتا ہوں۔''

''بھٹو صاحب نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا تو یہاں اُن کی چاندی ہوگئی۔ وہ جونہی اقلیت قرار پائے، پاکستان سے سیاسی پناہ کا دروازہ کھل گیا اور بے روزگاروں کی قطار لگ گئی۔ جواب تک بلکہ آنے والی کئی دہائیوں تک لگی رہے گی۔ شکریہ بھٹو صاحب کہ انہوں نے پاکستانیوں کے لئے روزگار کا ایک اور دروازہ کھول دیا۔''

''تو کیا احمدی جوق در جوق آ رہے ہیں۔''

''نہیں، احمدیوں کی آڑ میں مسلمان آ رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں، مسلمان کیسے احمدی ہو سکتا ہے؟''

''شاعر صاحب! پاپی پیٹ ایمان کو کھا جاتا ہے۔ بے شمار راسخ العقیدہ مسلمان احمدی بن کر انگلینڈ ہی نہیں، پورے یورپ میں آ چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ مسلمان مرتد ہو گئے ہیں۔''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ جب یہ راستہ کھلا تو ہر کسی نے سوچا یورپ داخل ہونے کا راستہ مل گیا۔ ایمان تو آنی جانی شے ہے۔''

''تو اب یہ مسلمان کہاں رہتے ہیں؟''

''ہر ملک میں ان کے جماعت خانے کھل چکے ہیں۔ یورپ یہی چاہتا تھا کہ مسلمان کبھی متحد نہ ہوں۔ ایشیائی اقوام کبھی متحد نہ ہوں تو ان کا خواب تو پورا ہوتا ہی اسی طرح سے ہے۔''

''تو اب کتنے احمدی یہاں آ رہے ہیں اور کتنے مسلمان؟''

''بکنگ تو پچاس لوگوں کی ہے۔جس میں خلیفہ صاحب بھی ہیں۔''

''تو کیا مینوانہوں نے آپ سے مانگا ہے۔''

''سب گوشت خور ہیں۔چکن تکہ،مٹن تکہ،چکن بہاری بوٹی،چکن ملائی بوٹی،مٹن چانپ،مٹن کڑاہی،مٹن مصالحہ،مٹن ٹکا ٹک۔''

''اس کا مطلب ہے گوشت ہی گوشت۔''

''تو وہ مولانا حضرات کیا دالیں کھائیں گے؟''

''وہ مکمل طور پر گوشت خور ہیں اور جنت کی حوروں کے متلاشی ہیں۔''

''کیا اب میں جا سکتا ہوں۔''

''کیوں،تم بھی وہ کھانے کھاؤ اور دیکھو کیسے مولانا حضرات کھانا کھاتے ہیں۔''

''ان کے کھانے میں کھاتے ہوئے کون سی خاص بات ہو گی۔''

''وہ ہڈیاں نچوڑیں گے۔وہ نلی سے مکھ نکالیں گے۔وہ گوشت کو چچوڑیں گے۔وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''مگر میں ان کو اس عبرت ناک حال میں نہیں دیکھ سکتا۔''

طیفا بٹ لندن میں آباد چھوٹے سے پاکستان میں آباد ہر فرقے،ہر نظریے اور ہر طبقے کا ایسا نبض شناس تھا کہ مجھے اس نے ضیاء الحق کے اس زمانے کے پاکستانیوں کی سائیکی اور وہاں آباد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کے مختلف انداز دیسی طریقے سے سمجھا دیئے۔اب میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اور وہاں سے میری منزل دریائے ٹیمز کے کنارے ''کندن ریسٹورنٹ'' تھا۔اس پر لکھا تھا ''انڈین کوزین'' جبکہ اس کا مالک کراچی کا عثمان صدیقی تھا۔میں نے پوچھا یہ نام آپ نے کیوں رکھا ''کندن ریسٹورنٹ۔''

''اس لئے کہ کندن کا لفظ ہندوستان میں استعمال بھی ہوتا ہے اور یہ ان ہی کا برانڈ ہے۔''

''آپ کیا انڈین فود بیچتے ہیں۔''

''نہیں سب کراچی کا فوڈ ہے۔ہم نے انڈین کا سہارا اس لئے لیا کہ انڈین اور گورے گاہک اس برانڈ پر آتے ہیں۔پاکستانی فوڈ پر یہاں صرف پاکستانی ہی آتے ہیں،یہ ہمارا ٹریڈ سیکرٹ ہے۔''

میں نے کہا ''کراچی کا اپنا فوڈ کون سا ہے۔لکھنؤ،حیدر آباد دکن،بمبئی،کلکتہ اور دہلی کا ملا جلا سلسلہ ہے جو چل رہا ہے۔''

''لیکن انڈیا مسلمانوں کا یہ فوڈ چھوڑ چکا ہے۔ وہ ورثے میں ہم لے آئے ہیں۔ کہنے کو یہ انڈین کوزین ہے، اصل میں کراچی کوزین ہے۔''

اب لوگ آنے لگے۔ ہمارے شاعر لائلپوری نے مجھے بتایا کہ ضیاء الحق کی فوجی حکومت مستقبل کے پاکستان کا کوئی اور ہی نقشہ بنانا چاہتی ہے اس لئے یہاں مہاجروں کے کچھ لیڈر پریس کانفرنس کرنے آ رہے ہیں اور یہاں ہم دونوں کے علاوہ سبھی کراچی سے آئے ہوئے یہاں کے مہاجر ہیں یعنی ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت کر چکے ہیں۔

میرا مشاہدہ یہ تھا کہ جو کراچی سے یہاں لندن میں آباد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان میں کئی طرح کے شعبوں کے لوگ ہیں۔ سب سے پہلے تو کراچی سے جو پڑھے لکھے لوگ آئے وہ بی بی سی ریڈیو میں سما گئے اس لئے کہ ان کی زبان ان کو اس میڈیم کے لئے منتخب کرتی تھی۔ پھر جو کراچی کے پڑھے لکھے لوگ آئے وہ بینکنگ سیکٹر میں آئے۔ کچھ کنسٹرکشن کے شعبے میں آئے۔ کچھ قانون اور انصاف کے شعبے میں آئے اور پھر مذہبی سکالر اور مذہب کی تبلیغ کے لئے آئے۔ یونیورسٹیوں میں بہت معمولی تعداد میں بھی آئے۔ اب میں خاموشی سے مطالعہ کر رہا تھا کہ ضیاء الحق کے جرنیل کیا تھیٹر لگانے لگے ہیں۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ جو تھیٹر لگانے جا رہے ہیں وہ پاکستان کے لئے کتنا خطرناک ہوگا اور ہندوستان کی تقسیم کے وقت ہجرت کے مراحل میں لاکھوں لوگ مارے گئے تھے اور اس نئے تھیٹر کے بعد بھی ہزاروں لوگوں نے مارے جانا تھا۔ ہجرت ایک اور ہجرت کو جنم دے رہی تھی اور ایک اور پارٹیشن جنرل ضیاء الحق کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان کی ایک تقسیم پر گاندھی جان سے گیا۔ پاکستان کی دوسری تقسیم پر مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو گئے۔ ہندوستان کی دوسری تقسیم پر اندرا گاندھی کو بھی جانا پڑا۔ اب جنرل ضیاء الحق کا فلسفہ یہ تھا کہ پاکستان کو قیمے کی طرح بانٹ دیا جائے کہ پاکستانیوں کو تقسیم در تقسیم کے ذریعے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تاکہ یہ کسی بھی طرح سے ایک آواز نہ بن سکیں۔ شاید اس طرح انہیں حکومت چلانے میں سہولت مل سکے گی۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ کراچی کے مہاجر جمع ہو رہے تھے اور کچھ تیس اور چالیس کی عمروں کے لوگ وہاں ایسے آئے جیسے اُن کے انتظار میں سب بیٹھے تھے۔ معاملہ گفتگو سے شروع ہوا اور پھر تقریریں شروع ہو گئیں۔

مجھے محسوس ہوا یہ سب کراچی یونیورسٹی کے ڈیبیٹر (مقرر) تھے۔ میں کالج کی زندگی میں بین الکلیاتی مباحثوں اور مشاعروں میں حصہ لیا کرتا تھا اور اکثر کراچی کے یہ ڈیبیٹر (مقرر) اور شاعر انعام جیت

لیتے تھے اس لئے کہ بولنے کا فن اور تلفظ کی نفاست پنجاب کے پاس نہیں ہوتی تھی۔اب جو میں نے ان کی تقریریں سنیں تو وہ سب کی سب پاکستانیوں کو تقسیم کرنے کے لئے بارود سے بھری ہوئی تھیں۔یہ الگ بات کہ ان تقریروں میں سچائیاں بھی تھیں اور قومی سطح کی ناانصافیاں بھی تھیں۔میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کھل کر ایسی باتیں ہو رہی تھیں جو پاکستان کے کسی بھی فورم پر شجرِ ممنوعہ تھیں۔یہاں لندن میں اس وقت "کندن ریسٹورنٹ" ہائیڈ پارک میں تبدیل ہو چکا تھا۔

تقریروں میں پہلی بات پنجاب پر آئی کہ فوج پنجاب کی ہے جس نے ہمیں بنگالیوں سے لڑایا۔ بنگالی اور بہاری الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کیوں دبائی گئی۔پنجاب کے جاگیرداروں نے زرعی اصلاحات نہیں ہونے دیں اور لیاقت علی خان کو یرغمال بنالیا۔جناح اس وجہ سے فوت ہو گئے۔نہرو نے زرعی اصلاحات کر کے ہندوستان کو بچالیا۔پنجاب دوغلہ ہے۔پنجابی اکثریتی صوبہ کیوں بنایا گیا۔اس کے تین صوبے ہونے چاہئیں۔ہم اسمبلیوں سے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو نکال کے باہر پھینکیں گے۔پاکستان درمیانے اور نچلے طبقے کے عوام کا ہے۔ہم عوام کو اسمبلیوں میں پہنچائیں گے۔ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو شکست دیں گے۔سندھ وڈیروں کا ہے۔ہم سندھیوں کے ساتھ نہیں رہیں گے جن کا ہیرو راجہ داہر ہے۔ہمارا ہیرو محمد بن قاسم ہے۔ہم جناح پور بنائیں گے کیونکہ ہم ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر آئے ہیں۔خون کی لکیر عبور کر کے آئے ہیں۔ہم آج اپنی جماعت بنا رہے ہیں۔کراچی پاکستان کا اکنامک ہب ہے۔کراچی جتنا ٹیکس دیتا ہے اتنا کوئی صوبہ نہیں دیتا۔ہم وہ ٹیکس پنجاب اور دوسرے صوبوں پر خرچ نہیں ہونے دیں گے۔کراچی کماتا ہے۔پنجاب کھاتا ہے۔اب یہ ہو گا نعرہ۔

اس طرح کی زوردار تقریریں ہوتی رہیں۔لائلپوری مجھے بار بار اُکساتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ہمیں پنجاب کا مقدمہ پیش کرنا چاہئے۔میں نے اسے منع کیا کہ پنجاب کا مقدمہ کمزور ہے۔اگرچہ عبداللہ ملک نے یہ مقدمہ لکھا ہے۔یہ موقع نہیں ہے کہ ہم بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالیں۔اب مجھے لائلپوری نے دکھایا کہ اس جگہ پاکستانی ہائی کمیشن کے کئی افسر باقاعدہ بیٹھے ہیں جن میں ملٹری اتاشی بھی ہے۔اس کا کیا مطلب بنتا ہے۔اب میں سمجھ گیا کہ پاکستان کروٹ لے رہا ہے۔بنگلہ دیش کے بعد یہ ایک اور واقعہ ہونے والا ہے۔

کراچی جو واقعی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور قائد کا شہر تھا، سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ

سے اور مختلف صوبوں اور لسانی، مذہبی، ثقافتی اور علاقائی بنیادوں پر تقسیم ہونے کے باوجود ایک طرزِ احساس اور ایک معاشی دھاگے میں پرویا ہوا تھا اس لئے اس کا تشخص ایک ہی رہنا ضروری تھا۔ اب ضیاء الحق اینڈ کمپنی کیا کرنا چاہتی تھی، یہ ہم لندن میں سونگھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جیسے مشترکہ ہندوستان کو لسانی، ثقافتی، مذہبی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا، انہی بنیادوں پر کراچی کو بھی تقسیم کرنا کون سا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ میں اور لائلپوری ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کے شاعر تھے اس لئے ہمیں پہلا دکھ تو ہندوستان کی تقسیم کا تھا۔ دوسرا دکھ پاکستان کی تقسیم کا تھا اور اب تیسرا دکھ مغربی پاکستان کی تقسیم کا ہو رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ کراچی ''جناح پور'' بن گیا تو پھر پاکستان کا نام تو بے معنی ہو جائے گا۔ اب پاکستان کے ہائی کمیشن کے افسران وہاں سے کچھ کھائے بغیر چلے گئے جس سے یہ شبہ اور بھی طاقت پکڑ گیا کہ یہ پوری کارروائی جنرل ضیاء الحق کی طرف سے تھی۔

اب ''کندن ریسٹورنٹ'' کے ویٹرز حرکت میں آئے اور پہلے ہر طرح کی شراب بشمول وہسکی، وائن، بیئر اور واڈکا سے تواضع شروع ہوئی مگر ضیاء الحق تو شراب نہیں پیتا تو پھر یہ سب کیا تھا۔ بہر حال وہ شام لندن کی ایک اور رات تھی جو کسی نئے زمانے کا پتہ دے رہی تھی۔ ''کندن ریسٹورنٹ'' اس وقت کسی نئی دنیا کا پتہ دے رہا تھا۔ بی بی سی لندن نے اس پر تبصرہ کیا اور پاکستانی اور انڈین اخبارات نے اسے اہم خبر کے طور پر اچھالا۔ کراچی کو مہاجروں کا شہر ثابت کر کے ایک جزیرہ بنانے کے سب انتظامات کہیں اور طے ہو رہے تھے اور جنرل ضیاء اس سے کئی فائدے لینا چاہتا تھا۔ ایک تو ذوالفقار علی بھٹو کے سندھ کو کراچی سے محروم کرنا اس کے لئے ضروری تھا، دوسرے پنجاب کے لئے بھی ایک چیلنج پیدا کرنا تھا کہ پنجاب کے سرمایہ کاروں کے لئے کراچی جنت کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ کراچی میں بلوچی، پشتون اور پنجابی مہاجروں کے ساتھ مشترکہ کاروباری رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اس رشتے کو توڑنا بھی شاید جنرل ضیاء الحق کے فائدے میں تھا۔ اُس شام کی گونج اگلی شام جتوئی کی شام کی پارٹی میں سنی گئی۔

وہ ذرا بعد میں، پہلے اس دوسری شام کا زینہ تو طے کر لوں۔ سولنگی نے جتوئی صاحب کی شام کی پارٹی کی دعوت دی تھی۔ مجھے اس شام شاعری سنانے اور امراء کی محفل کو گرمانے کی ذمہ داری کے علاوہ کچھ اور مطلب سمجھ نہ آیا۔ پھر بھی یہ کم تھا کہ اس لق و دق تنہائی میں ایک شام کا بھروسہ پیدا ہو جائے۔ ویسے بھی دو چار نظموں کا محفل کو تڑکا لگ جانے سے کچھ میرا بھی بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ میری موجودگی ان وڈیروں اور جاگیردار سیاست دانوں کے لئے ایک بھانڈ، میراثی یا پیشہ ور تفریح مہیا کرنے والے سے زیادہ کیا ہو سکتی

تھی۔ یہ حیثیت فیض صاحب کی بھی تھی، حبیب جالب کی بھی تھی، منیر نیازی کی بھی تھی جب اس طرح کے بڑے جاگیردار سیاست دان انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر مہنگی وہسکی پلاتے تھے۔ میں تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ پھر میں کیوں اعتراض کرتا۔ ایک معمولی سا جلاوطن......

محفل شروع ہو چکی تھی جب میں داخل ہوا۔ شاید پہلا پیگ گردش میں تھا۔ وہاں رضوی صاحب، سردار صاحب اور پاکستان سے آئے ایک چوہدری صاحب بھی تھے جو بھٹو کی پارٹی کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور ضمانت ضبط کرا چکے تھے۔ اب بھٹو صاحب کے جلاوطن جیالے رہنماؤں کے دسترخوان پر بیٹھے تھے اور وہسکی کی جگہ کوکا کولا پی رہے تھے ساتھ دینے کے لئے۔ صورت حال مبہم تھی۔ میں آکر کونے میں سٹک گیا۔ چوہدری صاحب مسلسل مجھے دیکھے جا رہے تھے جیسے میں اس محفل میں کوئی صحافی، مخبر یا ایجنسیوں کا بندہ ہوں۔ جب یہ ذرا جتوئی صاحب نے دیکھا تو بولے ''یہ اپنے شاعر صاحب ہیں، اپنے آدمی ہیں، ادھر کی بات ادھر نہیں لے جا سکتے۔''

''نہیں نہیں، سر آنکھوں پر، بس ذرا تعارف ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

''چوہدری صاحب! آپ کے پنجاب میں بولتے ہیں ناں جب کوئی آپ جیسا بڑا آدمی ہمارے جیسے معمولی بندے کے ہاں آتا ہے تو وہ کیا بولتے ہیں کہ سائیں آج تو چیونٹی کے گھر نارائن آ گئی ہے۔''

''توبہ توبہ جتوئی صاحب! ایسا نہ کہیں، ہم تو آپ کے محبت گزار ہیں۔''

''واہ واہ سائیں یہ محبت گزار کا لفظ پہلی بار سنا ہے، کیا بات ہے۔''

''ہم پنجاب والے اردو کی کھیتی میں گوڈی کرتے ہیں۔ ہمارے بھی غریب خانے شاعروں سے بھرے رہتے ہیں۔''

''سائیں دل پر نہ لیں۔ ہم آپ کے خدمت گزار ہیں۔''

''ہمارے ہاں خدمت گزار ہوتے ہیں، آپ کے ہاں وہ خدمت گزار ہو جاتے ہیں۔''

''سائیں آپ سے کیا کچاہری ہو، ہم وہسکی پی رہے ہیں آپ کوکا کولا۔''

''سائیں آپ سے صحبت نہیں رہی ناں تو بس یہ کمی رہ گئی۔''

اب رضوی صاحب بیچ میں آئے......

''چوہدری صاحب! آپ کا بڑا خاندانی پس منظر ہے۔ آپ کے والد کی شہادت گلبرگ کے

ایک چوک میں ہوئی تھی تو میں بہت اداس ہوا تھا۔وہ خاندانی سیاست دان تھے۔''

''رضوی صاحب ہم خاندانی طور پر جولاہے تھے۔ سیاست دان اب بنے ہیں جیسے اتفاق فونڈری والا میاں شریف خرادیہ تھا، اب وہ میاں نواز شریف کا باپ ہے۔ ہمارے باپ کو گجرات میں کھڈیاں الاٹ ہوئیں۔اس سے انہوں نے لومیں لگائیں۔لو میں تو جانتے ہوں گے۔''

''ہاں ہاں سب کو پتہ ہے۔''

''تو بس پھر وہاں سے ترقی کر کے ہم ادھر پہنچے ہیں۔''

''سائیں سیاست کاروبار ہی ایسا ہے کہ سارے کاروبار اس میں آ کر مل جاتے ہیں۔''

''اب یہ تو طنز ہے۔ہم سیاست کو عبادت سمجھتے ہیں۔''

''سائیں عبادت بھی تو اللہ میاں سے کاروبار ہی ہے ناں۔''

اب رضوی صاحب بیچ میں آئے۔''جتوئی صاحب میرا پیگ بنائیں اور شاعر بھی کب سے پیاسا بیٹھا ہے،توجہ کریں ناں۔''

اب پیگ بنائے گئے۔ چوہدری صاحب ذرا کسمسائے رہے۔ میں حیران تھا کہ یہ چوہدری یہاں کس لئے آئے ہیں۔ بہرحال لندن کا موسم تو پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوجاتا ہے۔ابھی دھوپ، ابھی بارش،تو میں خاموش رہا۔اب چوہدری صاحب اپنے ایجنڈے یا مدے پر آئے۔

''جتوئی صاحب اور رضوی صاحب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اور میرا خاندان اس وقت شدید دکھ کی کیفیت میں ہے کہ بھٹو صاحب نے ہمارے والد کو مروایا یا جس نے بھی مروایا، ہمارا والد کٹر مسلم لیگی جان سے گیا۔''

''دیکھو چوہدری صاحب اِدھر کٹر مسلم لیگی کوئی بھی نہیں ہے۔ قائداعظم بھی نہیں ہے۔کانگریس سے ٹوٹ کے مسلم لیگی بنے تھے۔''

''مگر ہم تو آج تک مسلم لیگی ہیں۔''

''دیکھیں مسلم لیگ کا ایک کردار پاکستان بننے کا تھا۔وہ اسی دن ختم ہو گیا تھا جب انگریز نے مسلم لیگ کی تحریک کا فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو تقسیم کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا تھا۔''

''سائیں آپ کیا کہتے ہیں مسلم لیگ نے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔''

''اور اسی بنیاد میں ہی اسے دفن ہو جانا تھا کہ اس کا کام بس اتنا تھا۔''

''ناں سائیں، پاکستان کی حفاظت بھی تو مسلم لیگ نے ہی کرنی ہے۔''

''تو کیا مسلم لیگ پاکستان کی حفاظت کر سکی تھی جب بنگلہ دیش بن رہا تھا۔ مسلم لیگ تو دوسری دفعہ بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ بھی ختم ہو گئی تھی۔ آپ اس کے مردے کو کھینچے پھرتے ہیں۔ ہر مارشل لاء اس کے غبارے میں ہوا بھر دیتا ہے۔ آپ پھول جاتے ہیں۔''

''سائیں ہم تو آپ کے لئے ایک پیکیج لائے ہیں۔ آپ تو ہمیں نظریہ پاکستان سے ہی دور کر رہے ہیں۔''

''او بابا نظریہ پاکستان صرف بعض نظریہ فروشوں کے لئے تھا کہ ان کا کاروبار چلتا رہے اور یہ خوب چلا۔ اس کے چمپئن نوائے وقت والے ہیں۔ ان کو کرنے دو یہ کاروبار۔ آپ کھڈیوں اور لوموں کا کاروبار کریں۔''

اب جتوئی صاحب نے تیسرے پیگ پر جب یہ بات کی تو میں نے دیکھا چوہدری برادران کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ ایسے میں رضوی صاحب بیچ میں آئے۔

''جتوئی صاحب کھانا لگوائیں، باتیں ہوتی رہیں گی۔''

''ہاں او چھورا......''

''جی سائیں۔'' سولنگی بولا۔

''بابا! مہمان بیٹھے ہیں، کھانا لگاؤ۔ بڑا ہم کو ان کا انتظار تھا۔ بابا خاص الخاص باورچی ہے اپنا۔ آپ کی خدمت کے لئے لاہوری کھانے بنوائے ہیں صاحب، لاہوری مچھلی فرائی، اِدھر مٹن نہیں ہوتا، لیمب کڑاہی، لیمب روسٹ، حلیم، نہاری، پائے، بھنڈی گوشت، پالک گوشت، پلاؤ، سائیں اب یہ تو ہمارا حق ہے ناں۔''

اب چوہدری برادران نے اپنا ایجنڈا بھی تو سامنے رکھنا تھا، سو انہوں نے مناسب سمجھا کہ پہلے کھانا کھا لیں پھر بات کریں گے۔ اب کھانا جتنی دیر میں لگنا تھا اس میں سب نے کم سے کم دو دو پیگ وہسکی کے اور لے لئے اور جب کھانا لگا تو صرف چوہدری برادران کھا رہے تھے، باقی سب کھانے کی میز پر پی رہے تھے یا سلاد چبا رہے تھے یا میرے جیسا شاعر پالک گوشت سے اپنی حسرت پوری کر رہا تھا۔ چوہدری برادران نے جیسے تیسے کھانا زہر مار کیا کہ وہ اپنی آس امید کے ساتھ پاکستان کے مارشل لاء کی حکومت کی

آشیر باد سے ایک پروگرام لائے تھے۔ وہ اگر یہاں قبول ہو جاتا تو ان دونوں میں سے ایک کو پرائم منسٹر ہونا تھا۔ اب جب کھانا ہو چکا بلکہ کھانا ہوا نہیں تھا، ٹیبل پر پڑا تھا اور پینے والوں کے گلاس ان کے ہاتھوں میں تھے کہ چوہدری برادران نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور کھڑے ہو گئے تو سب ہی کھڑے ہو گئے تو ایسے میں چوہدری صاحب بولے:

''سائیں آپ کی مہمانی ہم نے قبول کی۔ ہمارے بڑوں کا اصول ہے کہ جہاں کا کھانا کھاتے ہیں وہاں کے شیف یا باورچی سے ملتے ہیں۔ اگر آپ بلا دیں تو ہم اُس کو شاباشی دے دیں۔''

''ہاں سائیں ضرور۔ اوئے سولنگی! آ جاؤ۔''

سولنگی کے ساتھ دو اور باورچی آ گئے اور سامنے کھڑے ہو گئے۔

''سائیں یہ ہیں حال حاضر۔''

''آپ نے بہت اچھا کھانا بنایا، یہ آپ کا انعام ہے۔''

''ناں سائیں یہ انعام نہیں لیتے۔''

''یہ انعام آپ کے لئے نہیں، ان کے لئے ہے۔''

''سائیں آپ ہمارے گھر میں آ کر ہم کو جوتے تو نہیں ماریں گے۔''

''اور جو جوتے آپ نے مسلم لیگ کو اپنے گھر میں مارے ہیں وہ کس کھاتے میں جائیں گے۔''

اس پر پھیکا سا قہقہہ تو دونوں جانب سے پڑنا تھا، اس کے بعد چوہدری صاحب بولے ''سائیں جانے سے پہلے ہم جس مقصد سے آئے تھے وہ ہم بتائے بغیر جا نہیں سکتے کہ اس جواب کے انتظار میں پاکستان کی حکومت اس وقت جاگ رہی ہو گی۔''

''حاضر سائیں۔ ہمیں معلوم ہے آپ کن کی طرف سے آئے ہیں۔ جو حکم سائیں۔''

''حکم نہیں گزارش ہے۔''

''فرمائیں فرمائیں۔''

''آپ دونوں کے لئے پاکستانی حکومت کا پیغام ہے کہ آپ اگر واپس پاکستان آ کر حکومت میں شامل ہو جائیں تو آپ پر تمام کیس واپس لے لئے جائیں گے۔ ویسے بھی مرنے والے زندہ نہیں ہوا کرتے۔ ایک دور ختم، دوسرا شروع۔ آپ دونوں کو مرضی کے عہدے دے دیئے جائیں گے۔ ضامن ہم ہیں اور آپ جانتے ہیں ہم سیاسی لوگ ہیں، کوئی طبلچی نہیں۔''

اس پر جتوئی صاحب کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔

''ناں سائیں، طبلچی ہوتے تو ہمارے دستر خوان پر ہوتے۔''

''سوچنے کے لئے بھی تھوڑا وقت مل سکتا ہے۔ہم دو دن ادھر ہی ہیں۔''

جونہی وہ جانے کے لئے اُٹھے، جتوئی صاحب نے انہیں روکا۔

''نہیں سائیں، جواب ہاتھ کے ہاتھ ہی لیتے جائیں اور اپنی سرکار سے کہیں ابھی تو ہمارے قائد کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور ابھی تو اُس کی بیٹی نے جلاوطنی کے بعد لاہور جانا ہے اور پھر وہ جرنیل دیکھے گا کہ اس کا کیا استقبال ہوتا ہے اور یہی فوج اُسے دنیا کی پہلی مسلم ملک کی وزیر اعظم اپنے ہاتھوں سے بنائے گی۔''

''کفن تو ہمارے باپ کے قتل کا بھی میلا نہیں ہوا تھا جب اسے اندھا قتل قرار دے کر ساری کارروائی ٹھپ ہوگئی تھی۔''

''تو پھر ایک تاریخ دوسری تاریخ کو ٹھیک تو نہیں کر سکتی۔''

''ہاں تاریخ تاریخ ہی کا عکس ہوتی ہے۔''

''تو بس یہ عکس اپنے جرنیل کو دکھاؤ کہ تمہارا سپاہی شہید ہوتا ہے تو ہمارا قائد بھی شہید ہی ہوتا ہے۔ چاہے پھانسی چڑھے یا اندھی گولی سے مارا جائے۔ یہ میں تمہارے والد کے حق میں بات کر رہا ہوں۔''

اب دیکھا تو وہ چوہدری وہاں موجود نہیں تھے۔اس پر رضوی صاحب نے کہا''جتوئی صاحب! آپ نے تو سندھ اور سرائیکی علاقے کے دل جیت لئے ہیں۔''

''دل ہی نہیں، آنے والے وقتوں کے وقت بھی جیت لئے ہیں۔''

''اب ہمارا حق بنتا ہے کہ ایک ایک پیگ لیں اور اپنے شاعر سے بولیں کہ کچھ شاعری سنائے۔ کچھ اپنا دل تو ہلکا کریں۔''

اب میں نے نظمیں تو سنا دیں جوان کے سروں سے گزر گئیں کہ یہ ضروری تھا اور پھر میں نے سولنگی کے ساتھ کھانا کھایا اور میں نے وہ رات وہیں گزاری کہ میں کہیں بھی جانے کا نہیں سوچ سکتا تھا اور جب صبح اٹھا تو مجھے ایک جیل کے محکمے نے بلا لیا تھا۔اب مجھے کس قسم کے قیدیوں کی ترجمانی کرنی تھی۔ یہ ایک ہندوستانی عورت کی ترجمانی تھی جو حیدر آباد دکن کے مسلمان گھرانے سے تھی۔ چونکہ ہندوستانی

قیدیوں کے معاملات ایک ہندوستانی مترجم دیکھتا تھا۔ چونکہ وہ ہندو تھا اس لئے اس عورت نے میرا انتخاب کیا۔ اگلے روز اس سے ملاقات جیل میں ہوئی۔ اس نے بتایا ''ہم حیدرآباد دکن کے شاہی خاندان سے ہیں۔ حضرت نظام کی اولادوں میں سے کسی کی بیٹی ہیں۔ سب نظام کا تو حضرت جی کے بعد گڑبڑ ہو گیا۔ تاش کے پتوں کی طرح ایسے اُڑا خاندان جیسے روئی دھنی جاتی ہے۔ معلوم نہیں پڑتا کون سا ذرہ کدھر اُڑا اور کون سا پھنبہ کہاں گرا۔ ہم بھی کسی ایسی اولاد میں سے نکلے کہ جو ذرا شکل وصورت میں تھی۔ ہم کو تم دیکھ تو رہے ہو۔ کیسی ہوں گی ہماری اماں اور پھر کیسی ہوں گی ان کی اماں۔ تو میاں اس سے حساب لگاتے جاؤ اور پوری پیڑھی تک کو جانچ لو۔''

''ہاں میں یہ سب جان گیا۔ اب کل کورٹ میں مجھے آپ کی طرف سے کیا کہنا ہے۔''

''بڑے بے صبرے ہو۔ مجھے عمر قید ہوئی ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔ ذرا بات کو سنتے رہو۔ ہماری اماں کہتی تھیں کہ جن کے پچھواڑے آگ لگی ہوان پر بھروسہ مت کرو۔ اب ہم تم پر بھروسہ کریں۔''

''نہیں نہیں مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں تو پورا دن آپ کے پاس ہوں۔''

''ہاں تو میاں، بات یہ رہی کہ محلوں سے نکلا کوڑا کرکٹ بھی اچھے بھاؤ بکتا ہے۔ ہم بھی محل سے نہ سہی، اس کے سائے سے تو نکلے ہی تھے تو بھلا ہمارا مول کیسے نہ لگتا۔ لگ گیا بھاؤ، لے گیا سیٹھ جس کی دلالی ہمارا اپنا ماموں کرے تھا۔ اب سیٹھ ہم کو لے گیا۔ کبھی دبئی میں چلایا کبھی دلی میں چلایا۔ ارے ہم کھوٹا سکہ تھوڑی تھے جو نہ چلتا۔ ہم تو ٹکسال سے نکلے تھے خوب چلے اور پھر وہ ہم کو ادھر لے آیا۔ بس یہ اُس سے بھول ہوگئی۔ پوچھو کیسے؟ وہ ایسے کہ یہ ملک ٹھہرا ولایت میں اور ادھر کا دستور ہم کو معلوم تھا کہ ادھر کا پولیس صاف ہوتی ہے۔ ہم جو کریں گے سو بھریں گے۔ اب اس نے ہم کو گائے سمجھ کر ہر سانڈ کے آگے کھڑا کر دیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ اب کھڑے تو ہونا ہی تھا اور ہم کو اماں نے کس لئے جنا تھا۔ بیٹی کو ہر ماں اس لئے تو جنتی ہے کہ وہ ہر سانڈ کے کام آئے۔ سو آئے میاں۔ اب سانڈ بھلے شہزادہ ہو، اونچے رتبے کا ہو، مال دار ہو، مولوی ہو کہ سیاست دان ہو، ہوتا تو سانڈ ہی ہے۔ ہم تو گائے ہوویں ناں تو پھر گائے کو کوئی فرشتہ تو نہیں ملے گا ناں۔ سانڈ ہی ملے گا ناں۔ تو بس سیٹھ نے ہم کو کبھی عربی کے سامنے، کبھی افریقی کے سامنے، کبھی گورے کے سامنے، کبھی اپنے ہندوستانی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بس اُس دن اُس سے بھول ہو گئی۔ وہ خود ہی سانڈ بن کے آگیا۔ اب ہم کو اِسی دن کا انتظار تھا۔ ہم نے تو بہت بڑا کچن کا لمبا چھرا سنبھال کے رکھا تھا۔ اب وہ شراب میں جب رپٹا اور لڑھکا اور ہم کو گائے سمجھ کے پیلنے لگا تو ہم نے ایک نہیں

کئی بار وہ چھرا اس کے سینے میں گھسیڑ دیا۔ مرا وہ تب بھی نہیں۔ ارے بہت جان والا تھا۔ آخر کو ہم نے اُس کی گردن کو کاٹا جیسے ہم نے بقر عید پر بکرے کٹتے دیکھے تھے یا گائے کی قربانی دیکھی تھی۔ تو نرخرہ کاٹا اور پھر گردن اُتار کر کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ تو بھیا، لندن کی ٹریفک کے بیچ وہ کھوپڑی سڑک پر گری تو وبال آ گیا۔ گاڑیاں آپس میں بھڑ گئیں۔ پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر بولنے لگے۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ پولیس آئی، لے گئی۔ میں نے سچ بول دیا۔ مجھ کو عمر قید ہوگئی۔ اب نو مہینے بعد میرے اندر بچہ بول رہا ہے۔ اب اسے میں تو خاموش نہیں کرا سکتی۔ اب ہے کوئی برطانیہ کا قانون جو اسے چپ کرائے۔ وہ تو بولے گا۔ اب آپ کو کرنا یہ ہے کہ عدالت سے مجھے یہ بچہ پیدا کرنے کی اجازت دلوا دیں۔ پھر جو قانون ہے کہ بچہ جب تک بڑا نہ ہو، وہ ماں کے پاس رہے گا تو میں اُس بچے کے ذریعے بڑی دیر زندہ رہوں گی۔"

میں پوری بات سمجھ چکا تھا۔ میرا کام صرف ترجمانی تھا، وکالت نہیں تھا۔ سو میں نے کہا جو آپ کہیں گی میں عدالت تک پہنچا دوں گا۔ ویسے بھی انسانی قانون کے آگے فطرت کا قانون اہمیت رکھتا ہے۔ اس حساب سے آپ اس بچے کو جنم دیں گی اور وہ جیل میں آپ کے ساتھ پلے گا۔ میں یہ بات عدالت کو سمجھا دوں گا۔ اب اگر عدالت نے پوچھا کہ بچہ کس کا ہے تو کیا کہو گی۔"

"اے بھیا، صاف بولوں گی یہ کسی کا نہیں ہے۔ اس بچے پر کسی سانڈ کی مہر نہیں لگی ہوئی۔ میں کون ہوتی ہوں دنوں کے ہیر پھیر کا حساب رکھنے والی، ایک رنڈی ہو یا گائے ایک برابر ہوتی ہے۔ دن اوپر چڑھیں یا نیچے ہم کو اتنا پتہ ہے کہ ہمارے اوپر کسی سانڈ نے ہی چڑھنا ہے۔"

میں نے اس کا کیس عدالت کو سمجھا دیا اور اس نے اس بچے کو جنم دیا۔ وہ کسی کا بھی ہو سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ بچہ کس کا ہے۔ میں نہیں بولا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی مجھے دیکھتی رہی مگر اس کی آنکھیں میرے لئے ممنونیت کا پیغام دے رہی تھیں۔ لندن میں ہندوستان کی دوسری تاریخ انگڑائی لے کر جنم لے چکی تھی۔ کیا کسی نے سوچا تھا کہ ہندوستان کا دوسرا جنم انگلستان میں ہوگا اور کس شکل میں ہوگا۔

....

لندن نے پھریری لی تھی۔ موسم نے انگڑائی لی تھی۔ لوگوں نے پارکوں کا رخ کرلیا تھا۔ لندن اور اس کے اطراف باغوں، پھولوں اور پارکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میرے لئے دن گزارنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ ایک باغ سے دوسرے باغ۔ ایک بینچ سے دوسرے بینچ پر بیٹھنا اور پرندوں کو دیکھنا، ان کی مختلف قسموں اور خوبصورت آوازوں کو سننا، ان کے پروں اور چونچوں کے رنگ دیکھنا، ان کی اداؤں اور مصروفیات کا مطالعہ کرنا میرے لئے بے حد دلچسپی کا تجربہ تھا۔ میں پاکستان فون کرلیتا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ جونہی فون کروں گا میری بیوی اداس ملے گی اور میرا بیٹا تو رو رہا ہوگا یا خاموش ہوگا۔ میرے لئے یہ مرحلہ اور کیفیت اگلے کئی دنوں کے لئے مضطرب رکھے گی اس لئے میں فون سے جی چرانے لگا تھا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی یعنی میں خود کو اپنے گھر سے الگ کررہا تھا۔ کیوں کررہا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں بیوی بیٹے سے الگ نہیں ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ سے الگ ہو رہا تھا کہ میں ایک بزدل انسان تھا اور مجھے اپنی ذمہ داری نبھانے کا نہ تو شعور تھا نہ میری دسترس تھی اس لئے میں فرار ڈھونڈ رہا تھا۔ اب میرا فرار بھی تو اسی لندن کے انھی پاکستانیوں کے ذریعے ہونا تھا۔ میں بھلا کس طرح پاکستان اور لندن کے درمیان اپنی زندگی کو بچا سکتا تھا۔ میں مسلسل فرار میں تھا۔ جو ایک دفعہ زندگی سے بھاگتا ہے اسے پھر بھاگنا ہی ہوتا ہے۔ وہ ساری زندگی اپنے آپ سے دور بھاگتا جائے گا۔ میں بھی ایسا ہی کررہا تھا۔ میں مسلسل بھاگنے پر مجبور تھا اور لندن کی سرنگ کے ذریعے پوری دنیا میں بھاگ رہا تھا۔

یہ موسم بہار کی ایک شام تھی کہ میں انڈیا کے نہرو سینٹر جا نکلا۔ ہندوستان نے دنیا میں اپنے ادب، فن اور کلچر کی ترویج کے لئے کئی سینٹر قائم کئے تھے۔ ان میں ''نہرو سینٹر'' بہت اہم تھا۔ مجھے لائلپوری شاعر نے بتایا کہ اُدھر ہندوستان سے کچھ شاعر اور دانشور آرہے ہیں جو ہندوستانی ادب اور فنونِ لطیفہ پر بات کریں گے۔ اب میرے لئے یہ انوکھا تجربہ بھی تھا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہاں کس طرح سوچا جا رہا

ہے۔ سو میں اور لائلپوری وہاں پہنچ گئے۔ وہاں داخلہ فری تھا۔ ایک بڑا ہال تھا۔ اُمڈا ہوا تھا سننے والوں سے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں ہندوستان کے بڑے فلمی پنڈت، شاعر اور دانشور آئے ہوئے ہیں کہ اپنی سرحدوں کو وسعت دیں اور جو ہندوستانی اور پاکستانی بیرون دنیا میں رہتے ہیں ان کی میزبانی کا فائدہ بھی اٹھائیں۔ ایک فلمی ڈائریکٹر، ایک مورخ، ایک شاعر اور ایک ناول نگار مختلف زبانوں کے تھے۔ انگریزی میں گفتگو ہوئی۔ سب کی گفتگو میں ایک ہی طرح کا مؤقف تھا اور اس پر بہت تالیاں بجیں۔ میرے لئے یہ بات بے حد اہم تھی کہ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ہندوستانی مزاج کیا سوچ رہا ہے۔ اب جو مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری اس پر فخر کر رہی تھی کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد ڈھاکہ کی اردو فلم کا کاروبار ختم ہو چکا ہے اور جو بنگالی فلم کی روایت اردو میں منتقل ہو رہی تھی اس کا راستہ رک گیا تھا اور اب پاکستان کے فلم دیکھنے والوں کو ہندوستانی فلموں کی طرف رجوع کرنا ہوگا کہ خود ان کی فلم تقریباً پنجابی سینما میں ڈھلتے ہوئے تشدد، لاقانونیت اور فحاشی کی زد میں آ چکی ہے۔ ان کے فلمی پنڈت نے یہ پیشین گوئی کہ جلدی پاکستانی فلموں کا کاروبار لپیٹا جائے گا اور صفحۂ ہستی سے ان کا سینما مٹ جائے گا۔ وجہ یہ بتائی کہ پاکستان بننے کے بعد مشترکہ ہندوستان سے جو موسیقار ہجرت کر کے گئے تھے، بہت گنی اور خاندانی موسیقار تھے۔ انہوں نے سینما کو خوب فائدہ پہنچایا۔ سرحد پار سے تانیں ادھر بھی ہوا کے رخ پر آ جاتی تھیں اور ہم پہچان لیتے تھے کہ یہ تان جالندھر کی مٹی سے اٹھی ہے کہ پٹیالہ کی مٹی سے اور پھر بنگال نے بھی اپنا جادو دکھایا مشرقی پاکستان کی وجہ سے۔ اور اب وہ کھیل ختم ہونے کو ہے۔ گھرانوں کے موسیقار پیا گھر سدھارے۔ ان کی جگہ لینے والا وہاں اب نہیں رہے گا۔ ایک اور بات ہم نے بمبئی سینما کے ذریعے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں، مغلوں، نوابوں اور ریاست کے حکمرانوں کی زندگیوں کو عام آدمی کے لئے فلموں میں اس لئے پیش کیا کہ ہندوستان کے عوام کے ذہنوں پر ان کا بھوت کسی نہ کسی صورت موجود تھا۔ اس طرح ہندوستانی سینما عام آدمی کو اپنے آقاؤں کی زندگیوں پر بنا سینما بہت دلچسپی سے۔ یکتا ہا کہ اس نے اندر سے نہ محل دیکھے تھے نہ مہارانیاں دیکھی تھیں۔ ہندوستان کے سیٹھوں نے یہ مال خوب بیچا جیسے اجڑے ہوئے خانوادوں، محلوں اور راجواڑوں کی قیمتی اشیاء ان کے جانے کے بعد کباڑیوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ فلم کے سیٹھ وہ کباڑیے تھے جو یہ مال بیچ رہے تھے اور پاکستان کو بمبئی کی فلموں کا چربہ بنانے کی پہلے ہی دن سے عادت یا لت لگ چکی تھی۔ جب ایوب خان کے زمانے میں انڈین فلموں پر پابندی لگ گئی تو پاکستانی فلم ساز کابل جا کر ہندوستانی فلمیں دیکھ کر اس کا سارا اسکرپٹ لکھ کر لاتے تھے اور عین مین نقل کر کے پیسہ کماتے تھے لیکن بمبئی

سینما نے کروٹ لی اور اچانک عام آدمی کو ہیرو بنا دیا۔ امیتابھ بچن اسی کی پیداوار ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور سینما پیدا ہوا جسے حقیقت پسندانہ سینما کہا گیا تو ایسے میں پاکستانی سینما تو ہماری نقل پر لگا ہوا تھا۔ اس نے خود کو اسی ڈگر پر جاری رکھا۔ پاکستان کی حکومتوں نے تفریحی ٹیکس تو عوام کی جیبوں سے وصول کیا مگر کہیں بھی فلم کی تعلیم کا کوئی شعبہ کھولنے کی کوشش نہ کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ فلم بس مذاق ہے اور نقل سے بنائی جاتی رہے گی۔ اس طرح پاکستانی سینما اس سے آگے نہیں جا سکے گا۔

اب ان کا مورخ آیا اور میں اسے سننے آیا تھا۔ اس نے جو باتیں کیں وہ میرے لئے مستقبل کے پاکستان کا مکمل نقشہ تھا۔ ہندوستانی مورخ نے جو کہا وہ یہ تھا کہ جناح صاحب نے پاکستان نہیں بنایا، یہ انگریزوں نے بنایا ہے جن کی زمین پر کھڑے ہو کر میں لیکچر دے رہا ہوں۔ جناح صاحب نے صرف انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کئے اور انہیں ہندوستان کو تقسیم کرنے کا عوامی اور قانونی راستہ دکھایا۔ وہ ایسے کہ انگریزوں کو کوئی عوامی تحریک چاہئے تھی ہندوستان کو تقسیم کرنے کے لئے۔ جناح صاحب نے عوامی تحریک فراہم کر دی اور نہرو نے انہیں اپنی طرف سے اجازت دے دی کہ انہیں وہ تقسیم چاہئے تھی۔ اس سب کے نتیجے میں پاکستان بن گیا اور بظاہر انڈیا کی آبادی تقسیم ہو گئی، آدھی مشرقی پاکستان میں اور آدھی مغربی پاکستان میں۔ اس دوران ہندوستان کے جن صوبوں کے ٹکڑے ہوئے وہ بہت بڑے زخم ہیں ہندوستان کی اجتماعی یادداشت پر۔ یہ ٹکڑے پنجاب، بنگال، راجستھان اور کشمیر کے ہوئے اور کشمیر کے ٹکڑوں نے آنے والے سو دو سو سالوں تک پاکستان کو ماتم میں مبتلا رکھنا ہو گا کہ جناح صاحب کو ادراک ہی نہیں تھا کہ ہندو رہنما اور انگریز پرائم منسٹر چرچل کیا سوچ رہے ہیں۔ جناح صاحب قانونی آدمی تھے، نیک انسان تھے اور صاف شفاف کردار کے مالک تھے لیکن یہ کھیل تو انگریز کھیل رہا تھا۔ انہوں نے جناح صاحب کو پاکستان کے قیام کے جادو میں گرفتار کر لیا تھا کہ نہرو یہی چاہتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان تقسیم ہو جائیں تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہندو راج کا راستہ ہموار کر سکے اور پھر مسلمان جب ایک بار تقسیم ہوئے تو بار بار تقسیم ہوتے رہیں گے۔ کیسے بنگلہ دیش میں آدھے مسلمان پاکستان سے کٹ گئے۔ ابھی اور کتنی بار تقسیم ہوں گے۔ اس کا تاریخ ہمیشہ انتظار کرتی رہے گی۔ جناح صاحب کے پاکستان کو پاکستانی فوج نے گود لے لیا۔ یہ وہ فوج تھی جو انگریزوں کی سدھائی ہوئی تھی۔ اوپر سے نیچے تک ایک سسٹم میں جکڑے ہوئے۔ اسی لئے پاکستان میں بار بار فوجی حکومتیں آتی رہیں گی۔ بیچ میں کبھی جمہوریت کے نام پر انہی کی گود میں پلے ہوئے تاجر سیاستدان کی شیروانیاں پہن کے آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے۔ اصل باگ ان کے ہاتھ ہی میں

رہے گی۔ کیا جناح صاحب نے یہی خواب دیکھا تھا۔ کیا جناح صاحب کو معلوم تھا کہ جو مولوی ان کے پاکستان کی مخالفت کریں گے وہی پاکستان پر قبضہ کرنے کے لئے کئی فرقہ واریت کے گروہ بنائیں گے جو جتھے بنیں گے۔ جو مسلمانوں میں تقسیم در تقسیم پیدا کرتے جائیں گے اور پاکستان اندر ہی اندر فوج کی سرپرستی میں ان مذہبی جتھوں کو نام نہاد جمہوری حکومتوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کرتا رہے گا۔ وہ ان کے اشاروں پر مسلسل ملک میں تشدد اور بدامنی کے کلچر کو جاری رکھیں گے۔ اور پھر فوج جب چاہے گی اس کا فائدہ اٹھا کر اسلام آباد پر قابض ہو جایا کرے گی۔ اس دوران بلوچستان میں علیحدگی کی تحریکیں بنگلہ دیش کی طرح اٹھیں گی اور ایک دن وہاں بھی تقسیم کا عمل ہو سکتا ہے۔ یہ انڈین مورخ کی باتیں تھیں۔ لگتا تھا وہ کسی امریکی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ پاکستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کا تجزیہ تھا۔ پاکستان سے متعلق بہت سی تھیوریاں پورے یورپ اور امریکہ میں ہر طرح کے لیکچر میں موجود تھیں۔ پاکستان سب کی گفتگو کا دلچسپ موضوع تھا۔

اب وہاں ادیب کی گفتگو تھی جسے میں بہت پڑھ چکا تھا اور اس کی علمیت اور خطابت کا بہت قائل تھا۔ دراصل میں انہیں ہی سننے آیا تھا۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی پاکستان میں ادب اور ادیب ہی تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا یہ سب انڈین حکومت کی طرف سے بنگلہ دیش بننے کے بعد سپانسرڈ پروگرام تھا کہ پوری دنیا کو پاکستان کی آزادی کی متھ کے ٹوٹنے کی خوشخبری دے دی جائے اور اس کے لئے لندن سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی جہاں 1947ء میں چرچل نے ہندوستان کی تقسیم کو آخری شکل دی تھی۔ ہندوستان کے مقبول اور پاکستان میں بھی بے حد پسندیدہ ادیب نے کہ وہ پاکستان بننے سے پہلے بلوچستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بڑے بھائی کا کردار سنبھالتے ہوئے پاکستانی ادیبوں سے اپنے رشتوں کا ذکر کیا اور اپنے جنم کے مقام کو عزت دی اور ان کا بیان دونوں ملکوں کے ادیبوں کو سرحدوں سے ماورا، آپس کے رشتوں کو نبھانے کے لئے تھا۔ ان کی انسان دوستی شک سے بالاتر تھی اس لئے انہوں نے ہندوستان کو مشورہ بھی دیا کہ پاکستان سے ادب اور ثقافت کے رشتوں کے ذریعے انسانوں کو آپس میں ملاتے رہیں۔ کشمیر کے مسئلے کو آپس کے مذاکرات سے طے کریں۔ ان باتوں پر پہلے سے زیادہ تالیاں بجیں جس کا مطلب یہ تھا کہ لندن ہندوستان کے عوام کو ایک بار پھر متحد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ میں مشترکہ ہندوستان کی ساری قومیتیں مل کے رہنا سیکھ رہی تھیں اور یوں محسوس ہوا کہ چرچل نے جس ہندوستان کے وہاں ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے وہ ٹکڑے اب یہاں مل کر برطانیہ میں دوبارہ اس

مشتر کہ ہندوستان کو پالیں گے۔ وہ ادیب کہہ رہے تھے کہ سرحدیں ادب کی نہیں ہوتیں، موسیقی کی نہیں ہوتیں، زبانوں کی نہیں ہوتیں، فنونِ لطیفہ کی نہیں ہوتی، دلوں کی نہیں ہوتیں۔ شام ہو چکی تھی۔ یہ پیغام لے کر لائلپوری اور میں ''نہرو سینٹر'' سے نکلے اور ایک پب میں بیٹھ گئے۔ پب میں رش نہیں تھا۔ لائلپوری دو ڈرنک لے آیا اور ہم دونوں اس تجربے میں گھل مل گئے۔ ہم پہلے تو اپنے زخموں کو سہلاتے رہے جن کا احساس ''نہرو سینٹر'' میں ہونے والی گفتگو نے دلایا تھا پھر ہم پاکستان میں عوامی اور ترقی پسند تحریکوں کی ناکامی کے اسباب پر غور کر رہے تھے۔ آئینہ تو نہرو سینٹر نے دکھا ہی دیا تھا۔ ہم دونوں اس بات پر غور کرتے رہے کہ پاکستان کا ایک ''اردو مرکز'' ہے جسے ایک بینک کے سربراہ نے چلایا ہے لیکن وہاں غالب، اقبال اور فیض کے علاوہ کوئی گفتگو ہی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان سے جو بھی آتا ہے وہ ان تین موضوعات سے متعلق ہوتا ہے۔ سیاست پر بات اس لئے نہیں ہو سکتی کہ پاکستان میں مستقل مارشل لاء چھایا رہتا ہے۔ ایسے میں ''اردو مرکز'' میں جلاوطن شاعروں کی پذیرائی تو ہوتی ہے لیکن وہ ترقی پسند جلاوطن شاعر کھل کر بات کرنے سے ڈرتے ہیں کہ ان کے خاندان کے افراد تو پاکستان میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور یہ سب کو پتہ ہے کہ پاکستان میں لوگ اٹھائے جاتے ہیں اور عدالتوں کو ان کا سراغ نہیں ملتا۔

پب سے نکلے تو میری تو ویسے بھی منزل نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اپنے اس اپارٹمنٹ میں جانے کا فیصلہ کیا جو سرکارِ برطانیہ نے ترس کھا کر مجھے ایسٹ لندن کے کسی دوسری جنگ عظیم کے قیدیوں کی رہائش گاہ کے طور پر الاٹ کیا تھا۔ میں وہاں انڈر گراؤنڈ ریل سے پہنچا۔ پھر پیدل چل کے وہاں گیا۔ چابی لگائی اور اندر گیا تو بیٹھنے اٹھنے والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کے آگے سونے والے کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ جونہی میں داخل ہوا، مجھے کھمبے سے لگ کر کھڑی ہونے والی جیسمین کی ایسی آوازیں آئیں جیسی سیکس کرتے وقت اس طرح کی عورتیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انہیں اس مرد سے سیکس کرنے میں بے حد مزہ آ رہا ہے اور وہ ایک خاص ردھم میں ان آوازوں کا گراف تیار کر کے رکھتی ہیں۔ ایسا ہی مجھے محسوس ہوا لیکن میں نے بالکل غیر ارادی طور پر روشنی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ جونہی روشنی ہوئی، جیسمین کا سکول جانے والا بیٹا جو چھپ کے دیکھ رہا تھا، خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ ساتھ میں بیڈروم کے فرش پر میٹرس پر لیٹی جیسمین کے اوپر چھ فٹ کا سیاہ فام سمارٹ کسرتی جسم کے ساتھ پوری سیکس ایکسرسائز میں مصروف تھا۔ روشنی کے آتے ہی جیسمین نے نیچے سے پھریری لی اور وہ سیاہ فام اس اچانک حملے سے گھبرا گیا۔ اب میں نے دیکھا جیسمین سمجھ گئی میں اچانک آ گیا ہوں۔ اس نے سیاہ فام گاہک

سے کہا I am sorry, my roommate, I told you, get me to your place۔

میں نے اس سکول بوائے کو بھی دیکھ لیا تھا اور ساری بات سمجھ چکا تھا۔ اب اس کالے نے چڈی پہنی، قمیص کندھے پر رکھی، جینز اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔ ان دونوں کے درمیان جو طے ہوا ہوگا وہ پہلے ہی جیسمین لے لیا کرتی تھی اس لئے میں نے دیکھا کہ وہ سیاہ فام خاموشی سے چلا گیا اور جیسمین نے بھی اپنے مختصر سے کپڑے پہن لئے۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں تم گاہک کو لے کر آؤ گی اس لئے کہ تم نے اپنے بیٹے کے سکول کے لئے یہ فلیٹ مجھ سے لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں دھندہ کرو گی۔ وہ بچہ چھپ گیا تھا۔ جیسمین نے کہا۔ آج میری مجبوری تھی۔ یہ جو بلیک آیا تھا یہ میرا پرانا کسٹمر تھا۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ آج اس کے پاس جگہ نہیں تھی۔ میں نے لالچ کیا۔ وہ آ گیا۔ اس نے سو پونڈ پہلے دیئے پھر میں اسے اندر لے آئی۔ مجھے معاف کر دینا۔ معافی مجھ سے نہیں اپنے بچے سے مانگو جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اب میں نہیں جانتا اسے کیسے سمجھاؤ گی۔

''وہ جانتا ہے سب کچھ۔''

''تو پھر تم نے مجھ سے فلیٹ اس لئے کیوں مانگا کہ میں بیٹے کو پڑھانا چاہتی ہوں۔''

''ہاں میں اسے پڑھانا چاہتی ہوں۔ اس کا سکول قریب ہے مگر پڑھانے کے لئے فیس اور خرچہ تو چاہئے، وہ سب مجھے اس طرح کمانا پڑتا ہے۔''

اب میں رک گیا۔ مجھے سب سمجھ آ چکا تھا۔ اب میں اسے مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا ''مجھے بھول جاؤ، اپنے بیٹے کا خیال کرو اور صبح اسے وقت پر سکول لے جانا۔ میں یہاں اس ڈھلکے ہوئے صوفے پر سو رہا ہوں۔ بائے۔''

اب صبح میں اٹھا تو وہ بیٹے کو سکول چھوڑنے جا چکی تھی۔ مجھے یہ بات بے حد اچھی لگی گویا جورات کا منظر تھا وہ بجھ گیا تھا۔ میں جو رات کو مرا تھا، اب زندہ ہو گیا تھا۔ اب یہ روز مرنے اور جینے کا کھیل تو نہیں کھیل سکتا تھا۔ اس رات میں بھی اکیلا سویا، وہ بھی اکیلی سوئی کہ ہمارا بس ایک رات کا رشتہ تھا جو اب لگتا تھا سالوں میں بدلنے والا تھا۔ رشتہ محبت کا نہیں تھا، درد کا تھا اور ترقی پسند شاعروں نے مجھے یہی تو بتایا تھا کہ درد کا رشتہ ہی اصل ہوتا ہے۔ چاہے فیض ہو کہ کیفی اعظمی، جاں نثار اختر ہو کہ ساحر لدھیانوی یا پھر علی سردار جعفری یا مجاز، سب درد کے رشتے میں بندھے تھے اور پھر درد ہی نے انہیں فارغ کر دیا۔ وہ سب اپنے اپنے درد میں مبتلا ہو گئے اور اسی درد نے انہیں آ لیا اور وہ درد ہی میں امر ہو گئے یعنی ان کے چاہنے والوں

نے اس درد کو اپنا درد بنالیا اور وہ امر ہو گئے۔ اب میرے اور جیسمین کے درد کو کون سمجھے گا اور یہ درد کیسے امر ہوگا۔ اس رات میرا یہ مسئلہ تھا کہ میرا جلاوطنی کا فلیٹ ایک کال گرل نے مجبوری میں استعمال کر لیا تھا او وہ سب میرے سامنے ہو رہا تھا۔ کوئی بھی باہر کا آدمی رات یہ دیکھتا تو مجھے سچ مچ کا بھڑوا سمجھتا۔

میں باتھ روم میں جا چکا تھا۔ باہر آیا تو وہ کچن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ اُس لمحے بالکل ایسے محسوس ہوا وہ میری بیوی ہے اور ہم کافی عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آ رہے ہیں۔ وہ دو کپ چائے اور ڈبل روٹی کے ساتھ پنیر اور مارملیڈ کے ساتھ آملیٹ لے آئی۔ میں اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اچانک آنکھیں چار ہو گئیں۔ مجھے وہ بالکل نارمل عورت لگی جس کی رات اس کے دن کا حصہ نہیں تھی۔ چہرے پر ملال کی کوئی نشانی نہیں تھی۔ یہ میری بے وقوفی تھی کہ میں اسے اپنے ترازو میں تول رہا تھا جبکہ وہ کسی ترازو کی باٹ میں تلنے والا مال نہیں تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتہ کیا، اس نے بھی میں نے بھی کہ ہم دونوں اس فلیٹ میں اکیلے تھے، اجنبی تھے، پھر بھی ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میں اُس روز کیا کرنا چاہتا تھا معلوم نہیں تھا۔ میں ناشتے کے بعد لاتعلق سا اپنے ہی فلیٹ میں اجنبی تھا اور یونہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے کام کرتی رہی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے روزمرہ کے کام کیا ہوتے ہیں۔ آج میں دیکھ رہا تھا۔ دیکھ بھی کن اکھیوں سے رہا تھا۔ پہلے اس نے اپنے اور اپنے بیٹے کے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گئی۔ جیسا بھی اس فلیٹ کا باتھ روم تھا۔ اس نے وہ دھوئے مگر میں تو یہ سب نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اسی باتھ روم میں کھل کے نہائی۔ مجھے بھلا کیسے پتہ چلا۔ پانی کا بہنا بتا دیتا ہے کہ وہ پانی کس بدن پر گر رہا ہے۔ اس کا جسم میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بے حد خوبصورت تھا۔ نہ بھی ہوتا تو شرابی کو وہ جسم استعمال کرنے کے لئے کسی ناپ تول کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔ بس شراب ہی وہاں کھرا سکہ ہوتا ہے جو بولتا ہے۔ میں دن کی روشنی میں کسی بھی عورت سے نہ تو بے تکلف ہو سکتا تھا نہ ہی اس کے روزانہ کے معمول میں اپنی جنسی ضرورت کو سامنے لا سکتا تھا کہ میرے اندر کا شاعر مجھے منع کر رہا تھا۔ ہاں میں شاعر نہ ہوتا، کوئی شاعر ہوتا یا کوئی اور طرح کا دکاندار ہوتا تو شاید جیسمین کا ریپ کر دیتا یا پچاس پاؤنڈ دے کر صبح ہی صبح اس کی رات کا رزق بنا دیتا لیکن میں شاعر تھا اور وہ ایک عورت تھی۔ ان دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ وہ بے چاری مشقت کر کے جب فارغ ہوئی تو میں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے پوچھوں کہ اسے چائے چاہیئے۔ اس نے کہا ''ہاں چائے پینا چاہتی ہوں۔'' میں اپنے ہی کچن میں گیا اور دو چائے کے کپ بنائے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور رات کی شرمندگی کو کسی حد تک مدھم کرنے کی کوشش کی۔

ظاہر ہے میں کوئی فائدہ اس کے جسم کی موجودگی کا نہیں لینا چاہتا تھا کہ ہر غیر انسانی فعل میرے کردار سے باہر تھا۔ اگر چہ میں بھی عام سا آدمی ہوں اور مجھے اپنے ضمیر کی ٹھیکیداری کبھی بھی قبول نہیں رہی اور میں بے ایمانی کو بھی کبھی کبھی روا سمجھتا ہوں لیکن اس روز میں نہ تو بے ایمانی کے حق میں تھا نہ ہی ضمیر کو سلانا چاہتا تھا۔ میں ایک انسان کے طور پر اسے قبول کرنا چاہتا تھا کہ اس طرح میں بھی ایک انسان کے طور پر خود کو محسوس کر سکتا تھا۔ جب آپ دوسرے انسان کو رتبے سے گراتے ہیں تو اس کے ساتھ آپ خود بھی رتبے سے گر جاتے ہیں۔ یہ بات کوئی نہیں سمجھتا کہ جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا ہے تو دو قتل ہو جاتے ہیں اور جب کوئی شخص دوسرے کو بے عزت کرتا ہے تو دو شخص بے عزت ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود کو بچالیا اور جیسمین سے کہا ''میں جا رہا ہوں۔ جب بھی آؤں گا رات کو تو لائٹ نہیں جلاؤں گا۔ کوشش کروں گا رات کو نہ آؤں۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے اچانک آپ کو آپ کے معمول سے روکا۔''

''نہیں یہ میرا معمول نہیں ہے۔ اتفاق سے ہوا تھا، آپ کو بتایا تھا کل رات۔''

''ہاں یاد ہے۔ اوکے۔ اپنے بیٹے پر توجہ دو۔''

میں جانے لگا اور دروازے پر آیا تو وہ پیچھے سے آئی اور اس نے میری کمر کے گرد بانہیں دائرہ کر لیں۔ میں مڑا تو اس نے اتنا کہا کہ ''یاد ہے اُس رات میں نے تمہیں اپنے ہونٹ چومنے نہیں دیئے تھے اور کہا تھا یہ ہونٹ صرف میرے بیٹے کے لئے ہیں۔''

''ہاں یاد ہے۔''

''تو اب میں کہتی ہوں کہ یہ ہونٹ میرے بیٹے اور آپ کے لئے ہیں۔''

اور پھر اس نے وہ ہونٹ میرے ہونٹوں پر پیوست کر دیئے۔ وہ پورے اطمینان سے میرے ہونٹ چومتی رہی۔ میں نے بھی اسے وہی گرمائش دینے کی کوشش کی اور پھر ہم دونوں ایک محبت سے جدا ہوئے اور میں چلا گیا۔

میں طیفا بٹ کے ہوٹل پہنچا تو سولنگی جیسے میرا انتظار کر رہا تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ عام طور پر طیفا بٹ کے ہوٹل میں دوپہر کے گاہک کم ہوتے تھے کیونکہ شرابی حضرات دن میں اپنے کام پر ہوتے تھے۔ اب سولنگی کہاں جاتا۔ وہ ایک دَم خوش ہو گیا۔ ''او سر جی! آپ کو جتوئی اور رضوی صاحب نے بلایا ہے کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ ان کے ہاں آ رہی ہیں۔ آپ کو خاص الخاص بلایا ہے۔'' میں چونکا کہ بے نظیر بھٹو یہاں ہیں تو جلا وطنی میں اب وہ کیسے شہید بابا کی پھانسی کو اپنے حق میں استعمال کریں گی۔ میں تو سیاسی

کارکن تھا نہ سیاسی نظریاتی مدبر۔ میں تو بس ترقی پسند شاعر تھا اس لئے میرے جذبات بہت واضح تھے۔ اب خاص الخاص سندھی لوگ روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اس لئے یہ میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ میٹنگ شام کے قریب تھی اور وقت کی پابندی لازمی تھی۔ سو میں سولنگی کے ساتھ ہی جتوئی صاحب کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ چونکہ سولنگی کو کچھ کھانے کے لئے بنانا تھا۔ اگرچہ بتایا گیا کہ بی بی صاحبہ کا کھانا نہیں ہے، بس پارٹی میٹنگ ہے۔ اب میں وہاں سولنگی کے ساتھ ہی رہا اور انتظار کرتا رہا۔ وقت پر بی بی صاحبہ آئیں۔ ایک دبلی پتلی کمزور سی لڑکی جس نے پوری پاکستانی افواج کے جرنیلوں پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ آخر کیا اس کے اندر کی طاقت تھی کہ اس پر دنیا کے دروازے بند کرنے کے لئے پوری پاکستانی ناجائز حکومت کا اثر ورسوخ چل رہا تھا۔

برطانیہ میں بی بی صاحبہ کے پاس حکومت وقت کو چیلنج کرنے کے لئے کافی گراؤنڈ موجود تھا۔ اقوام متحدہ، یورپی اقوام، آزادی پسند دنیا اور عالمی پریس جس کی غذا ہی جمہوریت پرستی ہوتی ہے، وہ سب وہاں بی بی صاحبہ کے غلام تھے۔ اب بی بی صاحبہ کیا کرتی ہیں، اسی کا سب کو انتظار تھا۔ بی بی صاحبہ جو کہ آکسفورڈ سے پڑھی تھیں اور شہید بابا نے خصوصی تربیت کی تھی، اب اس کی آزمائش تھی۔

بی بی صاحبہ کے ساتھ دو خواتین اور بھی تھیں، تینوں چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان سب کا استقبال جتوئی صاحب، رضوی صاحب اور سردار صاحب نے کیا۔ تینوں بھٹو کابینہ میں بھی تھے اور تینوں تین صوبوں کے اپنے اپنے علاقے کے وڈیرے بھی تھے مگر تینوں میں ایک قدرِ مشترک تھی کہ تینوں دنیا کے بڑے اداروں سے تعلیم یافتہ اور بے حد سلجھے ہوئے تھے۔ انگریزی ان سے بہتر کوئی نہیں بول سکتا تھا۔ میں ایک طرف بیٹھا تھا۔ جتوئی صاحب نے چند اور لوگ بھی کہ لندن میں ان کے خاص لوگ تھے، بلا رکھے تھے۔ بی بی صاحبہ نے صاف صاف منع کیا تھا کہ یہ بڑا جلسہ نہیں ہوگا، یہ بس پارٹی کی اندر کی میٹنگ ہوگی اور ادھر سے کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔ اب میٹنگ شروع ہوئی تو جتوئی صاحب نے میرا تعارف کرا دیا کہ یہ وہ ترقی پسند جیالا شاعر ہے جسے بھٹو کی پھانسی کے بعد لاہور کے قلعے میں ٹارچر سیل میں رکھا گیا۔ وہاں سے یہ سیدھا جلاوطنی کی فلائٹ میں یہاں آیا۔ اس پر بی بی صاحبہ نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اسی طرح اور لوگ بھی پہچانے گئے۔ اب اس تقریب میں جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ بی بی صاحبہ کے سامنے کوئی بول نہیں رہا تھا کہ سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ کیسے پارٹی کو اپنی رہنمائی میں بنیادی احکامات دیتی ہیں۔ میرے لئے بھی ان سے ملنے اور ان کے لائحہ عمل کو جاننے کا پہلا موقع

تھا۔ وہ کمزور سی لڑکی بولی تو کیا بولی۔

شہید بابا نے آخری ملاقات میں میرے ذمے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ میں پارٹی کی قیادت کروں گی۔ اب فوجی حکومت مجھے کسی بھی صورت پاکستانی عوام سے ملنے نہیں دے گی۔ برطانیہ اب ایک چھوٹے پاکستان میں تبدیل کرنا ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے وہ اسی لانچنگ پیڈ سے کرنا ہے۔ ہمارے پاس زمین تنگ ہو چکی ہے۔ صرف انگلینڈ ہمیں جگہ دے رہا ہے۔ عرب دنیا اپنے مقاصد کے لئے ہماری فوج کے ساتھ ہے۔ امریکہ تو ظاہر ہے ہوتا ہی فوج کے ساتھ ہے۔ انگلینڈ کیوں ہمیں جگہ دیتا ہے کہ اس کے بوئے ہوئے بیج کی یہ ساری فصلیں ہیں اور وہ بھی دنیا کے لئے جمہوریت پسندی کا راگ الاپ کر ہیرو بننا چاہتا ہے اور اس کے پاس پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے ذریعے وہ دنیا کے ممالک کی منڈی میں اپنی عزت رکھ سکتا ہے۔ اس طرح یہ انگلینڈ کی مجبوری اور ہماری بھی مجبوری ہے۔ اب جتوئی صاحب نے بی بی صاحبہ سے میرا تعارف کرادیا۔ یہ جی اپنا شاعر ہے جی، شاہی قلعے میں اس پر بڑا تشدد ہوا تھا۔ بھٹو شہید پر نظم لکھی تھی۔ اسی جہاز میں یہ بھی آیا ہے جس میں ہمارے بہت سے ورکرز، سیاسی لیڈرز اور نظریاتی ساتھی آئے ہیں اس لئے یہ لندن میں ہمارے سب ترقی پسند ساتھیوں سے واقف ہے۔ یہ لندن میں کوئی بھی ڈیوٹی کر سکتا ہے۔ اب بی بی صاحبہ نے مجھے دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''پارٹی آپ جیسے شاعروں اور ورکروں کی قربانیوں کو نہیں بھولے گی۔ ہم دوبارہ اقتدار میں آئیں گے تو جو غلطیاں پارٹی نے کی ہیں وہ نہیں دہرائیں گے۔ ہم ورکرز اور قربانیاں دینے والوں کو ٹکٹ دیں گے۔'' اس پر میں نے گستاخی کی اور کہا ''بی بی صاحبہ مجھے یہاں آپ سے اختلاف ہے۔ ٹکٹوں کے معاملے میں آپ کو دیکھنا ہوگا کون جیت سکتا ہے، کون نہیں جیت سکتا۔ مجھے عوام نہیں جانتے۔ میری تو ضمانت ضبط ہو جائے گی۔ پارٹی کو جیتنے والے چاہئیں، جو پیسہ خرچ کر سکیں کہ اب سیاست کو پیسے کا تڑکا لگ چکا ہے۔'' اس بات پر بی بی صاحبہ چونکیں......اور بولیں ''آپ نے یہ کیسے پہچانا ہے۔''

''دیکھیں بی بی صاحبہ! ضیاء الحق اپنی Legacy بنا رہا ہے اور وہ یہ Legacy چھوڑ جائے گا اور وہ یہ ہے کہ اس نے سیاست دانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے انہیں خریدنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے اپنی شوریٰ بنانے کے لئے بہت کچھ رشوت کے طور پر انہیں آفر کی تھی اور اب سول حکومت بنوانے کے لئے سیاست دانوں کی وفاداریوں کو توڑنے کے لئے بہت بڑی قیمت لگا رہا ہے اور وہ کلاشنکوف کلچر کے ساتھ پاؤڈر کلچر کو اپنے لئے استعمال کر رہا ہے۔''

''یہ پاؤڈر کلچر کیا ہے؟'' بی بی صاحبہ نے پوچھا۔

''پاکستان اور افغانستان میں پاپی کی کاشت ہوتی ہے جس سے ہیروئن بنتی ہے اور پاکستان سے وہ دنیا میں جاتی ہے۔ اس کی آمدنی سے ایک طبقہ دبئی اور پاکستان میں پروان چڑھ رہا ہے۔ وہ سیاست دانوں کو خریدنے کے لئے استعمال ہوگا۔ اسے میں نے سیاست میں پیسے کا تڑکا کا نام دیا ہے۔''

کچھ دیر بی بی صاحبہ سوچتی رہیں اور پھر کہنے لگیں: ''ہم آپ سے کام لیں گے۔ آپ نے جو بات کی ہے یہ ہر فاشسٹ حکومت کا آسان راستہ ہوا کرتا ہے۔ میں تاریخ اور سیاست کی سٹوڈنٹ ہوں۔ میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں اور میں آج آپ سب کو بتا رہی ہوں کہ جب سیاست اور حکومت میں پیسہ آ جاتا ہے تو وہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ گیم رکے گی نہیں، یہ ہر الیکشن میں پہلے سے زیادہ بڑھے گی اور ایک وقت آئے گا پاکستان کی اسمبلیوں میں صرف مارکیٹ مافیا اور تاجروں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا لیکن ہماری پارٹی اس ضیاء الحقی کلچر کا راستہ روکے گی اور ہم مڈل کلاس کو ٹکٹ دیں گے اور جتوائیں گے۔ میں نے پاکستان جانا ہے۔ میں بھٹو کی بیٹی ہوں۔ دنیا کو بھٹو صاحب کی پھانسی گلے میں اٹکی ہوئی ہے اور یہ اٹکی رہے گی جب تک اس کی بیٹی اس کا بدلہ جمہوریت کی بحالی کی شکل میں نہیں لے لے گی۔''

مجھے بی بی صاحبہ کی باتیں عملی سیاست کے قریب محسوس ہوئیں۔ اب کئی لوگ بولے کہ سب کو بی بی صاحبہ پر اپنا وفاداری کا چہرہ دکھانا تھا اور وہ واضح طور پر وفادار بھی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ اب بی بی صاحبہ نے براہِ راست مجھ سے بات کی:

''آپ سے مجھے امید ہے کہ آپ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ اگر لندن میں پارٹی کو آرگنائز کر سکیں تو اس وقت لندن میں تین طبقے پاکستانی سیاست کے یہاں جلاوطنی کے علاوہ بھی آباد ہو چکے ہیں۔ ایک تو ورکر کلاس ہے جو پارٹی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو سیاست کی وجہ سے جلاوطن ہو کر آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو جتوئی صاحب اور رضوی صاحب کی طرح پارٹی کے وڈیرے یا جدی پشتی سیاست میں ہونے کی وجہ سے اسمبلیوں میں ہوتے ہیں۔ اب ان تینوں کو آپ نے ایک صفحے پر لانا ہے، کیا کر سکو گے؟''

اس سے پہلے کہ میں بولتا، جتوئی صاحب بولے ''بی بی صاحبہ! یہ کر لے گا کہ اس کے تینوں سے رابطے ہیں اور یہ تینوں میں بہت مقبول ہے۔''

''لیکن جتوئی صاحب! تینوں میں رابطہ اور Confidence کو بنانا ہوگا۔''

''وہ یہ کرلے گا۔''

''اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ فوجی حکومت یہاں بھی اپنا اثر استعمال کر رہی ہے۔ آپ سب کو یہاں بھی ڈرائیں گے، خریدیں گے اور آپ کو ہر طرح کے حربے سے متاثر کریں گے۔''

رضوی صاحب اب بولے ''بی بی صاحبہ بات یہ ہے کہ یہ لندن ہے اور یہاں سے ہم ہر طرح کا پیغام اپنے عوام کو دے سکتے ہیں۔ کیونکہ بی بی سی پر پاکستان میں ابھی تک اعتبار قائم ہے اور وہاں سوچنے والے بھی اور عوام بھی بی بی سی کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''آپ کو پتہ ہے مارک ٹیلی پورے ہندوستانیوں کے دل کی آواز ہے۔'' بی بی صاحبہ نے کہا۔

جتوئی صاحب بولے ''بی بی صاحبہ میں نے اپنے شاعر کو ایسے نہیں بلایا۔ یہ Grass Root Level کا بندہ ہے۔ یہ آپ کے لئے اِدھر Movement بنا سکتا ہے جو آپ کو ایک دن جہاز کے ذریعے لاہور میں لینڈ کرادے گی۔''

''مسٹر Poet، آپ یہ کرلو گے۔'' بی بی بولیں۔

''بی بی صاحبہ میں پولیٹیکل ورکر نہیں ہوں، نہ ہی میں Activist ہوں، نہ ہی میں کسی سٹڈی سرکل میں نظریاتی سیاست کا تربیت یافتہ ہوں۔''

''بس تم میرے معیار پر پورے اترے ہو، ہمیں وہ نہیں چاہئیں، ہمیں جیالے چاہئیں اور تم جیالے ہو۔ جو شاہی قلعے کی مار کھا سکتا ہے وہ جیالا ہے۔ اب مجھے جیالوں کی فوج چاہئے، تم یہ کام کرو گے۔''

''بی بی صاحبہ میں یہ کام تو کردوں گا مگر میں بہت کمزور انسان ہوں۔''

''دیکھو تمہاری کمزوری ہی تمہاری طاقت ہے۔ کمزور ہی اٹھا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی طاقت ور طاقت ور کے سامنے نہیں اٹھا کرتا۔ وہ تو آپس میں سمجھوتے کرتے ہیں۔ جیسے کوئی پیٹ بھرا ہوا انسان بھوکے کو روٹی نہیں دے سکتا۔ ہمیشہ بھوکا ہی بھوکے کو روٹی دیتا ہے۔ ہمیشہ بے لباس ہی ننگے کو لباس دیتا ہے کہ تمام بھوکے اور تمام ننگے ایک زنجیر بنتے ہیں اور وہ زنجیر کوئی توڑ نہیں سکتا۔''

بی بی صاحبہ کی اس بات کے سامنے میں کیا بول سکتا تھا۔ بس اتنا کہا ''جو حکم بی بی صاحبہ۔''

اب جتوئی صاحب اور رضوی صاحب کی جان میں جان آئی اور بی بی صاحبہ نے اٹھتے ہی کہا ''مجھے ایک ہفتے میں خطاب کرنا ہے یہاں پاکستانیوں سے تو اس کا بندوبست جتوئی صاحب آپ کی ذمہ

داری ہے۔" اور وہ چلی گئیں۔ اب ساری ذمہ داری مجھ پر آ چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا اتنی بڑی پارٹی، اتنے بڑے دکھ کا انحصار صرف میرے جیسے نحیف سے شاعر پر۔ تو مجھے یاد آیا کہ شاعر ہی سارا بوجھ اٹھاتے رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ شاعری بہت بڑی طاقت ہے۔ میر تقی میر، غالب، نظیر اکبر آبادی نے کیا یہ بوجھ نہیں اٹھایا تھا...... پھر سودا نے، پھر جعفر زٹلی نے، پھر ان سب سے پہلے امیر خسرو نے اور پھر کبیر داس نے اور پھر ہم سیدھے علامہ اقبال پر آتے ہیں اور پھر فیض نے، پھر ناصر نے، پھر منیر نیازی نے، پھر ن م راشد نے، مجید امجد نے، احمد فراز نے اور بس......

اب میں جانے لگا تو جتوئی صاحب بولے "ناں بابا ناں، ایسے کیسے جا سکتے ہیں، ابھی تو شام کی شروعات ہے۔ وہ تو ہم بی بی صاحبہ کے سامنے چونچ نہیں ہلاتے ناں کہ وہ ہماری لیڈر ہیں۔ اب آپ کو بغیر کھائے پیئے تو نہیں جانے دیں گے، ویسے بھی اب کچاہری کا ٹیم ہو گیا ہے۔ اوئے چھورا، گلاس وہسکی لگا۔ رضوی صاحب بھی پیاسے بیٹھے ہیں۔"

اب سولنگی اور اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا جو یہ کام کرتا تھا۔ دونوں نے کچاہری کو گرما دیا اور اس دوران میں نے پارٹی کی تنظیم سے متعلق کئی سوال کیئے مگر جتوئی، رضوی اور ملک صاحبان اس وقت پارٹی معاملات میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں پاکستان میں اپنے کاروبار، زمینوں اور مفادات کی فکر تھی اور مسلسل گفتگو میں انہیں اس بات کی فکر تھی کہ ضیاء الحق کے غیض وغضب سے کس طرح اپنی جائیدادوں اور مفادات کو بچانا ہے اور ایسے میں جس بات نے مجھے چونکا دیا وہ تینوں فوج میں اپنے اپنے تعلقات کے جرنیلوں کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے داؤ پیچ آزمانے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

اُدھر پاکستان میں کیا ہو رہا تھا؟ داخلی طور پر پاکستان کو اندر ہی اندر کئی طرح سے تقسیم کرنے پر کام ہو رہا تھا۔ کسی کو اس کی فکر نہیں تھی کہ جو بیج ضیاء الحق بو رہا ہے وہ اس کا ماسٹر مائنڈ نہیں، کسی بڑے ملک کے مفادات کا اس سے تعلق ہے اور اس حوالے سے مسلسل جو خبریں آ رہی تھیں، ان سے معلوم ہو جاتا تھا کہ سندھ کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کیا جا رہا تھا۔ بلوچ، سندھی اور مہاجروں کے درمیان کراچی کی تقسیم کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس کا اثر پنجاب پر بھی پڑنے لگا بلکہ نامعلوم طریقوں سے وہ لوگ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پنجاب کے علاقوں میں آئے، وہ رحیم یار خان سے ملتان اور پھر ملتان سے لاہور اور پھر سارا جی ٹی روڈ تک پھیلے شہروں میں مقامی باشندوں پر کاروبار میں سبقت لے رہے تھے اور وہ مقامی تجارت سے پھیل کر بین الاقوامی تجارتی منڈیوں تک ہاتھ بڑھا رہے تھے اور ان کی اگلی منزل سیاست تھی کہ ان کو

اپنی تجارت کے لئے کسی تاجر کی چھتری چاہئے تھی جو انہیں بھی اسمبلیوں کی زینت بنائے اور خود بھی وزیر اعظم کا منصب سنبھالے۔ضیاء الحق نے ان تاجروں، صنعت کاروں کو سیاست دانوں کا ٹیگ لگانے کی قیمت بھی مقرر کر دی تھی۔ وہ قیمت یہ تھی کہ کچھ جرنیل کارپوریٹ سیکٹر کا سہارا لے کر مڈل مین کا کردار ادا کر رہے تھے اور اس طرح دولت کی تقسیم مساوی طریقے سے جاری تھی اور اس میں رئیل اسٹیٹ کے کاروبار نے اپنا کردار ہر طرح سے ادا کیا اور اس کاروبار نے پاکستان میں بہت دور جانا تھا اور پاکستان سے کسانوں کو بے روزگار کرنے میں اپنا حصہ ڈالنا تھا۔ مستقبل کی پاکستانی اسمبلیاں ان تاجروں اور صنعت کاروں کے استقبال کے لئے تیار تھیں جو پاکستان بننے کے بعد سرحد کے اس پار سے آئے تھے۔

ضیاء الحق نے مزید یہ کام کیا کہ مذہبی بنیادوں پر پاکستان کو مزید تقسیم کرنے کے لئے دینی مدارس کو بے طرح سے گرانٹیں دینے کے ساتھ زمینیں، عمارتیں اور لامحدود وسائل کی سہولیات دینے سے فرقہ واریت کے جن کو بوتل سے نکال دیا جس نے اگلے کئی سو سالوں تک پاکستان کی سیاست، ثقافت، تہذیب و تمدن کو اپنی مرضی سے مرتب کرنا تھا۔ضیاء الحق نے یہ بھی کیا کہ افغانستان کی دلدل میں ہماری فوج کے بوٹ ڈال دیئے جو اگلے کئی سو سالوں تک نہیں نکل سکتے تھے۔ایک فوجی حکمران اتنا زیرک ہو گا کہ پاکستان اور اس کی سوسائٹی اور عوام کی تباہی کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ یہ کوئی آئن سٹائن بھی نہیں سوچ سکتا تھا مگر اس نے کر دکھایا۔

رات گزر رہی تھی اور میں لندن کی سڑک پر آ گیا اور پھر لندن کی سڑکیں ساری رات مجھے ادھر ادھر گھماتی رہیں۔لندن رات میں کچھ اور ہوتا ہے، دن میں کچھ اور۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ نہ اپنے ایسٹ لندن کے فلیٹ میں جہاں جیسمین اپنے جسم کی قیمت وصول کر کے لیٹی ہو گی اور تھکی ہوئی عورت کے ساتھ میں اپنی جنسی مجبوری کو پورا کرنے کے حق میں نہیں تھا اور پھر میں سوچنے لگا کہ جو کام مجھے بی بی صاحبہ نے سونپا ہے وہ کیسے پورا ہو گا۔ یہ برطانیہ بھی عجیب ہے، 1947ء میں ہندوستان کے تین ٹکڑے کئے اور اب ان تین ٹکڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے اپنے ملک میں دوبارہ ہندوستان کو جوڑ کے ایک کرنا چاہتا تھا اور ایک ایک چھوٹا ہندوستان ہر شہر میں آباد ہو رہا تھا۔لندن، برمنگھم، بریڈفورڈ، مانچسٹر اور گلاسگو میں چھوٹے چھوٹے ہندوستان تشکیل پا چکے تھے اور جن کو ملال تھا کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا وہ یہاں آباد ہو کر اپنا رومانس اور ناسٹلجیا پورا کر سکتے تھے۔میں دیکھ رہا تھا کہ یہ چھوٹے ہندوستان قائم تو ہو رہے ہیں پھر کہیں ان میں بھی علیحدگی کی تحریکوں نے سر اٹھایا تو یہاں کے چھوٹے ہندوستان کو بھی برطانوی سرکار پھر

سے تقسیم کر دے گی۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جا کر سو جاؤں کہ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر مجھے بھٹو شہید کی پارٹی کے تینوں طبقوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے تو مجھے اسی اخبار کی ضرورت پڑے گی جس سے میں ذرا سا غافل ہو چکا تھا۔ اس کے دفتر کی چابی میرے پاس تھی۔ میں نے سوچا رات اسی دفتر میں گزاروں اور پھر سے اس کو دوبارہ نئی زندگی دے کر اپنا کام کر جاؤں۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ دفتر بند تھا۔ اسے کھولا اور سو گیا۔

اگلے روز ہوش سنبھالا اور اخبار ''صدائے پاکستان'' کے مالک اور چیف ایڈیٹر نذیر خیالی کو فون کیا کہ میں دفتر میں ہوں اور اب اس اخبار نے ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس پر محمد نذیر خیالی پسروری نے کہا ''بھائی صاحب دانشوری اور شاعری سے اخبار نہیں چلا کرتے۔ یہ عیاری اور مکاری سے چلتے ہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ پاکستان کے تمام بڑے اخباروں کے مالکان نے کیسے کیسے حکمرانوں کے ساتھ ٹھگی کی، عیاری کی، مکاری کی، کیا کیا مراعات فوجی حکومتوں سے یا تاجر جمہوری حکومتوں سے لیں اور آج وہ میڈیا ایمپائر کے خواب دیکھ رہے ہیں۔''

''خیالی صاحب آپ کی سیاسی اور تاجرانہ بصیرت پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو پاکستان میں کسی بہت بڑے لینڈ مافیا کا ٹائیکون ہونا چاہئے تھا۔''

''وہ بھی بن جاؤں گا۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے اخبار کو یہاں ہر فرقے کا مولوی چلا رہا ہے۔ وہ مجھے اتنے پیسے ہر ہفتے دے رہے ہیں کہ میں کچھ نہ بھی کروں تو پاکستان میں جائیدادوں پر جائیدادیں بنا سکتا ہوں۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ میں مولویوں سے کمائی کر رہا ہوں۔''

''میں سوچ سکتا ہوں کہ مولوی حضرات یہاں کے مسلمانوں کے جذبات، اداسی، تنہائی، ثقافتی و مذہبی محرومی سے فائدہ اٹھا کر خوب کمائی کر رہے ہیں اور آپ یعنی محمد نذیر خیالی اس کے حصہ دار ہیں۔''

''او کے تو اب بولو کیا چاہتے ہو۔''

''آپ کے اخبار کو جمہوریت پسندی کا تڑکا لگانا چاہتا ہوں کہ اب یہ وقت کی ضرورت ہے۔''

''اشکے بھئی، اشکے، میری جان، کُھل کھیلو، اس اخبار کو اپنی رکھیل یا داشتہ سمجھو۔ جیسے جی چاہے استعمال کرو۔''

فون بند کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اخبار ہوتا کیا ہے ایک چوراہے پر لگا ہوا بورڈ جس پر جو بھی کچھ لکھ جائے پڑھا جائے گا۔ اسے کوئی بھی استعمال کرے اس نے تو استعمال ہونا ہے۔ اب مجھے بی بی

صاحبہ کے لئے پارٹی کو ایک جگہ جمع کرنا آسان دکھائی دینے لگا۔ میں نے پوری تیاری کر لی کہ کس طرح اخبار کو پورے لندن اور دوسرے شہروں تک پہنچانا ہے اور پارٹی کے مقاصد کے لئے اشتہار کہاں کہاں سے نکالے جا سکتے ہیں۔ گویا اس اخبار کو صرف ایک ہی آدمی نے چلانا تھا۔ میں نہ سیاسی لیڈر تھا نہ کارکن، میں ایک شاعر تھا جسے ایک نظریاتی عمل میں متحرک ہونا تھا اور مجھے اس اخبار کا اتفاقی سہارا ملا تھا۔ میں نے دو کام کئے۔ ایک تو مولویوں کے مقابلے پر ترقی پسند خیالات کو برابر کا مقام دینے کا فیصلہ کیا کہ اخبار دونوں طرح کے خیالات کے حامل پاکستانیوں میں مقبول ہو جائے۔ میں نے یہ اس لئے کیا کہ پاکستانی اخبارات بھی اسی سے خود کو مقبول بنا رہے تھے یعنی جنرل سٹور کھول دو، سب کا مال رکھ دو، جو بھی گاہک آئے اسے اپنی پسند کا سامان مل جائے۔ اخبار کو جنرل سٹور تو بننا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اسی کا فائدہ اٹھایا اور پھر میں نے یہ دیکھا کہ اخبار کو پھیلانا تو ایک اور کام ہے۔ اخبار کی کاپی تو میں خود بنا لیتا تھا جس میں بی بی صاحبہ کے بیانات، ضیاء الحق کی پاکستان میں انسان دشمن پالیسی اور لندن میں جلاوطنی سے گزرنے والوں کے خیالات وغیرہ میں نے اخبار میں لگانا شروع کر دیئے تھے۔ اب معاملہ اخبار پھیلانے اور بیچنے کا تھا۔ میں ان علاقوں کو جانتا تھا جہاں جلاوطن پاکستانی اور روزی کمانے والے پاکستانی رہتے ہیں۔ میں نے اخباروں کے بنڈل اٹھائے اور ہر بڑے سٹور پر رکھ دیئے۔ اخبار کی سرخی سبزی گوشت اور انڈے خریدنے والے کو پکڑ لیتی تھی مثلاً میں کیا سرخیاں لگاتا تھا ''بی بی جیل سے اسمبلی تک، پارٹی ختم نہیں ہوئی، ظالموں کی موت آج یا کل، کارکن اور رہنما ایک جان ایک قالب، جتنے کوڑے مارو گے اتنے بھٹو نکلیں گے۔'' میری کوشش کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اخباروں کے بنڈل دوسرے شہروں میں بھی پہنچائے جا رہے تھے۔ جب مذہبی فرقوں کے مقامی رہنماؤں نے ایک روشن خیال سیاسی جماعت کو اپنے مضبوط اخبار کے صفحات پر پاؤں پسارتے دیکھا تو وہ اور اشتہارات دینے کے لئے اور خبریں لگوانے کے لئے سرگرم ہو گئے۔ اخبار کے مالک نذیر خیالی کو اب اندازہ ہوا کہ میں نے اخبار چلانے کے لئے کیا نسخہ استعمال کیا ہے۔ وہ سارا دن اشتہاروں کے معاوضے اکٹھے کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔ اب وہ مجھے بھی ذرا زیادہ پیسے دینے لگا تھا۔ کچھ کاروباری ادارے اور کیش اینڈ کیری کے بزنس کے جیالوں نے اشتہار دیئے اور کچھ جتوئی اور رضوی کے ساتھ بی بی صاحبہ سے مستقبل کے الیکشن کو سامنے رکھتے ہوئے ٹکٹ لینے کے خواہاں نیم سیاست دانوں اور نیم کاروباری قسم کے پاکستانیوں نے کہ وہاں عارضی قیام پذیر تھے یا دور بدلنے کی وجہ سے خود اختیاری جلاوطنی کے نتیجے میں یہاں آ گئے تھے اور اپنا کاروبار بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اشتہار دینے شروع

کر دیئے۔ اب تو نذیر خیالی کے مردہ گھوڑے میں جان آ گئی۔ اسے یہ گر معلوم ہو گیا کہ دونوں قسم کے مخالف نظریات کو اخبار میں آمنے سامنے کھڑا کر دینے سے اخبار کی صحت پر کتنا اچھا اثر پڑتا ہے۔

نذیر خیالی میں یکدم تبدیلی آ گئی۔ وہ ثقہ قسم کا ایڈیٹر بننے کی مشق کرنے لگا مثلاً اس نے مجھ سے مشورہ کر کے کالم نویسی کو رواج دینے کی بات کی۔ کچھ لیڈی رپورٹروں کے لئے مشورہ کیا۔ اخبار کی اشاعت بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ ساتھ میں اس نے مقامی پاکستانی کمیونٹی سے رابطے کے لئے کیبل پر پاکستانی ڈراموں اور سٹیج ڈراموں کو شروع کرنے کے لئے نیٹ ورک بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک دن وہ میڈیا ایمپائر کھڑی کر دے گا۔ اشتہار جمع کرنے کا اسے راستہ مل گیا تھا۔ ادھر میں نے رابطے کے لئے اپنے تمام تعلقات کو استعمال کیا تو شاعروں میں لائلپوری اور اس کے گروپ کے تمام شاعروں کو بی بی صاحبہ سے ملنے کی اُمنگیں پروان چڑھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جلاوطن حکومت کے تمام وزیروں اور وزیر اعظم صاحب چونکہ ٹھنڈے پڑ چکے تھے، ان کو جگانے کی میں نے کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی نظریاتی سیاست کے قمار بازوں کی سوچ ہی کچھ اور تھی۔ کچھ تو دانشوری کے آسمان سے نیچے نہیں اترنا چاہتے تھے اور کچھ کو لگتا تھا بی بی ایک کمزور سی لڑکی ہے اور پھر پاکستانی عوام میں چونکہ اس کی تربیت نہیں ہوئی، وہ انگریزی کلچر میں رچی بسی ہے تو وہ کیسے کامیاب ہو گی۔ اس طرح کم سے کم لندن تو اس معاملے میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اب یہ میرا کام ہرگز نہیں تھا نہ میری کوئی حیثیت تھی کہ میں انہیں ایک پلیٹ فارم پر لے کر آؤں۔ اب ایسے میں سولنگی میری تلاش میں آیا کہ جتوئی صاحب اور رضوی صاحب نے کچاہری کے لئے بلایا ہے اور لاہور سے ایک پوپٹ قسم کی فلمی اداکارہ دو دن سے جتوئی صاحب کے ساتھ ہے۔ نام اس نے بتایا لیکن اس کی توہین مجھے مقصود نہیں ہے۔

میں وقت سے ذرا پہلے پہنچا اور گھنٹی کا بٹن دبایا تو سولنگی نے دروازہ کھولا اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے خبردار کیا کہ بولنا نہیں ہے۔ مجھے اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ سولنگی مجھے بچا بچا کے ادھر سے لے گیا مگر آوازیں تو میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ یہ جتوئی کی آوازیں تھیں جو بہت اونچی تھیں اور وہ کہہ رہے تھے "او گشتی، تو کون ہے، ٹکے ٹکے کے فلم سازوں کے آگے لیٹتی ہے۔ گھٹیا قسم کے تماش بینوں سے ہزار ہزار نہ سہی لاکھ لاکھ لے کر تیرا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ کیا ہے تو، دبئی نے تجھے ٹکسال بن کے چلایا، اب تو میرے سامنے منہ مارتی ہے، اُٹھ دَلی، نکل ادھر سے۔ میں نے لندن کے سب سے بڑے سٹوروں Harrods اور Selfridges میں لاکھوں کی شاپنگ کرائی اور اب تو بکواس کر رہی ہے کہ میں تجھے لندن

میں اپارٹمنٹ لے کر دوں اور تو میرے لئے کپڑے نہیں اتار رہی۔ میں یہ کپڑے ابھی اتارتا ہوں اور دیکھتا ہوں تیرے اندر کتنی جان ہے۔ کنجری تو خواب دیکھنے لگی ہے محلوں کے۔ گشتی کو گشتی رہنا چاہیئے۔ دبئی کے حکمرانوں سے چدی ہوئی۔ تجھے تو ترس کھا کے بلایا تھا۔ اب نکل ادھر سے اٹھا جھگا چولی۔ پتہ نہیں کون سے فلمساز تمہیں ہیروئن بنا دیتے ہیں۔ ادھر تم سے خوبصورت تو کھمبے کے ساتھ لگی دس پاؤنڈ میں مل جاتی ہیں۔ میں نے تم پر اب تک بیس ہزار پاؤنڈ تباہ کر دیئے ہیں۔ نکل ادھر سے ابھی کے ابھی اور اٹھا بھنگ بھوسڑا۔''

میں یہ سب سن بھی رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ فلم سٹار جتوئی صاحب کے بیڈ روم سے نکلی، کپڑے پہنتے ہوئے اور جتوئی اس کے پیچھے لپک رہا تھا اور وہ اپنا وینٹی بکس اٹھا کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی اور جتوئی نے آواز لگائی:

''اوئے سولنگی سب کدھر مر گئے ہو۔''

''نہیں سائیں ہم ادھر ہی ہیں۔''

''اِس گشتی کو باہر نکال اور ہماری کچاہری لگا دے۔''

میں یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ پاکستان کی اس وقت کی انتہائی بڑی ہیروئن وہاں سے بے عزت ہو کر جا رہی تھی۔ اب مجھے کچھ دیکھنا تھا کہ کس طرح اس اپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ سولنگی کھانا بنا رہا تھا۔ پھر وہ کھانا لگانے آیا اور پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں آ چکا ہوں۔

اب جتوئی صاحب کا اور روپ تھا کہ میں سامنے آ گیا تھا۔ تو جتوئی صاحب ذرا نہیں شرمائے۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ سبھی سیاست کے وڈیروں کے لچھن ایک جیسے ہوا کرتے ہیں اور میں ان سب سے واقف ہوں۔ اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہنے لگے ''سائیں ہم سیاست دان لینے کے عادی ہوتے ہیں دینے کے نہیں۔ اس چھوکری کو کسی نے بتایا نہیں۔ خیر چھوڑو، آؤ بیٹھو، بتاؤ پھر بی بی صاحبہ کے کام کا کیا بنا۔''

''اخبار تو آپ نے پڑھے ہوں گے جو میں نکال رہا ہوں۔''

''سائیں ہاں وہ تو یہ لے آتا ہے۔ بھلے کب فرصت ملتی ہے۔ ہم کو تو بس رزلٹ چاہیئے۔''

''تو ایسا ہے کہ میں نے پورے برطانیہ میں یہ اخبار پھیلا دیئے ہیں۔ اب مجھے نہیں پتہ کہ آپ کی پارٹی سے کتنے لوگ آئیں گے۔ میں نے تو سب کو دعوت نامہ کئی بار اپنے اخبار کے ذریعے دے دیا ہے۔ بی بی صاحبہ کا اشتہار ہر روز لگ رہا ہے۔ کچھ جیالے اس سلسلے میں مسلسل اشتہار دے رہے ہیں۔''

اب سولنگی نے محفل کے لوازمات لگا دیئے اور رضوی صاحب کے ساتھ ملک صاحب اور کچھ

پارٹی کے لوگ آ گئے۔ اب میرا کام ختم ہو گیا تو ان کی کچاہری شروع ہو گئی جس میں سب کے اپنے اپنے مفادات کا ملبہ بی بی صاحبہ پر ہی ڈالا جانا تھا کہ اس میٹنگ سے بی بی کو برطانیہ سے طاقت بھی ملنی تھی اور پاکستان کی فوجی حکومت کو پیغام بھی ملنا تھا کہ مغربی ممالک اس طرح کی آمریت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے بی بی صاحبہ کو پاکستان کی سیاست کی بحالی کے لئے موقع دینا وقت کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اس شراب کی کچاہری میں سب اپنی اپنی بولی بولنے لگے۔ اس لئے کہ یہ پارٹی اپنے لیڈر سے بندھی ہوئی تھی۔ اب لیڈر نہیں تھا تو سب کے اپنے قوانین تھے۔ ایسے میں فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے خوب ہچ مچا ہوا۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ اتنی بڑی سیاسی جماعت کے اندر کیسا کھوکھلا اخلاقی بحران جڑیں پکڑ چکا تھا۔

بی بی صاحبہ کے جلسے کا دن آن پہنچا۔ احتیاطاً درمیانی وسعت کا کیمونٹی ہال بک کرایا گیا کہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ایک معمولی سے ''صدائے پاکستان'' اخبار کے ذریعے پاکستانی غیر جمہوری حکومت کے خلاف ایک تحریک کی قیادت شہید بھٹو کی بیٹی نے سنبھالنی تھی اور اس کی ساری ذمہ داری ایک شاعر کے کندھوں پر تھی اس لئے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کتنے لوگ جمع ہوں گے اور کہاں کہاں سے آئیں گے البتہ اس جلسے کی خبر بین الاقوامی میڈیا اور خبر رساں ایجنسیوں تک اسی اخبار کے ذریعے پہنچ چکی تھی کہ وہ سب کان رکھتے تھے۔

جلسے کے دن معلوم نہیں کیا ہوا۔ وقت سے پہلے کیمونٹی ہال بھر چکا تھا۔ اب جو لوگ اُمڈے اُن میں کالے بھی تھے، گورے بھی تھے، بنگلہ دیشی بھی تھے، ہندو اور سکھ بھی تھے۔ اب کیا تھا، دروازے کھول دیئے گئے۔ جب بی بی کو لایا گیا تو بڑی مشکل سے انہیں سٹیج تک رسائی حاصل ہوئی۔ وجہ سمجھ میں آ گئی کہ پوری دنیا میں بھٹو کی پھانسی پر جو سناٹا پیدا ہوا تھا اس کی گونج کہیں انسانی ضمیر میں جمع ہو رہی تھی اور پھر وہ گونج اسی موقع پر باہر آئی یا بعد میں بی بی صاحبہ کے لاہور پہنچنے پر باہر جو دنیا جمع ہوئی وہ بھی اسی سناٹے کی وجہ سے تھی۔ بی بی کو سننے کے لئے پورے برطانیہ سے لوگ پہنچے تھے۔ لگتا تھا کرکٹ کے ورلڈ کپ کا فائنل ہے۔ شاید یہ بھی درست بات نہیں ہے، یوں کہیں گے کہ اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ اب میرے کندھے پر نذیر خیالی نے ہاتھ رکھا اور دیکھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس نے کہا ''آپ تو چھا گئے ہیں۔ یہ سب آپ کی کوشش اور سوچ کا نتیجہ ہے۔''

میں نے کہا ''یہ سب آپ کے ''صدائے پاکستان'' کی آواز تھی جس پر سب آ گئے۔''

نذیر خیالی نے کہا ''تم خود بھی قومی اسمبلی کا ٹکٹ لے سکتے ہو اور مجھے بھی دلوا سکتے ہو۔''

''ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ یہ پارٹی جاگیرداروں، صنعت کاروں، وڈیروں، زمینداروں اور ٹھیکیداروں کی گود میں گر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں کو ٹکٹ مل بھی جائیں مگر جیتیں گے وہی جن کے پاس پیسہ ہو گا، ٹکٹ بھی اب بکیں گے، بیچے جائیں گے۔''

جلسہ چونکہ صرف بی بی صاحبہ کو سننے اور دیکھنے کے لئے تھا اس لئے مقامی یا غیر مقامی لیڈروں کی کوئی اوقات نہیں تھی نہ کوئی انہیں جانتا تھا۔ اس لئے عالمی میڈیا نے صرف بی بی صاحبہ کو ہی فوکس کیا۔ جلسہ ٹوٹ گیا تو میں نے دیکھا لائکپوری شاعر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور گلہ کیا کہ ''تم غائب ہو گئے ہو۔''

''نہیں میں اس جلسے کے لئے مصروف تھا۔''

''ہاں یہ جلسہ تو تمہارے اخبار کی وجہ سے ایسا کامیاب ہوا ہے۔ اب تم تو وفاقی وزیر بن ہی جاؤ گے۔ تم سے وقت لینا پڑے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ میں صرف ایک شاعر ہوں، اسمبلیوں کا ایندھن نہیں بن سکتا۔ نہ اتنی دھن دولت میرے پاس ہے نہ ہو گی۔''

اب ہم دونوں ایک قریبی پب میں جا بیٹھے۔ لائکپوری چونکہ ترقی پسند شاعر ہونے کا دعویدار بھی تھا تو اس نے دوپہر کا لنچ اور پینے پلانے کا خرچا اپنے ذمہ لے لیا۔ اب اس کے اندر کا دانشور جاگا۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ کوئی بھی قوم اپنوں سے نہیں لڑ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ قومیں غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کر سکتی ہیں، تحریک چلا سکتی ہیں، اپنی ہی فوج کے خلاف نہ تو لڑ سکتی ہیں نہ مزاحمت کر سکتی ہیں۔ پاکستان کے علاوہ اور بھی کئی ملک ہیں جیسے افریقی ممالک ہیں، مصر ہے، برما ہے، بنگلہ دیش ہے اور ترکی، تھائی لینڈ ہے جہاں عوام فوجی حاکمیت کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کی فوج سب سے زیادہ منظم ہے اور اس کی ملک کو ضرورت ہے کہ ایک طرف انڈیا ہے، دوسری طرف چائینہ ہے، تیسری طرف افغانستان ہے اور چوتھی طرف ایران ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا فوج کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔''

''فوج کو کمزور خود فوج کرتی ہے، عوام نہیں۔''

''ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان اپنے داخلی تنازعے کی زد میں ہمیشہ سے رہا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جدوجہد اور مزاحمت ہمارے ہی خلاف تصور کی جا رہی ہے۔''

''تو کیا اس سے فوجی حکومتوں کو جواز مل سکتا ہے۔''

''بالکل نہیں مل سکتا لیکن وہ اپنے منظم ہونے اور اپنے ادارے کی چوکیداری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور عوام کی جمہوری جدوجہد سے ان کا ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔'' اب ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا ہم ایک خوفناک طبقاتی تفریق کا معاشرہ ہیں جبکہ جن علاقوں اور ملکوں میں طبقاتی فرق نہیں ہے جیسے کہ بنگال کی تحریکوں میں اور دنیا میں مظلوموں اور غریبوں کی تحریکوں میں تو وہاں کامیابی کا تناسب موجود ہوتا ہے کیونکہ وہاں تصادم برابری کا ہوتا ہے۔ پاکستان کی صورت حال مختلف ہوتی ہے۔ ان باتوں کے ذریعے ہم اس روز کے جلسے کا تجزیہ بھی کرتے رہے اور اس پب کی شراب اور لنچ سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ اب اگلے روز کے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ گویا یہ ایک طرح سے پاکستان میں فوجی آمریت اور ضیاء الحق کی غیر قانونی حکومت کے خلاف دنیا کا احتجاج تھا۔ ظاہر ہے اس کا بے حد اثر ہونا تھا۔ بی بی سی اور دنیا کا میڈیا بول اٹھا۔ اس کا کتنا فائدہ بی بی صاحبہ کو ہوا یہ تو بعد میں معلوم ہونا تھا البتہ لندن میں پاکستانی سیاست کا ایک اہم موڑ آ چکا تھا اور اسی موڑ پر میں نے بی بی صاحبہ کی پہلی مسلم دنیا کی وزیر اعظم بننے کی پیش گوئی کر دی تھی۔

....

پاکستان کے حالات ہر طرح سے فوجی حکومت کے قابو میں تھے۔ ہر طرح کی تحریک بے بس ہو چکی تھی۔ شاہی قلعے سے کوڑوں تک کی کہانی اور پپو کے قاتلوں کی سرِ عام پھانسی کے دوران گول گپوں، پکوڑوں، دہی بھلوں اور چاٹ پاپڑی بیچنے والوں کی دیہاڑی نے پاکستان کی سیاست اور معاشرتی زندگی کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی رویوں میں تبدیلی کو بھی نشانہ بنا دیا تھا۔ اس تاریخی حقیقت کو بہت کم نفسیات دان، مؤرخ، سیاست کے ماہرین اور معیشت دان اس وقت سمجھ پا رہے تھے۔ فوجی حکمرانوں کے مشیران اس بات پر غور کر رہے تھے کہ روز روز کا مارشل لاء لگانے کی بجائے کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ روایتی سیاست کی جگہ کٹھ پتلی سیاست کو عوام کے اندر مقبول کیا جائے۔ ان کے ذہنوں اور رویوں کو اس طرح بدلا جائے کہ وہ خود ہی ایسے حکمرانوں کا چناؤ کریں جو فوج کے پسندیدہ بھی ہوں اور اس کی چھتری کے نیچے پل کر جوان ہوئے ہوں۔ اب ظاہر ہے سیاست کے نقاب میں تاجروں کو پالا پوسا جانے لگا کہ وہ سیاست کو کاروبار بنانے کا فن سیکھ سکیں۔ یہ فن کارپوریٹ کلچر کی وجہ سے آسانی کے ساتھ آ جاتا ہے۔ اب ایسے میں فوجی حکومت کی ذہانت بس محدود سی ہوتی ہے تو انہوں نے تاجروں کو اپنے سائے تلے پروان چڑھانے کا پورا سکرپٹ تیار کیا۔ یہ پاکستان کے غریب عوام کے ہاتھوں سے ووٹ کا حق چھیننا تھا اور اس میں یہ سکرپٹ کامیاب رہا۔ وہی غریب عوام ایک قیمے والے نان پر ووٹ ڈالنے کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی۔

مجھے جیل سے بلاوا آیا کہ ایک قیدی آپ کو ترجمان بنانا چاہتا ہے۔ یہ چونکہ میرے فرائض کے ساتھ میری آمدنی کا ذریعہ بھی تھا تو میں وہاں پہنچا۔ ایک پاکستانی قیدی مخصوص کمرے میں سامنے آ کر بیٹھا۔ میں نے دیکھا اور اس سے پوچھا مجھے تمہارے جرم کی پوری تفصیل معلوم ہو چکی ہے۔ مجھے بتاؤ تم عدالت میں کیا بات کرنے والے ہو اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ اس نے کہا ''میں پاگل ہونا چاہتا ہوں،

عدالت کی نظر میں۔''

''لیکن تم تو پاگل نہیں ہو۔''

''تمہیں اتنی جلدی کیسے پتہ چل گیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔''

''اس لئے کہ تمہارا پہلا جملہ ہی عقل کی دلیل ہے کہ میں پاگل ہونا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ایسا ہے لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ہر انسان پاگل نہیں ہے۔''

اب میں چکرا گیا کہ اس نے نفسیات کا سب سے اہم جملہ بول دیا تھا کہ بنیادی طور پر ہر انسان پاگل ہوتا ہے، دنیا کی نظر میں، لیکن وہ پاگل نہیں ہوتا، اسے پاگل سمجھا جاتا ہے۔''

''تو ایسے میں تم کس مقام پر ہو۔''

''جس مقام پر بھی آپ کہیں گے میں آجاؤں گا۔ بہت بڑا ایکٹر ہوں میں۔''

''مگر میرے کہنے سے تو وہ تمہیں پاگل نہیں مانیں گے، یہاں تو اس کے لئے میڈیکل بورڈ ہوتا ہے، میں تو صرف تمہاری بات انہیں سمجھا سکتا ہوں۔''

''بس یہی مجھے چاہئے۔ گوروں کے میڈیکل بورڈ کو بے وقوف بنانا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے نفسیات کے ماہرین اور کامیاب نفسیاتی امراض کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔''

''پھر وہ پاکستانیوں کو نہیں جانتے۔ پاکستانی وہ کر جاتے ہیں جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بس آپ مجھے میڈیکل بورڈ تک پہنچا دیں، آگے میں جانوں وہ جانیں۔''

''مگر میں جھوٹ کیوں بولوں۔''

''میں آپ کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر دوں گا۔ آپ صرف میری باتوں کا ترجمہ دیانت داری سے کرتے جائیں۔''

''پہلے یہ بتاؤ تمہارا جرم کیا ہے؟ اور تم کیوں پاگل بن کے پاگلوں کی جیل میں جانا چاہتے ہو۔''

''میں نے یہاں گوری سے شادی کی تھی اور میں بائی سیکشوئل ہوں۔ ساری دنیا کے مرد بائی سیکشوئل ہوتے ہیں تو ایک دن میں نے اپنی گوری بیوی کے ساتھ دوسری طرح کی سیکس کی کوشش کی تو اس کی چیخیں نکل گئیں اور اس نے پولیس کو فون کر دیا اور میں یہاں آ گیا۔ اب آپ مجھے پاگلوں کی جیل میں پہنچا دیں۔''

میں بات سمجھ چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ پاکستانی فریب دینے اور دھوکہ دینے میں بہت ماہر ہو چکے ہیں۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ برٹش ٹیلی فون کے جگہ جگہ بوتھ بنے ہوتے ہیں جہاں آپ برطانوی کرنسی کا سکہ ڈال کر دنیا میں کہیں بھی فون کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاکستانیوں نے اس سکے کا متبادل ایسا سکہ گھڑا کہ جس کے ڈالنے سے آپ گھنٹوں پاکستان بات کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں سمجھ گیا کہ یہ قیدی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے آزمانے کے لئے پوچھا کہ ''تم کیا کرو گے کہ میں تمہاری ترجمانی کرتے ہوئے عدالت کو بتاؤں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' اس نے جیسے تیار کیا ہوا جواب بول دیا۔

''میں کہوں گا شہزادہ چارلس ایک کلاؤن ہے۔ برطانیہ ایک ہیجڑا ہے جسے امریکہ نچا رہا ہے۔''

''لیکن یہ تو تم صحیح باتیں کر رہے ہو۔ اسے عدالت مان لے گی۔ یہ تو عقل کی بات ہے۔''

''تو پھر میں کہوں گا میرے اندر پیٹ میں ایک درخت پیدا ہو رہا ہے اور وہ روز بروز اپنی شاخیں پھیلا رہا ہے۔ مجھے روز اس جیل کے قیدی ڈائناسور کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ میرے خوابوں میں سیلاب آتا ہے جو کسی دن اس جیل کو بہا کر لے جائے گا۔ مجھے جیلر ایک لنگڑا ہاتھی دکھائی دیتا ہے۔ میں ایک ٹریفک سگنل ہوں جو جب چاہے کھل جاتا ہے اور جب چاہے بند ہو جاتا ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، ان اوٹ پٹانگ باتوں سے یہاں کی عدالت تمہیں پاگل قرار دے دے گی۔''

''اور کیا؟ یہ تم کر کے دیکھ لو۔ اس طرح سے یہاں قیدی نفسیاتی مریض بن کر جیل سے باہر گئے ہیں۔''

''اچھا تو تم یہ ناٹک کرو گے؟''

''میں اس سے بھی بہتر طریقے سے کروں گا۔''

اب میں نے سوچا کہ یہ کیا کردار سامنے آیا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کرنا تھا اس لئے میں نے کہا ''تم جو کہو گے میں ترجمہ کر دوں گا جس کے میں پیسے لیتا ہوں۔''

اب اس دن جب عدالت میں گئے تو اس نے وہی گردان دہرا دی اور میں حیران ہو گیا کہ عدالت نے اسے نفسیاتی امراض کے میڈیکل بورڈ کے حوالے کر دیا۔ اب میرا کام ختم تھا اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میڈیکل بورڈ نے اسے ذہنی مریض کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کے بعد میں کس ادارے پر اعتبار کر سکتا تھا۔

لندن میں اس طرح کے کیس آتے رہتے تھے جس سے پاکستانی قیدیوں کی نفسیاتی اور معاشرتی کیفیت دکھائی دے جاتی تھی۔ اب یوں تھا کہ میں نے تو محض ترجمانی کی تھی اور مجھے اس کا معاوضہ مل گیا تھا۔

میں پاکستانی قیدیوں کے ترجمان کی حیثیت میں اتنے پیسے کما لیتا تھا کہ کسی بھی پب میں شراب پی لوں، لنچ کرلوں، بسوں کا کرایہ دے دوں اور سرکار کی طرف سے جو مجھے الاؤنس ملتا تھا وہ جلاوطنی کی وجہ سے تھا۔ وہ زیادہ نہیں تھا اور جو فلیٹ ملا ہوا تھا وہ انتہائی غریب عوام کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس میں رہنا جیسے مجبوری ہی ہو سکتی تھی۔ ایک دن مجھے پھر سے جیل حکام نے بلایا کہ آپ کے لئے ایک قیدی نے ضرورت پیدا کی ہے۔ میں وہاں گیا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ کوئی جنسی تشدد کا کیس ہوگا جس کے نتیجے میں اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا۔ جب میں نے اس سے اس کی کہانی سنی تو وہ یہ تھی۔

''میں ایک Lesbian ہوں۔ پاکستان ہی میں میری دوست تھی جس کا میرے والدین کو علم تھا۔ اس سے مجھے الگ کرنے کے لئے انہوں نے میرے ہی دور کے رشتہ دار سے جو یہاں انگلینڈ میں گراسری شاپ کا مالک تھا، سے شادی کردی۔ وہ مجھے یہاں لے کر آیا۔ میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ میں Lesbian ہوں اور مجھے مردوں سے نفرت ہے۔ میں تم سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔ وہ ایک کمزور سا کاروباری آدمی تھا۔ ویسے بھی میں اس کی پسند نہیں تھی بلکہ وہ عورتوں میں دلچسپی ہی نہیں رکھتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ محبت کرنا یا کسی کو محسوس کرنا اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا اس لئے اس نے مجھے جانے دیا۔ گویا اس نے مجھ سے جان چھڑا لی۔ اب میں آزاد تھی۔ ہم Lesbian عورتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دوست بھی Lesbian ہے اور ہم اسے کیسے اپنے قریب کر سکتے ہیں۔ تو ایسے میں مجھ ایک شاپنگ مال میں ایک گوری نے دیکھ لیا۔ میرے مشرقی چہرے کی دلکشی اور میرے جسم کی خوبصورتی نے اسے گھائل کر دیا۔ ایک ہی نظر میں وہ پہچان گئی کہ میں اس کا شکار بن سکتی ہوں۔ پھر وہ میرے پاس آئی اور جب دو Lesbian ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں تو سمجھو کہ ان کا فوراً رابطہ ہو جاتا ہے اور ایسے ہی ہوا کہ وہ میرے پاس آئی اور میں جانتی بھی نہیں تھی، وہ برطانیہ میں ممبر آف پارلیمنٹ تھی اور ہم دوست بن گئیں۔ پھر چونکہ میں اس کی پسند تھی تو وہ مجھے اپنی ضرورت کے مطابق لے جاتی تھی۔ میرے لئے برطانیہ میں اس سے اچھی بات نہیں تھی کہ میں ایک ایم پی کی دوست ہوں۔ میری اس سے دوستی یا شادی ہوگئی۔ اب ایک

دن کیا ہوا؟ اس نے مجھے بتایا کہ وہ حکومت مخالف جماعت کی ایم پی ہے اور اُس کے ہاتھ اتحادی افواج کے جنگی جرائم سے تعلق رکھنے والے ثبوت ایک صحافی کے ذریعے ہاتھ لگ جاتے ہیں جو اس نے کئی سالوں کی محنت سے حاصل کئے ہوتے ہیں۔ وہ یہ ثبوت پارلیمنٹ میں پیش کرنے والی تھی جس سے برطانوی حکومت کی سکیورٹی پر سوالیہ نشان لگ سکتے تھے اور حکومت کی سبکی ہونی تھی۔ دنیا میں اس خبر سے امریکہ اور آسٹریلیا کی افواج کو بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ یہ ایم پی جس کا نام جینی تھا، کسی رائل خاندان سے نہیں تھی، ایک عام سے برطانوی خاندان سے تھی اور اس کے خاندان میں کوئی اس طرح سیاست میں نہیں تھا۔

جس شام میں اور وہ بستر میں تھیں اور ہمارے جسم پر لباس نہیں تھے تو اچانک کمرے میں چار نقاب پوش داخل ہو چکے تھے اور انہوں نے ہم دونوں کو قابو کیا اور اسی حالت میں ہمیں باندھ دیا۔ وہ کئی دنوں سے اس لمحے کی تلاش میں تھے کہ میں اور وہ بستر میں ہوں اور وہ کہانی بنا سکیں۔ وہ حکومت کی کسی ایجنسی سے نہیں تھے۔ وہ کرائے کے کمانڈو تھے جو پرائیویٹ ایجنسی سے مل جاتے تھے۔ انہوں نے اس سے وہ سارے ثبوت جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی فوج جنگی جرائم میں ملوث رہی ہے اور اتحادی فوجی بھی ساتھ شامل تھے، حاصل کر لئے۔ اس چھوٹے سے فلیٹ سے یہ سب برآمد کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کمرے کا نقشہ بنایا۔ اس کمرے کی تصاویر بنائیں اور مجھ سے مختلف جگہوں پر انگوٹھوں کے نشان لئے۔ پستول میرے ہاتھ میں دے کر اس پر میرے انگوٹھوں کے نشان بنائے اور میرے ہی ہاتھ میں دیئے پستول سے اس پر فائر کیا اور وہ وہیں مر گئی۔ اس پر انہوں نے جو کہانی بنائی وہ یہ تھی کہ وہ Lesbian تھی اور میرے ساتھ اسی اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اسے کوئی اور پسند آ گئی اور مجھ سے چھٹکارا چاہتی تھی جس کی مجھے خبر مل گئی تو میں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں جب سیکس کرتے ہوئے موقع ملا تو میں نے اسے مار دیا۔ یہ پستول میں نے جس سے لیا وہ آدمی اسی ایجنسی کا تھا۔ اس نے سارے ثبوت بنا رکھے تھے کہ میں نے یہ پستول اس سے کب لیا اور کیوں لیا۔ گویا برطانوی حکومت نے جس ایجنسی کو کرائے پر لیا تھا یہ ساری کہانی اس نے بنائی تھی اور اس نے بنا لی اور اگلے دن کے پریس میں صرف یہ ثابت ہوا کہ ایک ایم پی جو Lesbian تھی، اپنی دوست کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔ اب یہ کہانی میں عدالت کو بتانا چاہتی ہوں اور آپ میری ترجمانی کریں۔ میں نے سوچا یہ جو باتیں کرے گی اس سے برطانوی حکومت تو دنیا کی نظروں میں ننگی ہو جائے گی، تو میں کیا کروں۔ یہ میرا فرض ہے جو حکومت

برطانیہ نے مجھے سونپا ہے اور اگر میں یہ پورا کرتا ہوں تو حکومت برطانیہ نہ صرف ناراض ہوگی بلکہ مجھے قتل بھی کرا سکتی ہے، ڈی پورٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب میں نے غور کیا تو اس میں ڈرنے کی بات نہیں تھی اس لئے کہ میں ایک تو صرف مترجم تھا، دوسرے جنہوں نے اس پر قتل کا کیس کیا تھا وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ وہ عدالت میں کچھ بھی کہہ سکتی ہے اور اس مقصد کے لئے وہ سب انتظام پہلے ہی کر چکے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک خبر ہی ٹھہرے گی جس کا کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اس لئے میں نے مترجم ہونا قبول کر لیا اور پھر عدالت میں جب اس پر فردِ جرم عائد ہوئی تو اس نے جرم سے انکار کر دیا۔ اس کا اپنا کوئی وکیل نہیں تھا۔ اس کی طرف سے سرکاری وکیل نے شور وغوغا کیا کہ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔ اس کے بیان پر عدالت نے اگلی تاریخ دے کر کارروائی ختم کر دی۔ مجھے محسوس ہوا یہ بھی اسی سکرپٹ کا حصہ تھا جو اس قتل کے حوالے سے لکھا گیا ہوگا۔ میں نے اس کے بیان کو انگریزی میں دہرا دیا۔ جج نے اس ساری کارروائی کو پریس میں شائع ہونے سے روک دیا اور اگر کوئی اسے شائع یا نشر کرتا تو یہ توہین عدالت ہوتی۔ اگر یہ ثبوت باہر آ جاتے تو جنگی جرائم کی عالمی عدالت میں اس وقت کے حکومتی یا فوجی ذمہ داران کو مقدمے کا سامنا کرنا پڑتا۔ دنیا میں ہر جگہ ہر حکومت اور ہر فوج نے جنگی جرائم کئے ہوں گے مگر ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوبارہ وہ کیس کھلا نہیں، مجھے جیل حکام سے کوئی کال نہیں آئی۔

ایک دن جلاوطن حکومت اور جہاز کے جلاوطنوں نے کہیں سے مجھے پیغام بھیجا کہ ایک جگہ میٹنگ ہے۔ میں نے ایک دو ملنے والوں سے رابطہ کیا اور یہ اس لئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو سب اتنے وقفوں سے مل رہے ہیں تو کیا کوئی با معنی مکالمہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ یہ میٹنگ ایسٹ لندن ہی میں ہونی تھی جہاں میرا فلیٹ تھا جس میں اب جیسمین رہتی تھی اور میرے ساتھ سولنگی بھی تھا مگر اب تو وہ اپنے وڈیرے کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو چکا تھا۔

اس میٹنگ میں جانے سے پہلے ایک شام میں ساؤتھ ہال میں طیفا بٹ کے ریستوران میں گیا کہ شاید کسی شاعر یا کسی پاکستان سے آئے ہوئے ادیب یا سیاست دان سے ملاقات ہو جائے۔ ابھی شام کی پھوار پڑ رہی تھی۔ شام اُترنے سے شرما رہی تھی۔ ایسا لندن میں اکثر ہوتا تھا۔ شام لگتا تھا آ رہی ہے پھر لگتا تھا نہیں، ابھی انتظار کرو۔ شام شرما رہی ہے۔ اب جو میں طیفا بٹ کے ریستوران کی طرف بڑھا تو سڑک کے دونوں کناروں پر گاڑیاں پارک تھیں اور وہ جب غور کیا تو پاکستانی ہائی کمیشن کے ساتھ مقامی تاجروں کی بڑی بڑی گاڑیاں معلوم ہوئیں۔ جب میں قریب گیا تو طیفا بٹ دولہا بنا ہوا تھا۔ اُس نے ضیاء

الحق ماڈل کی شیروانی، جناح کیپ، سفید شلوار اور سیاہ ملکیشن پاؤں میں پہنی ہوئی تھی۔ پورا چودہ اگست لگ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی پاکستان سے سرکاری شخصیت یہاں آئی ہوئی ہے اور وہ کسی خاص مشن ہی پر آ سکتی ہے یا اپنے ذاتی دورے پر ہو سکتی ہے۔ اندر جھانکا تو وہ تو کچھ لوگ فوجی وردی میں تھے۔ میں سمجھ گیا ضیاء الحق کا کوئی نورتن اِدھر ذائقہ لینے آیا ہے ورنہ یہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔

جب اندر ایک کونے میں کھڑا ہو کر میں نے جائزہ لیا تو کوئی ضیاء الحق کا ایسا جرنیل تھا جس نے بھٹو صاحب کی پھانسی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے اُس کا نام بھی معلوم تھا اور میں اُس کے مشاغل سے بھی واقف تھا۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کس مشن پر آیا ہے۔ ہائی کمیشن کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ چونکہ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا تو میں بھی وہاں ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ہائی کمیشن کے ڈنر پر پاکستانی تاجروں اور بااثر لوگوں کو بلایا گیا تھا جن سے یہ جرنیل صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ضیاء الحق کے اسلامی شوریٰ کے نظام کے قصیدے پڑھنے شروع کیے۔ اسلام کو نظریۂ ضرورت کے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر نفاست سے پیش کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ بی بی صاحبہ کی سرگرمیوں کا لندن میں جواب دینے کے لئے یہ جرنیل صاحب یہاں اس مشن سے آئے تھے کہ یہاں اسلامی انقلاب کے حق میں جلوس نکالے جائیں اور جہاں جہاں بی بی صاحبہ خطاب کریں وہاں اُن کے خلاف جلوس نکالا جائے۔ ہائی کمیشن اُن کے ہر طرح کے خرچے اور دعوتوں کا اہتمام کرے گا۔ پاکستانی بااثر افراد اور تاجر اُسے یقین دلا رہے تھے کہ وہ حب الوطنی کا مظاہرہ کریں گے۔ جو اُن سے متفق نہیں تھے، خاموش بیٹھے باتیں سن رہے تھے۔ ایک دو نے ذرا سا اختلاف بھی کیا اور بھٹو صاحب کی شہادت کو سانحہ قرار دیا جسے جرنیل صاحب نے خندہ پیشانی سے سنا اور ہائی کمیشن کے ایک افسر نے انہیں گھور کر ایسے دیکھا جس کا مطلب تھا اب تم ہائی کمیشن آنا، جس کام سے آؤ گے، قطار میں لگنا پڑے گا اور خبردار کسی قسم کی ہم سے اُمید مت رکھنا۔

جرنیل صاحب نے امیر المومنین ضیاء الحق کی شان میں کچھ ذاتی واقعات سے ثابت کیا کہ اُن کے ماتھے پر جو محراب ہے وہ مسلسل نمازوں کے سجدوں کی وجہ سے ہے اور ایسے ہی دو چار معجزوں کا بھی ذکر کیا۔

طیفا بٹ اگرچہ حب الوطنی میں قائداعظم ثانی بننے کا مکمل مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اُس کی نظر اپنے کاروبار پر تھی۔ وہ ہائی کمیشن کے آرڈر سے بھی بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ جونہی گفتگو آخری دَموں پر پہنچ رہی تھی یا اختلافی دائرے میں داخل ہونے لگی تھی، ہائی کمیشن نے اشارہ کیا اور پھر طیفا بٹ نے

قیامت ڈھادی۔

سلاد، چٹنیاں، رائتہ اور کئی طرح کے سٹارٹر لگنا شروع ہو گئے جن میں پرانز فرائی، چکن نگٹس، فش تکہ، کباب، مٹن تکہ، چانپیں اور کئی طرح کے ڈرائی فروٹ شامل تھے۔ اس کے بعد دھوئیں سے بھری ہوئی کڑاہیاں، ہانڈیاں، روسٹ بجی، تکے اور ہر طرح کے نان آتے گئے اور سماتے گئے۔ میں دیکھتا رہا اور پھر میں نکل گیا۔ خالی سڑکوں کو دیکھتا رہا کہ لندن کیا ہے۔ ہم جیسے معمولی ملکوں سے کھیلتا ہے۔ ہم اُن کے لئے فٹ بال ہیں۔ ہمارے لوگ یہاں روزگار کمانے آئے ہیں لیکن سمجھتے ہیں گوروں کو فتح کرنے آئے ہیں۔ گوروں نے انہیں اپنی آبادیوں سے مکھن میں سے بال کی طرح نکال کے پھینکا ہے۔ ایک آدھ گوری سے شادی کر کے ہم سمجھتے ہیں ہم نے اپنے حاکموں کو زیر کر لیا ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے۔ وہ ہمیں اپنے ملک میں بھی رعایا بنا کے رکھتے ہیں۔ یہ ہمیں سمجھنا چاہئے۔ طیفا بٹ پہلے بھی محکوم تھا، اب بھی محکوم ہے۔ طیفا بٹ پہلے بھی وائسرائے کے محل میں بٹلر تھا، اب بھی بٹلر ہے۔ یہ جو ڈنر پر آئے تھے، بشمول جرنیل صاحب، کون تھے؟ وہی ''بلڈی سویلین'' جن کا جم خانہ میں داخلہ منع ہوتا تھا۔ لکھا ہوتا تھا "Dogs and Indians are not allowed."

گورے نے کتوں اور ہندوستانیوں کو ایک ساتھ عزت دے دی تھی۔ تو یہ تو سوچنے والی بات تھی لیکن کون سوچتا۔ سب گوروں کے ٹٹے سہلانے پر مامور تھے۔ اب ضیاء الحق چاہتا تھا کہ اپنے اصلی حاکموں سے نام نہاد جمہوریت کی جگہ ہمیشہ کے لئے فوجی آمریت کو قبول کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ حاکموں کی فرمائش پر اپنی فوج فلسطینیوں کے خلاف بھی بھیجنے کو تیار تھا۔ اب میں جلاوطن دوستوں کی میٹنگ کے لئے اگلے روز وقت سے پہلے ایسٹ لندن پہنچ گیا۔ میں جان بوجھ کر اپنے فلیٹ والی سڑک پر نہیں گیا کہ اگر میں نے فلیٹ کو کھولا تو معلوم نہیں جیسمین کس عالم میں ہو۔ ایک بار میں اُسے شرمندہ کر چکا تھا۔ جب وہ ایک سیاہ فام کے ساتھ مصروف تھی۔ میں ایک قریب کے پب میں بیٹھ گیا کہ شاید میرے پرانے ترقی پسند ساتھی وہاں رُکنے کے لئے آجائیں اور تازہ دم ہو کر اُس میٹنگ میں جائیں۔ ایسا ہی ہوا، میں نے بیئر کا مگ جونہی سامنے رکھا، دو جہاز کے جلاوطن آ گئے۔ ایک تو انقلابی تجزیوں کے ماہر تھے، دوسرے سیاسی ورکر تھے جس نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور بچا لئے گئے تھے۔ بعد میں جہاز میں ڈال دیئے گئے جان چھڑانے کے لئے۔ اُن سے ملاقات کئی مہینوں بعد ہوئی تو میں نے کہ جیب میں پیسے تھے، ان کی میزبانی کے لئے ان کی پسند کی ڈرنک منگوائی۔ دونوں بجھے بجھے سے تھے۔ میں بھی کوئی زیادہ ناز

نخرے میں نہیں تھا۔ بس آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ میں تو پھر بھی بہت گھوم پھر رہا تھا۔ جیل میں، اخبار کے دفتر میں، عدالت میں، سندھی اور پنجابی وڈیروں کی شاموں میں اور ساؤتھ ہال کے ریستورانوں میں آنا جانا لگا ہوا تھا مگر یہ دونوں تو یہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنی سوچوں کے اسیر تھے اور جو اپنی سوچ کا اسیر ہوتا ہے وہ شاہی قلعے کے اسیر سے زیادہ اذیت میں رہتا ہے۔ اب ایسے میں اتنا پوچھ سکا کہ حکومت کی طرف سے وظیفہ مل رہا ہے یا نہیں اور یہ کہ کچھ واپسی کے سفر کا سوچا یا نہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آواز بند گنبد میں سے لوٹ کر آ رہی ہے۔ میں نے زیادہ آزمانا مناسب نہ سمجھا اور سارا زور ان کی خدمت پر صرف کر دیا۔ ہم تینوں نے ڈرنکس لیں۔ کچھ ساتھ میں کھانے کے لئے سنیکس میں نے منگوائے اور یوں وہ شام ہم تینوں نے اگلے مرحلے کے لئے اپنے لئے بہتر بنا لی۔ اب ہم وہاں پہنچے جہاں میٹنگ کے لئے سب جلاوطن جمع ہو رہے تھے۔ کچھ مانچسٹر اور برمنگھم سے بھی پہنچے تھے کہ جلاوطنی کاٹنے کے لئے جس کے جہاں سینگ سمائے، اُس نے اُدھر پاؤں پسارے۔ کسی جاننے والے کا جہاں سہارا ملا اُدھر کو بھٹک گئے۔ بھٹکنے کو صحرا چاہئے اور برطانیہ میں بھٹکنے کے بہت ٹھکانے جدید وقدیم بکھرے پڑے تھے۔ جس نے میٹنگ بلائی تھی یہ فلیٹ بھی اُسی کا تھا۔ وہ تقریر سے بھرا بیٹھا تھا۔ سب جمع ہوئے مگر میں دیکھ رہا تھا اکثر بجھے بجھے تھے اور اُن میں وہ پہلے والا جوش اور بغاوت کے ساتھ لڑنے مرنے کی کوئی اُمنگ موجود نہیں تھی۔ راکھ میں دبی آگ ضرور تھی مگر وہ ایسی آگ تھی جس سے ہم خود ہی اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ یہ زمانہ اپنے گریباں چاک کرنے کا زمانہ تھا کہ مارشل لاء کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرانے سے سر میں سمایا سودا بھی تباہ ہو چکا تھا۔ وقت تھا کہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ دنیا کی بڑی طاقتیں اس مارشل لاء سے سمجھوتہ کر چکی تھیں اور اپنے عزائم کے لئے اس حکومت کو استعمال کر رہی تھیں۔ پاکستان عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن چکا تھا اور اس حکومت نے اپنی کارکردگی کا ایک ریٹ متعین کر رکھا تھا جو اسے مل رہا تھا۔ کون کس کو استعمال کر رہا تھا، کہاں استعمال کر رہا تھا، عالمی سطح پر ہم ایک سوالیہ نشان بن چکے تھے۔ دنیا پاکستان کے اس زمانے کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی اور پاکستانیوں نے کیا سمجھنا تھا، جو معجزے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ معجزے نے بھی رونما ہونا ہی تھا مگر اپنے وقت پر رونما ہونا تھا۔

وہاں میزبان کی تقریر سے شعلے تو نکلے مگر ٹھنڈی آگ کے شعلے تھے۔ جب دشمن آپ کی پہنچ سے باہر ہو تو آپ کا غصہ اپنے آپ پر نکلتا ہے۔ ایسا ہی کچھ اُس شام بھی ہوا کہ سب کا انتظام صدا بصحرا ہی کے زمرے میں آ رہا تھا۔ تقریر سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آہیں اور آہ و زاری کا پورا سامان موجود تھا۔ اب یہ

پاکستان کی سیاسی تاریخ رقم ہو رہی تھی جس میں ادیبوں کی سرکاری اکادمی ادبیات کا ایک سرکاری چہرہ بھی سامنے آنا تھا۔ میں تو جلاوطن تھا لیکن اس کانفرنس کا چہرہ تو سامنے آ گیا جب اخباروں میں اکادمی کی کانفرنس کا احوال پڑھا۔ ضیاء الحق کی فرمائش پر بھٹو کی پھانسی کے دوسرے تیسرے دن یا ایک ہفتے بعد ادیبوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ اکادمی ادبیات کا چیئرمین ضیاء الحق کا خاص خادم اور امیر المومنین کا قصیدہ گو تھا۔ ادب سے شاید دور کا بھی واسطہ نہیں ہوگا۔ اسے حکم ملا کہ ظل الٰہی بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد پہلی بار اگر کسی سے خطاب کریں گے تو وہ ضمیر کے نام نہاد پاسبان ادیبوں سے کریں گے تا کہ قوم کو صحیح پیغام جائے۔ اس لئے اُس چیئرمین نے پاکستانی ادیبوں کو جہاز کے ٹکٹ اور فور سٹار ہوٹل کے جادو میں قید کر لیا کہ اس زمانے میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا خواب جہاز کا ٹکٹ اور ہوٹل کا کمرہ اور کھانا وغیرہ ہی ہوتا تھا۔ اس طرح ایسا ہوا کہ جنرل ضیاء الحق نے قوم کو اپنا اصلی چہرہ دکھانے کے لئے ادیبوں کے اجتماع سے خطاب کیا اور وہ خطاب شرمناک تھا کہ پاکستان کے بڑے ادیب احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری اور نہ جانے کون کون وہاں پہنچے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اختر حسین جعفری کی نظم سے ضیاء الحق بدک گئے مگر سوال یہ ہے کہ وہ وہاں گئے کیوں تھے؟ اس کانفرنس کے بعد پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ وکلاء نے بڑی تعداد میں ضیاء الحق کے اُس خطاب کے خلاف کھل کے احتجاج کیا جس میں اُس نے کہا تھا اے ادیبو اور شاعرو! تم نے اگر حکومت کے خلاف کچھ بھی لکھا تو وہ ریاست کے خلاف بغاوت تصور ہوگا۔ جس کی رُو سے تم پر اس ملک کے درختوں کی چھاؤں حرام ہوگی۔ اس زمین کے پھلوں پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اس ملک کے پانیوں اور ہواؤں کی خنکی تم پر حرام ہو جائے گی۔ اس خطاب کے بعد پاکستان کے افسانہ نگاروں اور شاعروں نے استعارے اور علامت کے ذریعے فوجی آمریت کے خلاف ایسا لازوال ادب تخلیق کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن اُس شام ہماری ہمت جواب دے گئی تھی۔

لندن میں سیاسی گرماگرمی کا چونکہ ماحول نہیں تھا اس لئے سارے ترقی پسند مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔ رہی سہی کسر برطانیہ کی حکومت نے پوری کر دی تھی۔ تمام جلاوطنوں کو بے حد معمولی فلیٹ الاٹ کئے تھے جس میں معمولی سطح کی بنیادی سہولتیں تھیں اور جو امداد دی جاتی تھی اس میں بس جلاوطن کو خوراک اور سانس مل سکتی تھی۔ ایسے میں شاعر جو مجھ سے سینئر تھے اور پشاور سے تھے، بے حد گھبرائے ہوئے تھے اور انہیں لندن میں رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تقریباً رو پڑے۔ ایک تو اُن کا بیٹا قتل کے جرم میں گرفتار ہو چکا تھا جو خود بھی ترقی پسند دانشور تھا۔ قبائلی جھگڑوں کے نتیجے میں اُن سے قتل ہو چکا تھا اور اُس کا اس سے نکلنا مشکل ہو چکا

تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اُڑ کر پاکستان چلے جائیں اور ضیاء الحق کے کسی جرنیل کے پاؤں میں پڑ کے بیٹے کی رہائی کی بھیک مانگیں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک اور شاعر جو اُستاد بھی تھے، وہ پارٹی کے لئے خدمات کے حوالے سے جلاوطن نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو کسی بھی قسم کی سیاست سے اتنے دور تھے کہ مال روڈ پر کوئی بھی احتجاجی جلوس گزر رہا ہو تو پتلی گلی سے نکل جاتے۔ یہاں وہ اس لئے آئے تھے کہ ان کی بیگم پارٹی کی باقاعدہ رہنما بھی تھیں اور عورتوں میں پارٹی کی قیادت کے لئے پیش پیش رہتی تھیں۔ کئی بار مارشل لاء کی لاٹھیاں بھی کھا چکی تھیں۔ جب جہاز کے اغواء کے سلسلے میں جیلوں میں قید کارکنوں اور پارٹی رہنماؤں کو جلاوطن کئے جانے والوں کی فہرست ہائی جیکروں نے دی تھی اُس میں ان کی بیگم کا نام بھی تھا مگر اُس نے جانے سے انکار کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کے بغیر نہیں جائیں گی تو ایسے میں یہ شاعر بھی جلاوطنی کی زد میں آ گئے۔ صبح شام پاک ٹی ہاؤس کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ انتظار حسین کے گلے لگ کر بین کر کے رونے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی وہ مایوسی سے شامِ غریباں کا ماحول بنانے میں کامیاب رہے تھے۔

یہاں اس میٹنگ میں عالمی رائے عامہ کو فوجی حکومت کے خلاف کرنے کے لئے ہائیڈ پارک میں احتجاج کرنے اور تقریریں کرنے کے بعد لندن کے ٹریفلگر سکوائر پر خاموش احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خاموش احتجاج کے لئے پلے کارڈ اور نعروں کا انتخاب کرنے کی ذمہ داری میری تھی کہ میں اردو اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ میں خاموش رہا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ہو سکتا ہے لیکن اندر سے میں مایوس ہو چکا تھا اور میں اپنے لئے فرار کے کچھ اور راستے پیدا کرنا چاہتا تھا کہ میں ان سب کی طرح مایوسی اور زوال کا شکار نہ ہو جاؤں۔ میں حالات سے فرار کے لئے راستے تلاش کر سکتا تھا۔ چونکہ اتفاق سے میں ایسٹ لندن میں اپنے جلاوطنی فلیٹ کے قریب تھا تو یہی سوچا تھا کہ رات وہیں گزاروں گا۔ جیسمین کا معلوم نہیں تھا اس وقت کہاں ہو گی۔ کسی کھمبے کے ساتھ کھڑی گاہک کا انتظار کر رہی ہو گی یا اپنے بچے کو سکول کا ہوم ورک کرا رہی ہو گی۔ میرے لئے یہ ایک تجسس تھا کہ مجھے کیا دیکھنے کو ملے گا۔ اب میں نکلا تو اپنے فلیٹ کی طرف چلتے ہوئے مجھے ایک پب ملا۔ میں نے سوچا نشہ تو اُتر چکا ہے، نشہ لینا مجبوری ہے تا کہ وہاں جا کر سو جاؤں۔ تو میں نے دو پیگ لے لئے اور پھر میں اپنے فلیٹ کو نظر میں رکھے ہوئے تھا کہ بھول نہ جاؤں۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں جیسمین کا سامنا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اُسے کھولا تو آواز پر ایک بچہ بھاگا ہوا آیا۔

"mummy you came so early"

وہ جونہی بھاگ کر میرے پاس آیا تو ڈر گیا اور بھاگ گیا۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ اُس کی ماں جلدی آ

گئی ہے لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ میں آیا تھا۔ میں نے اُسے سنبھالا اور چونکہ وہ مجھے جانتا تھا کہ میں اس فلیٹ میں رہتا ہوں تو وہ ڈرا نہیں۔ میں نے اُسے گود میں لے لیا اور کہا تم نے ہوم ورک کر لیا ہے۔ میں ایسے برتاؤ کر رہا تھا جیسے میں اُس کا باپ ہوں اور طویل چھٹی کے بعد گھر آیا ہوں یا میں کوئی فوجی ہوں جو محاذ سے چھٹی پر وہاں آیا ہوں۔ مجھے کچھ وقت لگا اُسے اپنا بنانے میں۔ اُسے کوئی کیا بتاتا کہ اس کی ماں اُسے پڑھانے کے لئے کھمبے کے ساتھ کھڑی کسی عربی، اسرائیلی، بنگالی، پاکستانی یا کسی بھی قومیت کے آدمی کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے اُس کا ہوم ورک دیکھا اور اُس کی مدد کی کہ وہ اپنی کاپیاں مکمل کر لے۔ پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کھانا کھا لیا ہے۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ چونکہ مجھے بھی کھانا کھانا تھا تو میں کچن میں گیا۔ ایک بے حد کمزور سا کچن تھا۔ میں نے دیکھا وہاں کیا موجود ہے، تو ڈبل روٹی، انڈے، سبزیاں پڑی تھیں۔ میں نے کہ نشے میں تھا لیکن نشہ انسان کے اندر کی صلاحیت کو بڑھا دیتا ہے، یہی میرے ساتھ ہوا اور میں نے ڈائننگ ٹیبل جو بے حد معمولی تھی، پر آملیٹ، ڈبل روٹی اور سبزی جو اُبلی ہوئی تھی اُسے اس قابل کر دیا کہ کھائی جا سکے۔ اب میں مطمئن تھا اور میرا نشہ میرے قابو میں تھا۔ میں نے جیسمین کے بیٹے کو اُس کی پسند کا کھانا کھلایا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں اُس کا باپ ہوں۔ جو کھانا بچا تھا وہ میں نے جیسمین کے لئے رکھ دیا کہ وہ اپنی ڈیوٹی سے آ کر بھوکی تو نہیں سوئے گی۔ مجھے محسوس ہوا میری بیوی رات کو کمانے گئی ہے اور میں گھر پر ہوں اور میں اور بیٹا اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ایک طرف زمین پر بستر جمایا کہ ایسا اس فلیٹ میں پہلے بھی میں جیسمین کے ہوتے کر چکا تھا اور جونہی سونے لگا، جیسمین آ گئی۔ وہ یہ دیکھ کر چونکی مگر جلد ہی سمجھ گئی۔ میں نے بتا دیا کہ تمہارے بیٹے کا ہوم ورک ہو چکا ہے، وہ کھانا کھا چکا ہے، تمہارا کھانا پڑا ہے، لے لینا اور میں سو گیا۔ مجھے ایسے میں جلدی نیند آ جاتی تھی۔ صبح جب اٹھا تو محسوس کیا کہ جیسمین مجھ سے لپٹ کر گہری نیند سو رہی تھی۔ اُسے میرے جسم کی گرمی چاہئے تھی۔ وہ اپنی شام کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے میرے جسم کا استعمال کر چکی تھی۔ جیسے کسی نے اُس کے جسم کا استعمال کیا۔ اُس نے اُس تکلیف کو مٹانے کے لئے میرے جسم کا استعمال کیا۔ مجھے یہ بات اچھی لگی۔ چونکہ وہ گہری نیند سو رہی تھی، میں بالکل نہیں ہلا نہ سرکا، اپنی جگہ پر جما رہا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے ہنکارا بھرا اور اُس کے ہاتھوں میں جنبش پیدا ہوئی تو میں نے آہستہ سے خود کو الگ کر لیا۔ میں کچھ دیر الگ سے لیٹا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا میرے اٹھنے سے وہ اپنی نیند توڑ دے۔ مجھے اُس کی یہ ادا بہت اچھی لگی۔ اس کے اندر ایک اچھی بیوی موجود تھی۔ اُسے موقع نہیں ملا تھا کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ ایک اچھی عورت، ایک اچھی بیوی اور ایک

اچھی ماں ہے۔ میں اگر چاہتا تو اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی جذباتی خواہش پوری کر سکتا تھا لیکن مجھے وہ سوئی ہوئی ایک پاکیزہ عورت لگی۔ اُسے ہاتھ لگانا مجھے گناہ محسوس ہوا اور میں یہ گناہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے صبح کی چائے بنائی اور اُس کے لئے بھی چائے بنائی کہ اُس نے بیٹے کو چھوڑنے سکول جانا تھا۔ میں نے ناشتہ بنایا۔ وہ بیٹے کو تیار کر چکی تھی۔ بیٹے کا ناشتہ اس نے اُس کے لنچ بکس میں رکھا اور میری طرف ایسے دیکھا جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ جیسے وہ اپنے خاوند کو خدا حافظ کہہ کر بیٹے کو چھوڑنے جا رہی ہو۔ وہ چلی گئی۔ میں نے ناشتہ کیا اور میں بھی چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا مجھ پر یا اُس پر کوئی جذباتی حملہ ہو اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تھا اُس کی کسی کمزوری کا فائدہ اٹھاؤں۔ میں وہاں سے چلا گیا۔

مجھے انڈر گراؤنڈ سے اپنے اخبار کے دفتر جانا تھا جہاں میں نے ایک طرف بستر لگایا ہوا تھا اور وہاں رہ رہا تھا۔ جب وہاں پہنچا تو مجھے پیغام ملا کہ پاکستان سے کچھ شاعر یہاں مشاعرے کے لئے آئے ہیں اور یہ پیغام مجھے لائلپوری کی طرف سے ملا اور اُن کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ایک شام وہ سب اُن کے گھر دعوت پر آ رہے ہیں۔ ایسے میں میرا آنا دو طرح سے ضروری ہے۔ ایک تو اس لئے کہ میں ایک جلاوطن شاعر ہوں اور لائلپوری کا دوست ہوں، دوسرا اس لئے کہ میں اردو اخبار ''صدائے پاکستان'' میں ان کی آمد کو بہتر طریقے سے پورے یورپ میں پہنچا سکوں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک تو اُس شام میں لائلپوری کے گھر پہنچا۔ وہاں میرے پہنچنے سے پہلے کوئی نہیں آیا تھا کیونکہ جس نے انہیں دعوت دی تھی وہ اپنے ملنے والوں کی گاڑیوں میں انہیں لاد کر آ رہا تھا۔ اب جب وہ پہنچے تو میں حیران رہ گیا۔ سب مقبول شاعر تھے اور ضیاء الحق کی حمایت میں اکادمی ادبیات کی کانفرنس میں گئے تھے اور ''نوائے وقت'' میں ان پر بے شمار تعریفی مضامین شائع ہوئے تھے۔ اپنے اُس وقت کے ٹیلی ویژن پر اُن کا کلام نشر ہوتا تھا۔

اب وہ مجھے دیکھ کر پہلو بدلنے لگے کہ جانتے تھے میں یہاں کیوں جلاوطنی کاٹ رہا ہوں لیکن میں نے اُن پر کوئی طنز کا تیر نہ اُچھالا۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ پاکستان کے سرکاری اور نیم سرکاری شاعر یہاں کیا کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ لائلپوری نے بلیک لیبل، ریڈ لیبل، واڈکا، ریڈ وائن اور بیئر کی بوتلوں کے مختلف برانڈ رکھ دیئے تھے لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ سب ضیاء الحق کی حکومت کے حوالے سے شرمندہ سے ہیں کیونکہ لائلپوری مسلسل مارشل لاء کی حکومت کے خلاف تازہ اشعار سنائے جا رہا تھا اور جی بھر کے اُن شاعروں پر طنز کے تیر چلا رہا تھا۔ بھٹو صاحب کی شان میں لائلپوری نے قصیدوں کی بارش کر دی اور اُن حکومتی سرپرستی والے شاعروں کو بھگو بھگو کے جوتیاں مارنے لگا کیونکہ اسے معلوم تھا اُن شاعروں نے

ضیاء الحق کے ہاتھ اکادمی ادبیات کی کانفرنس میں مضبوط کیے ہیں۔ وہ شاعر کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ میزبان ان کی بے عزتی کیے جارہا ہے۔ساتھ میں وہ اس شام شراب پینے کا موقع بھی نہیں گنوانا چاہتے تھے کہ پاکستان کیا، لندن میں بھی اتنی مہنگی شرابیں انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ سب پیگ پر پیگ چڑھاتے رہے۔ ابھی کسی کو کھانے کا نہ خیال تھا کہ اندر سے اطلاع آئی کہ کھانا لگادیں؟ لائلپوری صاحب نے کھانا لگوادیا مگر وہ شعراء کرام ابھی تک بوتلوں سے الجھے ہوئے تھے۔ لائلپوری نے اس پر بھی ان پر جملہ چست کر دیا کہ شراب ضرور پیو مگر ایسا نہ ہو کہ شراب آپ کو پینا شروع کر دے۔ جونہی کھانا لگا، ان شاعروں میں سے ایک کا دماغ تڑخ گیا کیونکہ وہ شراب پی کر غل غپاڑہ کرنے میں مشہور تھا۔ وہ کھانا کھانے سے پہلے اپنا گلاس برابر کرنے کے بعد کھڑا ہو گیا اور سامنے آ گیا" اوئے لائلپوری تو تیسرے درجے کا ترقی پسند شاعر ہے۔ ہم صرف تیری شراب پینے آئے تھے، تم نے خود کو شاعر سمجھ لیا۔ کیا لکھتے ہو تم؟ پاکستان میں تیرے جیسے شاعروں کو ہم قریب نہیں بیٹھنے دیتے۔ تم کیا بیچتے ہو، تم کوئی فیض احمد فیض ہو جس کی بات ہم سنیں۔ تم شراب بیچتے ہو اور کیا ہو تم؟ تم جیسے ترقی پسندوں کو ہم جیب میں لے کر گھومتے ہیں۔ ہمارا میزبان ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ یہی ہماری مجبوری تھی کہ تیری شراب کے لئے ہم آ گئے۔ وہ اگر ٹیکسی ڈرائیور نہ ہوتا تو ہم نے تیرے پہ تھوکنا بھی نہیں تھا۔ لندن میں رہتے ہو اس کا مطلب ہے تم پاکستان کے وائسرائے بن گئے ہو۔ تم نے بہت بکواس کر لی۔ اب ہماری سنو۔ ہمارے گھر اور بچے پاکستان میں رہتے ہیں۔ ہم مارشل لاء سے پنگا نہیں لے سکتے۔ یہ مت سمجھو ہم آمریت کو پسند کرتے ہیں۔ ہم مصلحتاً خاموش ہیں۔"

اب لائلپوری کی شراب اور کھانے کے بیچ مہمان نے جب اس طرح کی بات کی تو معاملہ بگڑ گیا اور لائلپوری ڈٹ کر سامنے آ گیا۔

"میری شراب پی کر مجھ پر بھونکتے ہو۔ ضیاء الحق کے طفیلیئے۔ اُس کے پلے تم بیچتے کیا ہو۔ تم فیض احمد فیض کی تلچھٹ پینے والے ایک نام نہاد ترقی پسند ہو۔ تم نے فیض کا نام بہت بدنام کیا ہے۔ تم حفیظ جالندھی کے بغل بچے ہو۔ تم کون ہو؟ وہ جس نے اپنی دو بیویوں کو طلاق دے دی۔ تم احسان دانش کا بستر گرم کرنے والے دو ٹکے کے شاعر ہو۔"

اس پر اُس نے لائلپوری پر مکا تان لیا اور گالی دی۔ یہاں بیچ بچاؤ کے لئے میں کودا لیکن اس کے ساتھی شاعروں نے بوتل خالی کرنے پر زور دیا اور غٹاغٹ پی کر کپڑے جھاڑ کے گھر سے نکل گئے۔ ان

کے پیچھے وہ بھی چلا گیا۔ اب سناٹا تھا، میں اور لائلپوری ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے لائلپوری کو کچھ سہارا دیا کہ کہا تو آپ نے ٹھیک تھا مگر شاید یہ موقع نہیں تھا۔ اس پر لائلپوری نے صرف اتنا کہا ''بر پشم قلندر'' اب اندر سے ان کی بیگم آئیں اور اتنا پوچھا ''کھانے کا کیا کروں؟''

''ڈال دو فریزر میں، کل کچھ اور کتے بلے آئیں گے، کھالیں گے۔'' میں نے جرأت کر کے کہا ''بھابی مجھے کچھ لا دیں۔ میں کھاؤں گا اور پھر یہیں سو جاؤں گا۔''

بس اس طرح کی شامیں اب گزرنے لگیں۔

پاکستانیوں کے کئی طرح کی قسمیں لندن، برمنگھم، مانچسٹر، بریڈفورڈ اور ان کے مضافات میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ سکاٹ لینڈ میں جو شیعہ سنی مقابلہ شروع ہو چکا تھا اس کا تو بعد میں علم ہوا کیونکہ میں لندن سے نکل کر کہیں نہیں گیا تھا۔ مجھے ایک بار بریڈفورڈ میں جیل کے ایک قیدی کے ترجمان کے طور پر جانا پڑا اور نہ میں لندن ہی میں پاکستانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھارتی تارکین وطن کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اچانک ''صدائے پاکستان'' اخبار کے دفتر میں ایک لڑکی آئی۔ تنگ موری کا پاجامہ، لمبا کرتا اور چنری جس پر بلاک پرنٹنگ ہوئی تھی۔ میں اتفاق سے وہاں تھا۔ عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں اخبار میں اوقات کو کبھی بھی فالو نہیں کرتا تھا اس لئے میں نے اُس لڑکی کو بٹھایا اور پوچھا کہ ''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔''

اس پر اس نے بتایا کہ ہمارے گھر آپ کا اخبار آتا ہے۔ کیونکہ میرے پتا اُردو جانتے ہیں۔ اس پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے بتایا کہ میں گھر سے بھاگ کے آئی ہوں اور مجھے آپ کے اخبار میں پناہ لینی ہے۔

میں نے کہا ''او کے مجھے بتاؤ کہ تم کیوں پناہ لینا چاہتی ہو۔''

''میرا باپ میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے امرتسر میں کرنا چاہتا ہے جو وہاں ڈھابہ چلاتا ہے اور باپو نے وہاں ایک حویلی بنوائی ہے جو وہ کہتے ہیں شادی کے بعد مجھے ملے گی مگر میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے اپنے سکول اور کالج کے دوست جیمز سے محبت ہے۔''

میں نے اسے بٹھایا۔ اسے پانی پلایا۔ مجھے اپنا اخبار پہلی بار سچ مچ ایشیائی باشندوں کے لئے ایک پناہ گاہ محسوس ہوا۔ میں جسے صحافت کا چیتھڑا سمجھتا تھا وہ اب ایشیائی لڑکیوں کے لئے پناہ گاہ بن چکا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا۔ مجھے اس سے اور کام لینا چاہئے۔ جب اس نے مجھے اپنی پوری کہانی سنائی تو میں انگلستان میں روزگار کی تلاش میں آنے والوں کے نفسیاتی، جذباتی، روحانی، انسانی، اقتصادی اور ثقافتی

مسائل کو سمجھ گیا۔ یہ لوگ جو دو کشتیوں میں سوار تھے، بہت بڑے دھوکے اور بہت بڑے سانحے کو دعوت دے بیٹھے تھے۔ آئے تو وہ تھے ولایت میں اپنی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے اور گوری عورتوں کے بطن سے خوبصورت بچے حاصل کرنے کے لئے اور غربت اور افلاس کے مارے ہندوستان سے فرار حاصل کرنے کے لئے لیکن یہ معلوم نہیں تھا اس کی قیمت پاؤنڈ میں ادا نہیں کرنی ہوگی، یہ قیمت انہیں جذبات، اعتقادات اور خاندانی روایات کی سطح پر ادا کرنی ہوگی۔

ایشیائی باشندوں کی گھٹی اور مزاج میں ایک بات یکساں رہی ہے کہ ہجرت تو کرنی ہے کہ یہ مجبوری ہے لیکن واپس لوٹ کے آنے کی حسرت اور خواہش کو اپنے دل میں مسلسل زندہ بھی رکھنا ہے۔ اس کو جگائے رکھنا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے وقت بھی جو جس زمین سے اکھڑا اس زمین کی مٹی ہاتھ میں لے گیا اور اپنے گھروں، زمینوں اور حویلیوں کو اس امید پر چھوڑ گیا کہ جونہی ہنگامے دور ہوں گے پھر سے واپس اپنے گھروں میں لوٹ آئیں گے۔ یہاں تک کہ محمد علی جناح بھی اسی امید پر اپنی بمبئی کی رہائش گاہ پر ذاتی تالا لگا کر آئے مگر انہیں جانا نصیب نہ ہوا۔ وہ ان ہی کی پراپرٹی ایک زمانے تک رہی۔ اب جب اگلا کوچ امریکہ اور یورپ کے ملکوں کی طرف ہوا تو ہندو، سکھ، مسلمان اور دیگر مذاہب کے ایشیائی باشندوں نے روزگار، تعلیم اور دیگر مقاصد کے لئے جب وہاں پاؤں جمائے تو یہی حسرت اور خواہش اپنے اندر پالتے رہے کہ لوٹ کر واپس جانا ہے۔ اپنی غربت دور کرلیں گے اور اتنا کچھ کمالیں گے کہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے لئے یا بیوی بچوں کے لئے ایک گھر بنالیں گے یا حویلی ڈال لیں گے تو اولاد کے جوان ہونے سے پہلے واپس آجائیں گے۔ اُن کے رشتے اپنوں میں کریں گے اور یوں ہجرت کے وسیلے سے نئی زندگی پائیں گے۔ اس حوالے سے ان سب مہاجروں نے یورپ اور امریکہ میں دن رات محنتیں اور مشقتیں کیں اور وہاں پیٹ کاٹ کر ڈالر، پاؤنڈ، مارک اور فرانک وغیرہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور اپنے اپنے ملکوں میں بھیجتے رہے۔ وہاں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو زندگی گزارنے کے لئے گھر بنا کر دیتے رہے۔ کوئی تعلیم پار ہا تھا تو اسے پڑھاتے رہے۔ کسی کی شادی تھی تو اس کا بوجھ اٹھاتے رہے۔ صرف ایک امید پر کہ جب ہماری اولاد جوان ہوگی تو ان کی شادیاں اپنے لوگوں میں کریں گے اور وہ گھر جوان کے نام پر بنائے گئے ہیں ان بچوں کو رہنا نصیب ہوں گے۔ یہ محض ایک تصور اور ایک خواب ہی رہا کہ جو نسل وہاں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی، اس کا ان کے والدین کے پچھتاوے یا خواہش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نسل نے وہاں کے ماحول کو قبول اس لئے کیا کہ ان کی مادری زبان نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ان کا تعلق وہاں کے باشندوں سے ہوا۔ اب والدین کو احساس ہوا کہ جو حویلیاں، کوٹھیاں اور فارم ہاؤس انہوں نے اپنے ملکوں میں اپنے بچوں کے لئے بنائے تھے وہ تو اغواء ہو چکے ہیں۔ ان معنوں میں کہ بھائیوں نے اس پراپرٹی کو اپنے نام منتقل کرا دیا تھا اور اب ان پر پیسے بھیجنے والوں کا حق نہیں رہا تھا۔ ایشیائی ملکوں میں یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہوتا۔ کاغذ کو ادھر سے ادھر کرنا ہوتا ہے۔ ایسا ہوا کہ جب زبردستی اپنی بیٹیوں کو اپنے ملکوں میں چکر دے کر لے گئے تو ان بیٹیوں کو صورت حال معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنے اپنے یورپی ملکوں کے سفارت خانوں کو فون کیا اور خود کو چاچوں ماموں سے رہا کرایا۔ اس سلسلے میں کئی لڑکیاں قتل کی گئیں اور کئی شادیاں کر کے برباد ہو گئیں یا مار دی گئیں۔

اب میرے سامنے وہ لڑکی کھڑی تھی اور پناہ مانگ رہی تھی۔ میں نے اسے بٹھایا، پانی پلایا اور اس سے پوچھا تم جیمز سے شادی کر لو گی کہ وہ ہندو نہیں ہے۔ اس پر اس نے کہا ''میرا کوئی مذہب نہیں۔ ہندو گھر میں پیدا ہوئی ہوں۔ یہ محض اتفاق ہے۔ مجھے تو یہ سب ڈھونگ لگتا ہے۔ کیسی کیسی رسمیں ہیں۔ پورے کے پورے دریا انہوں نے میلے کر دیئے ہیں۔ پھر بھی ان کے پاپ نہیں دھلے۔'' وہ تو بہت کچھ کہے جا رہی تھی۔ میں نے اُسے روکا اور سمجھ گیا کہ ہندو مندروں میں جو کچھ ہوتا ہے اور ان کے مذہبی گورو جو سوانگ رچاتے ہیں، یہ لڑکی اس پر وشواس نہیں رکھتی۔ میں نے کہا ''وہ اس اخبار سے کیا مدد لینا چاہتی ہے۔'' اس نے کہا ''میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اب آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں۔'' میں نے اس سے پوچھا ''جیمز کیا کرتا ہے اور کیا وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ تم سے اس حال میں شادی کر لے گا۔''

اس نے بتایا کہ وہ جیمز کے ساتھ جسمانی تعلق رکھتی ہے اور وہ ایک سچا انسان ہے۔ کہنے کو تو ان کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ جو بے معنی پھیرے ہوتے ہیں یہ سب ناٹک ہے۔ اصل رشتہ جسم و روح کا ہوتا ہے۔ وہ ہو چکا ہے۔ جسم اس وقت تک دوسرے جسم کو قبول نہیں کرتا جب تک دونوں کی روحیں آپس میں ملاپ نہ کر لیں۔ جیمز شاعر ہے اور ایک پبلشنگ کے ادارے میں ایڈیٹر ہے۔ اب میں بات سمجھ گیا تھا کہ جیمز کوئی بہت اچھا آدمی ہے۔ شاعر ہے، رائٹر ہے اور محبت کو جانتا ہے۔ اب میں نے اُس سے کہا ''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ابھی جیمز سے میری بات کرا سکتی ہو؟''

''ہاں کرا سکتی ہوں۔''

''تم نے گھر سے بھاگتے وقت جیمز کو بتایا کہ تم اس کے لئے گھر چھوڑ رہی ہو۔''

''میں نے یہ نہیں بتایا۔ اگر بتا دیتی تو وہ مجھے روکتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں اس سے اس طرح شادی کروں۔ وہ چاہتا ہے یہ شادی خاندانوں کی موجودگی میں ہو۔ مگر وہ میرے ضدی باپ کو نہیں جانتا۔''

''او کے! اب میں سمجھ چکا ہوں۔ کیا آپ میری بات جیمز سے کرا سکتی ہیں۔''

''ہاں مگر آپ کیا کہیں گے۔''

''میں اسے یہاں بلاؤں گا اور آپ کو ایک بھائی کی طرح اس کے ساتھ رخصت کروں گا۔ وہ یہی چاہتا ہے ناں۔ تو میں تمہیں ایک خاندان سے رخصت کروں گا۔''

''کیا یہ ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ اب اس اخبار کی پناہ کا تقاضا یہی ہے۔''

اس پر اس نے سوچا اور پھر فون نمبر مجھے دے دیا کہ آپ اگر میری شادی کرانا چاہتے ہیں تو Parent بن کے بات کریں۔

میں نے فون اٹھایا، ملایا اور جب جیمز نے فون اٹھایا تو میں نے بتایا کہ میں ''مادھوی کا باپ بول رہا ہوں۔'' اس نے بہت شائستہ لہجے میں کہا: ''سر میں جیمز بول رہا ہوں، سر، آپ کیسے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ جیمز مادھوی سے محبت کرتا ہے۔ میں نے اسے کہا ''مادھوی سے تمہاری شادی پر ہم خوش ہیں۔ آپ آ سکتے ہو۔ چرچ میں جانے کے لئے۔''

اس نے کہا میں اپنے خاندان کے ساتھ دو دن بعد آ سکتا ہوں۔ میں نے اسے اس کی اجازت دی اور چرچ کا بھی بتا دیا۔ اس پر مادھوی حیران ہو گئی کہ وہ تو پوا خاندان لے آئے گا۔ آپ کیا کریں گے۔ اب میری باری تھی۔ میں نے کہا سنو لڑکی! تمہاری شادی خاندان سے ہو گی یہی اس نے کہا تھا تو پھر میں پورا خاندان تمہارے لئے لے آؤں گا یہ میرے اخبار کی عزت کا سوال ہے۔ جیمز کو کیا معلوم تمہارے والدین کی جگہ کن لوگوں کو جمع کر لیتا ہوں۔ سنو تم شادی کر کے گھر سدھارو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے ان دو دنوں میں اپنے شاعر دوستوں، ترقی پسند جلاوطنوں، طیفا بٹ اور وہاں کے رہنے والے ہندو، سکھ اور مسلمان ملنے والوں کو ایسی تحریک دلائی جس میں ان کے سیکولر جذبات نے تسکین پانے کا راستہ تلاش کیا۔ طیفا بٹ اُس روز اپنے روایتی کھسے، پگڑی اور شلوار کرتے کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے ساتھ سو شرکاء کے دو پہر کے کھانے کا بندوبست بھی کر چکا تھا۔ یہ کھانا چرچ کے لان میں لگنا تھا جہاں شادی کے بعد روایتی طور پر دولہا دلہن کو استقبالیہ دیا جاتا ہے۔ جہاں شیمپین اور دیگر ڈرنکس کے ساتھ کھانا بھی ہوتا

ہے۔ مادھوی اس دوران لائلپوری کے گھر رہی اور وہاں سے وہ روایتی ہندو لباس میں تیار ہوئی۔ لائلپوری کی بیگم نے یہ فریضہ ادا کیا اور ڈرنکس کا اہتمام لائلپوری کے ذمہ تھا۔ جیمز کا اصرار تھا کہ یہ سب اُس کی طرف سے ہوگا۔ ہم نے اُسے قائل کیا کہ وہ اگلے دن مادھوی کی طرف سے آنے والوں کو ڈنر پر بلائے۔ وہ راضی ہو گیا۔

شادی کے دن چرچ میں گویا میلہ لگ گیا۔ سولنگی اپنے سندھی وڈیرے سیاست دان کو بھی لے کر پہنچ گیا۔ سب حیران تھے کہ ایک دن پہلے لڑکی اور لڑکے سے تعارف ہوا ہے۔ کوئی بھی مجھ سمیت ان کو نہیں جانتا تھا پھر بھی ایسا والہانہ تعلق بن گیا کہ ہر کوئی یہ محسوس کر رہا تھا کہ مادھوی اس کے گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ ہر کوئی اس کا سرپرست بن چکا تھا۔ میں نے بہت سی عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے بھی دیکھے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کامیاب بھی ہوگا کہ نہیں۔

اب چرچ کی تقریبات میں کوئی سماں بندھ گیا کہ سب کو احساس ہوا کہ وہ سب اندر سے زندہ ہیں۔ وہ سب انسانوں کی ایک برادری ہیں جنہیں مذاہب، سیاست اور قومی تکبر نے الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ کبھی کبھی انسان کو انسان سے ہاتھ ملا لینا چاہئے۔ مجھے اس روز ایسی خوشی ملی جو کبھی دوبارہ نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے لگا شاید میری جلاوطنی اسی واقعے کے لئے ہوئی تھی۔ شادی کے وقت جیمز اور اس کے خاندان کے لوگ روایتی سجی ہوئی گاڑی میں روایتی سوٹ پہنے ہوئے آئے۔ خواتین نے روایتی لباس پہن رکھے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مادھوی کے خاندان کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہوگا لیکن نہ کسی نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔ بہت کچھ بعد میں کھلا جب شادی ہو چکی تھی۔ جیمز نے روایتی طور پر دلہن کو ہاتھوں میں اٹھایا اور لے کر باہر آیا۔ باہر ایشیائی باشندوں نے بھی اور گوروں نے بھی خوب شرابیں اڑائیں اور گوروں کو جب معلوم ہوا طیفا بٹ کا کھانا لگا ہے تو وہ پاگل ہو گئے۔ باربی کیو کے ساتھ طرح طرح کے نان اور کڑاہیاں اور سلاد چٹنیاں دیکھ کر گورے بولے True Indian Cusine۔

میں اس شام سب کو رخصت کر کے اپنے فلیٹ پر گیا۔ میں جیسمین سے ملنا چاہتا تھا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی مجھے بیوی کا پیار دے اور جیسمین اُس رات تیار ہو کر باہر نہیں گئی۔ وہ میرے لئے وہاں ٹھہر گئی تھی۔

پاکستان سے جو بھی خبریں آ رہی تھیں ان میں میرے گھر کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میرا گھر گویا پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ میں تو اپنا گھر کھو چکا تھا۔ مجھے پاکستان سے آنے والی کسی خبر میں کوئی دلچسپی نہیں

تھی۔ پاکستان میں چڑیاں کس حال میں ہیں، مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ پاکستان میں صبح کے وقت مینائیں اور ہدہد کس طرح جاگتی ہیں، پاکستان میں کیا کوئی مور باقی بچا ہے جو پنکھ پھیلاتا ہوگا۔ وہاں بچے کس جبر کے حبس میں ماؤں کی کوکھ میں پلتے ہوں گے۔ سوچنے والے دماغ راتوں میں اٹھ اٹھ کر آسمان کو دیکھتے ہوں گے کہ یہ جبر کی رات کیسے کٹے گی لیکن اس میں ایک دروازہ نکلتا ہے جو خواب کی طرف کھلتا ہے۔ یہ خواب وہ ہوتا ہے جو کھلی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ خواب میں نے دیکھا کہ پاکستان میں اپنے گھر میں ہوں اور میرا بیٹا گود میں ہے۔ پولیس آتی ہے، وہ اسے مجھ سے چھیننے لگتی ہے۔ میں مزاحمت کرتا ہوں۔ پھر میری چیخ نکلتی ہے اور میں جاگ جاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں میں زمین پر بچھے گدے پر سویا تھا اور میرے ساتھ جیسمین گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا بیٹا ساتھ سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنا بیٹا اور بھی یاد آیا۔ ایک پل کو دل چاہا اسے اپنا بیٹا سمجھ کر اس کے ساتھ لیٹ جاؤں۔ میں شاید رات کو اپنے اس جلاوطنی کے گھر میں آیا تھا۔ میں جلاوطن شاعروں اور سیاسی کارکنوں کی اُس منڈلی میں تھا جہاں سب نے سستی شراب سے اپنا جی ہلکا کرنے کے لئے محفل جمائی تھی۔ اس میں رنگ برنگی سستی شرابیں تھیں اور سب نے مکس کر کے پی لی تھیں۔ ان شرابوں میں بکارڈی تھی، ریڈ لیبل تھی، ٹیچرز تھی، بیئر بھی تھی، جن تھی اور کچھ ایسی بوتلیں تھیں جو سستے لیبل کے ساتھ میرے کسی تجربے میں نہیں تھیں اور جب ایک بوتل دوسری سے بغیر تال میل گھل مل گئی تو سب کا جو حال ہوا وہ مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا۔ میں کیسے اپنے اس سرکاری گھر میں پہنچا، کیسے یہاں لیٹ گیا سب دماغ سے دُھل چکا تھا۔ برے خواب سے جاگا تو سر میں شدید درد اور متلی محسوس ہوئی۔ لیٹ گیا مگر کسی پہلو سکون نہ آیا تو میں نے جیسمین کے بدن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور میں اس کے بدن میں داخل ہو گیا۔ اس کا گداز جسم میرے جلتے ہوئے جسم پر پھاہا محسوس ہوا۔ مجھے سکون آ گیا اور ہم دونوں آپس میں گندھ کر سو گئے۔ صبح اُٹھا تو وہ اپنے بیٹے کو سکول چھوڑنے جا چکی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا مگر میں ایک طرح سے اچھی صبح کر رہا تھا کہ میں نے رات ایک محفوظ گھر میں گزاری ہے۔

میں نے رات کی محفل کے حوالے سے ذرا سوچا تو بہت سی باتیں ایک ایک کر کے یاد آ گئیں۔ میں انڈر گراؤنڈ ٹیوب سے ایسٹ لندن کے علاقے میں پہنچا تھا اور پھر اُس محفل میں آیا تھا۔ وہاں جیسے کہ شامِ غریباں کا ماحول تھا۔ پہلے ضیاءالحق کے خلاف ماتم برپا کیا گیا جس میں نئے پرانے زخموں کی نمائش کی گئی پھر اپنے اپنے دُکھوں کا اظہار کیا گیا پھر اجتماعی نوحہ برپا ہوا اور پھر سب نے بی بی سی کا سہارا لے کر پاکستان میں اپنا پیغام پہنچانے کا بندوبست کیا۔ یہ سب مجھے بے معنی محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے ملک میں ہو کر

مزاحمت کرنے کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ خوف بھی طاقت دیتا ہے جس میں ہر لمحہ گرفتار ہونے اور دربدر ہونے کا دھڑکا رہتا ہے۔ یہاں تو سب کچھ بے معنی ہے۔ سب سے ٹوٹ کے نہ تو احتجاج کا کوئی معنی ہے نہ آہ وفریاد کی کوئی لے ہے۔ بس ایک خودرحمی کی دیمک ہے جو چاٹتی رہتی ہے۔ رات کی محفل میں مجھے بے بسی اور بے وقعتی کا احساس سستی شراب میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا جو میرے منہ میں کڑواہٹ دے کر چلا گیا۔ اب تو میں نے چائے بنائی تو کچن میں میری ڈاک پڑی تھی جو اس سرکاری گھر کے پتے پر آئی تھی۔ یہ غالباً پچھلے ایک مہینے میں کہیں آئی تھی۔ اس میں دو خط بہت اہم تھے۔ میری بیوی کے خط تو مجھے اخبار کے دفتر کے پتے پر مل رہے تھے۔ یہ دو خط پہلی بار مجھے مل رہے تھے۔ ایک تو لاہور سے تھا اور دوسرا اوسلو ناروے سے آیا تھا۔ دونوں میرے پاک ٹی ہاؤس کے ساتھی تھے جو میری طرح اڑنا سیکھ رہے تھے۔

میں نے پہلا خط کھولا تو اس میں جو لکھا تھا وہ ایک حسرت سے شروع ہو کر دوسری حسرت پر ختم ہو رہا تھا۔ مجھے لاہور کی اُس زمانے کی شاموں اور راتوں کی کیفیت معلوم ہوگئی۔ مجھے وہ ساتھی شاعر لکھ رہا تھا کہ لاہور میں شام سے بہت پہلے سڑکیں خالی ہو جاتی ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس سے ادیب اور شاعر شام ہوتے ہی اُڑ جاتے ہیں اور اپنے اپنے آشیانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ پولیس ہرنا کے پر روکتی ہے۔ سب کے منہ سونگھتی ہے اور پھر مقامی تھانے میں لے جاتی ہے۔ اگر کسی کے منہ سے ذرا سی بھی شراب کی بو آ رہی ہوتی ہے۔ تھانوں میں ایسے لوگ تعینات ہیں جو چن چن کر صالح کردار کے حامل لگائے گئے ہیں۔ جو بھی شاعر، گلوکار، سیاسی کارکن، دانشور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ان پولیس ناکوں پر رُکتے ہیں انہیں دھر لیا جاتا ہے۔ ایسے میں گلوکار مہدی حسن، اداکار فردوس جمال، عثمان پیرزادہ، گلوکار رجب علی، شاعر حبیب جالب، پروفیسر سعادت سعید کے شراب نوشی میں گرفتار ہونے کی ساری خبریں اس خط سے مجھے ملیں۔ یہ سب تو اُس خط سے مجھے معلوم ہو گیا۔ جو اگلی بات معلوم ہوئی وہ خوفناک تھی۔ وہ یہ تھی کہ شراب کہیں سے بھی دستیاب نہیں ہے۔ جو پاکستانی شراب ہے وہ بلیک میں کئی گنا زیادہ قیمت پر ملتی ہے۔ اس میں بھی جعلی شراب جگہ جگہ بنائی جا رہی ہے اور اس جعلی شراب کو پینے کے بعد پاکستان میں جگہ جگہ ہزاروں اموات ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ دوسرا خط ناروے سے آیا تھا۔ وہ بھی میرے شاعر دوست کا تھا۔ مجھے اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ خود ساختہ جلاوطنی کے باعث ناروے جا چکا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا وہ یہ تھا کہ میرے گھر کے باہر دو پولیس والے بیٹھے رہتے تھے۔ میری ملازمت عارضی قسم کی تھی۔ ان پولیس والوں کی وجہ سے میری پرائیویٹ ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے خوفزدہ ہو کر مجھے فارغ کر دیا۔ ویسے بھی میں ان کا صرف

کاپی رائٹر تھا۔اس کے بعد نہ روزگار رہا نہ ہی میری شاعری حکومت کو کمزور کر سکتی تھی۔ جب میں نے دیکھا یہاں شاعروں کے لئے ملازمت کی مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ ہر ادارہ شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا اس لئے کہ مزاحمتی شاعری کا ایسا چلن قائم ہوا کہ راولپنڈی کے ایک شاعر پر چھاپہ ڈالا گیا جو ایک ادبی پرچہ نکالتا تھا اور اس میں شائع ہونے والی شاعری قابل دست اندازی فوج قرار پائی تھی اور اس شاعر کو بیچ چوراہے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈال کر شہر بھر میں گھمایا گیا۔ بس یہ منظر دیکھ کر وہ شاعر تاب نہ لا سکا اور اس نے لکھا کہ میں نے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی نے صلاح دی کہ ناروے کا ویزہ آسانی سے لگ جاتا ہے۔ وہاں جا کر تم بھی سیاسی پناہ لینے کے لئے مارشل لاء کا سہارا لے لینا کہ وہ سکہ رائج الوقت بن چکا تھا۔ اس طرح میں ناروے آ گیا جہاں کھاریاں، لالہ موسیٰ، گجرات اور وزیر آباد سے کئی خاندان پہلے ہی آباد ہو چکے ہیں۔ میں نے سیاسی پناہ کے لئے درخواست دے دی۔ مجھے سرکاری گھر جو دیا گیا وہ ایسی جگہ پر ہے جہاں سے پاکستانی خاندان میلوں دور آباد ہیں۔ میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ تنہائی ہے۔ میں نہ کہیں جا سکتا ہوں نہ ہی آ سکتا ہوں۔ دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ نہ کوئی سستی ٹرانسپورٹ موجود ہے۔ رات کو تو بالکل ہی کوئی ادھر نہیں آتا۔ سرکار کے پاس ہم تیسری دنیا کے بے یار و مددگار غریبوں کے لئے مہینے بھر کے لئے وافر چندہ موجود ہے مگر مجھے ابھی وہ بھید بھاؤ نہیں معلوم جس سے میں یہاں قدم بھی جما سکوں اور اپنے شاعر ہونے کا فائدہ اٹھا سکوں۔ ایک دو شاعروں سے بات ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنا حریف سمجھتے ہوئے کسی بھی طرح کی معلومات دینے سے گریز کیا۔ کسی نے بتایا کہ وہ یہاں کی حکومت کو سمجھتے ہوئے خاصا چونا لگا رہے ہیں۔ کوئی اِبسن کے تھیٹر کے نام پر کوئی شاعری اور ان کے کلچر کے نام پر جبکہ ان کا کوئی کلچر ہی نہیں ہے کہ وہ سب بحری قزاق تھے۔ اب وہ اپنے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے مہذب بن چکے ہیں اور یہاں تک کہ نوبیل انعام کا مرکزی دفتر بھی یہاں پر ہے۔

پھر اس نے لکھا کہ میں تنہائی میں کئی بار خودکشی کا سوچ چکا ہوں اور یہاں کے اخبار یہ لکھتے ہیں کہ ناروے میں خودکشی کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ مجھے اب پتہ چلا کہ ایسا کیوں ہے۔ مجھے ہر مہینے پیسے مقامی ڈاک خانے سے مل جاتے ہیں لیکن خریدنے کے لئے ایک دور دراز میں سٹور ہے جہاں ڈبل روٹی، انڈے، آلو، پیاز اور آئل کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ میں آلو انڈے کھا کھا کے ہلکان ہو چکا ہوں۔ مجھے واپس پاکستان جا کر جیل کاٹنی ہے لیکن اب میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ میں یہاں قید میں آ چکا ہوں اور رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تمہیں خط لکھا ہے کہ تم کچھ کر سکتے ہو اور مجھے لندن بلا سکتے ہو تو کچھ کرو لیکن

پاسپورٹ کے جاری ہونے کا راستہ بہت لمبا ہے۔ میں کسی روز پہاڑوں کے درمیان ایک لمبی چیخ کے بعد نیچے جھیل میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلوں گا۔ کئی بار وہ جگہ میں نے مارک کی ہے جس جگہ سے میں نے کودنا ہے۔ مجھے یہ خیال بہت رومانٹک لگتا ہے کہ سبز جھیل جو کہ کئی سالوں سے خاموش ہے۔ اس میں کئی سوفٹ کی بلندی سے ایک نوجوان گرے گا تو کچھ لمحوں کے لئے جھیل میں ارتعاش پھیلے گا، لہریں بنیں گی اور پھر وہ خاموش جھیل خاموش ہو جائے گی اور ایک لاش اوپر تیرنے لگے گی۔ یہ تصور مجھے اتنا رومانوی لگتا ہے کہ میں کئی بار یہ خودکشی خوابوں میں کر چکا ہوں۔ اب تو لگتا ہے کہ میری روح اس جھیل کے باہر بھٹک رہی ہے۔ میں اسی خیال پر نظموں کی سیریز لکھ رہا ہوں۔ کچھ تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد چھپوا دینا۔ میں نے ناروے آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں سمجھتا تھا وہ یورپ میں ہے۔ وہ تو کہیں بھی نہیں ہے۔ اب میں دیواروں سے ٹکریں مارتا ہوں۔ کہیں سے شراب خرید لاتا ہوں تو اور بھی روتا ہوں۔ تین پیگ کے بعد میں خود سے مکالمہ کرتا ہوں اور پھر میں اپنے اندر کا زہر زبان پر لاتا ہوں۔ اس کا ذائقہ چکھتے ہی میں اپنا گلا دبانے لگتا ہوں۔ میرے اندر کا سانس اندر رہ جاتا ہے۔ دیکھو میرے دوست مجھے بچا سکتے ہو تو بچا لو، نہیں تو میں جا رہا ہوں۔

یہ خط پڑھ کر میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ سر ویسے میں نے ایسے بھی پکڑنا تھا کہ رات کی بھانت بھانت کی شرابوں کے مکسچر نے مجھے صبح اس قابل کیا تھا کہ میں اگلے پانچ گھنٹوں تک کچھ بھی کرنے یا سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ ضیاء الحق نے کس کس کو شہید کرانا ہے یا کس کس کو شاہی قلعے یا ناروے کے لق و دق علاقے میں خودکشی پر مجبور کرنا ہے۔ اب میں سنبھل چکا تھا اور اپنی چائے خود بنا کر پی چکا تھا۔ جیسمین اپنے بیٹے کو سکول چھوڑ کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا ''ناشتہ بنا دوں۔''

اس نے مجھے دیکھا، مسکرائی اور سر ہلا دیا۔ میں نے ناشتہ بنایا اور ہم دونوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا ایک کال گرل جو کھمبے کے ساتھ کھڑی ہو کر روزانہ کسی گاہک کی تلاش میں ہوتی ہے، آج مجھے اپنی بیوی کی طرح محسوس ہو رہی تھی اور جو بیٹا سکول گیا وہ میرے بیٹے کی طرح مجھے محسوس ہوا ہو۔ پاکستان میں میری بیوی اور بیٹا میرے بغیر کیا کر رہے ہوں گے۔ اس طرف دھیان گیا تو میں بے چین ہو گیا۔ میں نے خود کو شک کی نظر سے دیکھا کہ ہو سکتا ہے میں لندن آنے کے بعد اپنی شخصیت کھونے لگا ہوں۔ میرے اندر کی روحانی حیثیت مشکوک ہو چکی ہے۔ میں انسان سے غیر انسان ہونے کی طرف کا سفر شروع کر چکا ہوں۔ مجھے انتظار حسین کا افسانہ ''آخری آدمی'' یاد آیا جس میں انسان بندر کی شکل اختیار

کرنے لگتے ہیں۔ مجھے بھی ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی جُون بدل رہا ہوں۔ شاید کچھ دنوں بعد انسان سے بندر میں تبدیل ہو جاؤں۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں آہستہ آہستہ اپنی شخصیت سے محروم ہو رہا ہوں۔ میں خاموشی سے جیسمین کو دیکھ کر وہاں سے نکل گیا۔

میں کہاں جا رہا تھا۔ میں ایسٹ لندن کی سڑکوں پر چل رہا تھا۔ راستے میں کوڑا کرکٹ جگہ جگہ بتا رہا تھا کہ یہ ایسٹ لندن ہے۔ میں اپنے نام نہاد اخبار کے دفتر پہنچا تو مجھے سولنگی کا پیغام ملا کہ آج رات جتوئی صاحب کے ہاں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ آپ نے کچھ نظمیں سنانی ہیں۔ میں سوچ میں مصروف ہو گیا کہ مہمان کون لوگ ہوں گے اور کیا ضیاء الحق نے مجھے لندن کی جلاوطنی میں اس لئے بھیجا ہے کہ میں شرابی اشرافیہ کو شراب پینے کے بعد ضیاء الحق کے خلاف گرماتا رہوں۔ میں نے سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اپنے پر ترس کھانا چاہئے۔ میں کون تھا اور کیا بنتا جا رہا ہوں۔ کہیں ایسا وقت نہ آ جائے جب میں جیسمین کا بھڑوا بن جاؤں۔ اب میں شام کی پارٹی کے لئے سوچ رہا تھا کہ جانا چاہئے یا انکار کرنا چاہئے۔ سوچتا ہوا میں طیفا بٹ کے ہوٹل پہنچ گیا۔ جہاں شام کے ڈنر کی تیاری چل رہی تھی۔ طیفا بٹ بہت پھرتی کے ساتھ کاموں کی نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا یہاں رات کے کھانے پر کوئی بڑی شخصیت آنے والی ہے۔ اب میں جب سامنے آیا تو گویا طیفا بٹ کی آنکھوں میں مسکراہٹ پھیلی اور وہ میری طرف بڑھا اور میرے گلے لگ کر بولا ''کمال ہے سر جی! آپ کی مجھے ضرورت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کہاں سے تلاش کروں۔ اللہ نے میری سن لی۔ آپ بیٹھیں۔ او سر جی! آج میں نے آپ کو پیش کرنا ہے ایک ایسی ہستی کے سامنے جو بس اتفاق سے یہاں آ چکی ہے اور اس کو کسی کی اطلاع نہیں ہے۔ یہ اُس کا ذاتی طور پر خاموشی سے یہاں آنے کا پروگرام ہے کہ اس کے میزبان نے انہیں پاکستانی ذائقوں کے لئے یہاں دعوت دے رکھی ہے۔ جب میں بری طرح تجسس کا شکار ہو گیا تو اس نے کان میں بتایا کہ بھٹو صاحب کے ٹرائل کے جس جج نے اُن کے حق میں فیصلہ دیا تھا وہ افغانستان کے راستے یہاں آ چکا ہے۔ بس آپ کو بتا رہا ہوں۔ اب واقعی میرے لئے یہ لمحہ بہت خاص ہو سکتا تھا لیکن مجھے جتوئی صاحب کی محفل کا بھی بلاوا آ چکا تھا۔ میں نے سوچا جتوئی صاحب کے ہاں تو میں آخر میں بھی پہنچ سکتا ہوں اور ٹیکسی کے ذریعے دس منٹ کا ہی فاصلہ بنتا ہے۔ اب میں نے طیفا بٹ سے اتنا کہا کہ دیکھو تمہارے ریسٹورنٹ میں شراب نہیں پی جاتی مگر شام ہو رہی ہے، میں تمہارے کیبن میں دو پیگ پینا چاہتا ہوں ورنہ میں محفل میں اجنبی ہو جاؤں گا۔ طیفا بٹ لاہوری تھا۔ اس نے کہا ''نو پرابلم۔'' ایسے موقعوں پر اس نے ہر قسم کی مہنگی شرابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دو پیگ لئے تو

باہر ڈنر لگ چکا تھا۔ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ وہ جج صاحب کوئی تقریر کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ بٹ صاحب کی صرف ضیافت کے لئے آئے تھے۔ طیفا بٹ نے مجھے پیش کیا اور میرا احوال بتا دیا۔ جج صاحب کھانے میں مصروف تھے۔ میرا نام ان کے دماغ میں محفوظ نہیں تھا۔ طیفا بٹ کو میری شاعری پر بھروسہ تھا۔ اس نے کہا سر جی نظمیں سنائیں۔ میں اندازہ کر چکا تھا کہ جج صاحب کو کھانے میں دلچسپی ہے۔ جج صاحب نے کھانا کھاتے ہوئے میری نظم پر تبصرہ نہیں کیا، بس اتنا کہا کہ میں سوچ رہا تھا یہاں فیض احمد فیض، حبیب جالب یا کم سے کم احمد فراز تو ہوگا۔ یہ بات میں نے سن لی تھی۔ اب مجھے جتوئی صاحب کے اپارٹمنٹ جانا تھا اور میں دو پیگ پی چکا تھا۔ ٹیکسی میں نے منگوالی تھی۔ باہر کھڑی تھی۔ میں نے اُٹھتے ہوئے جج صاحب سے کہا ''سر! بھٹو صاحب کا فیصلہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے آیا ہوگا۔ تو اس میں یہ بھی لکھا ہوگا کہ ٹوتھرڈ سے یہ فیصلہ سنایا جائے تو کیا آپ بھی اس ٹوتھرڈ فیصلے کے حساب سے مارشل لاء کے سکرپٹ کے حساب سے تو نہیں چل رہے۔''

اب میں جا چکا تھا اور میں جتوئی صاحب کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں ابھی بھی شراب چل رہی تھی لیکن آخری دموں پر تھی۔ میں نے بھی گلاس لے لیا۔ وہاں مجھے جتوئی اور رضوی صاحب نے جھومتے ہوئے شیواز ریگل کی بوتل لہرا کر پیگ بنایا اور کہنے لگا ''لو جی ہمارا حبیب جالب آ گیا ہے۔''

اب میں نے سوچا میں تو حبیب جالب کا ریپلیکا بن چکا ہوں جبکہ میرے کریڈٹ پر صرف شاہی قلعے کی کال کوٹھڑی تھی۔ میں کسی بھی روپ سے جالب صاحب کی پرچھائیں بھی نہیں لگتا تھا لیکن وہسکی کا کرشمہ تھا کہ میں کوئی بھی روپ لے سکتا تھا۔ اس لمحے میں سبھاش چندر بوس بھی بن سکتا تھا۔ میں بھگت سنگھ بھی بن سکتا تھا۔ میں اس طرح کے لمحات میں روپ لے لیا کرتا تھا۔ میں حقیقت میں کون تھا۔ مجھے بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اب جو پیگ لیا تو دیکھا کچھ معززین بھی بیٹھے ہیں۔ وہسکی تو وہ بھی پی رہے تھے لیکن بہت مزاج میں تھے اور اپنی طرف سے شرفاء کا لبادہ لئے ہوئے تھے۔ اپنے جتوئی صاحب نے تعارف تو بس اتنا کرایا کہ یہ پاکستان کے اعلیٰ رتبوں پر فائز ہیں اور ان کی مہربانی کہ یہاں آئے ہوئے تھے تو ہم سے ملنے آ گئے۔ آپ انہیں نظمیں سنا دیں۔ ایسے میں سولنگی نے ایک جھلک دکھائی جس کا مطلب تھا کھانا تیار ہے۔ اس پر جتوئی صاحب نے کہا ''بھلے ڈنر تیار ہے مگر ہم پہلے شعر و شاعری سنیں گے۔ ہمارے بزرگ پی پلا کے ڈانس دیکھتے تھے۔ ناچ گانے کا پروگرام کرتے تھے۔ اب اِدھر مارشل لاء نے ہم کو اس طرح کی شاعری پہ لگا دیا ہے۔ ہاں تو سناؤ۔ کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔'' رضوی صاحب نے کہا ابھی

اس کا پیگ بنا ہے ذرا اس کے اندر روشنی تو جائے۔ ایسے کیسے پڑھے گا۔ اس پر جتوئی صاحب نے کہا ''ہاں اس خوشی میں سب کے گلاس بھرتے ہیں۔Help your Self۔

اب مجھے موقع دے کر سب نے موقع بھر لیا تھا۔ سولنگی کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈنر ایک پیگ آگے ہو چکا ہے۔ میں اُس کی رَگ رَگ سے واقف تھا۔ ایسے میں وہ خوشی سے اپنا پیگ بھی کچن میں بنا لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری نظموں کے بغیر محفل برخاست نہیں ہوگی اور ڈنر بھی نہیں لگے گا یا کھٹائی میں پڑے گا۔ سو میں پہلے ہی دو پیگ ساؤتھ ہال سے پی کے نکلا تھا۔ یہاں کے پیگ نے راستہ دکھایا اور میں نے نظمیں سنانی شروع کر دیں۔ مجال ہے جو کسی کے منہ سے واہ واہ کا کوئی بھی اشارہ ظاہر ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ میں شاہی محل کا مسخرہ ہوں یا شاہی قصیدہ گو شاعر ہوں۔ میری اوقات شیواز ریگل کے تین چار پیگ ہیں۔ میں نے جب یہ دیکھا تو ضیاء الحق کے خلاف اپنی وہ نظم پڑھ دی جس میں بھاری بوٹوں کا ذکر تھا۔ آدھی رات میں شب خون مارنے کا ذکر تھا جس میں بھاڑے کے فوجی ہونے کا ذکر تھا۔ بس پھر کیا تھا کہ ایک مہمان کہ جو اعلیٰ رتبے کا تھا جیسے کہ تعارف کرایا گیا تھا، میں نہیں جانتا تھا کون ہے۔ وہ کھڑا ہوا اور اس نے میز بان سے کہا ''جتوئی صاحب آپ نے ہمیں جوتے ہی مارنے تھے تو اس دو نمبر شاعر سے کیوں لگوائے۔ جو نہ تو فراز ہے نہ فیض ہے نہ جالب ہے۔ یہ کون بھڑ بھونجا ہے، سڑک چھاپ شاعروں کو لے آتے ہیں، کنفیوز ہے، معلوم نہیں کہ ہمیں بھاری بوٹ اور آدھی رات کا شب خون یا کچھ بھی ہو، ہم کوئی کھوتے ہیں، کیا ہمیں پتہ نہیں چل رہا کہ یہ پاکستان آرمی پر طنز کر رہا ہے۔ ہم اب نہیں بیٹھیں گے۔''

میں نے کہا ''سبحان اللہ! اب تک تو میرا کلام کسی بھی محفل کے لائق نہیں تھا۔ کسی کو اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ پہلا موقع ہے کہ میری شاعری نے تیر بہدف نتیجہ ظاہر کیا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ جتوئی صاحب آپ کے پیسے پورے ہو گئے کہ آپ کا شاعر بجلی بن کر ضیاء الحق پر گرا ہے۔''

جتوئی صاحب کی سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آرہا تھا۔ سب اس اچانک دوطرفہ حملے سے ابھی نکل نہیں پائے تھے کہ وہ صاحب جو سادہ لباس میں یقیناً کوئی جرنیل قسم کے مہمان تھے جو کسی خاص پیغام اور مقصد کے ساتھ یہاں آئے تھے، ان کے ساتھ بھی انہی کی طرح سرکاری گماشتے تھے۔ میرا جواب سن کر وہ میری طرف بڑھا۔

''تیرا منہ توڑ دوں گا۔ ضیاء الحق کا نام لیتا ہے۔ تو پاکستان میں ہوتا تو ابھی کے ابھی شاہی قلعے میں تمہاری چمڑی اُدھیڑ دی جاتی۔''

''جناب میں شاہی قلعے سے ہی سیدھا فلائٹ میں بٹھایا گیا تھا اور جرم بھی یہی نظمیں تھیں۔

آپ نے بھٹو کو قتل کر کے کس ملک کی خدمت کی ہے۔ تم حکومت پاکستان کے ملازم تھے۔ کس نے تمہیں حکومت کا حق دے دیا۔''

''میں تیری گردن توڑ دوں گا۔ تیری یہ مجال۔ نکل باہر۔ ابھی تجھے بتاتا ہوں۔''

اب جتوئی صاحب میرے اور اُس کے بیچ میں آ گئے۔ رضوی صاحب مجھے دھکا دے کر کمرے میں لے گئے اور جتوئی صاحب معافی مانگنے لگے۔

''آپ مجھے معاف کر دیں، یہ بدتمیزی میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پلیز آپ بیٹھیں، ایک ایک پیگ اور۔''

''دفع کرو جی، یہ کیا آپ نے پاکستان سے بھاگے ہوئے چوہے پال رکھے ہیں۔''

''دیکھیں جنرل صاحب، ہم بھی پاکستان سے بھاگے ہوئے ہیں مگر ہم چوہے نہیں Son of the soil ہیں۔ آپ سے ایک دو نظمیں برداشت نہیں ہوتیں تو مارشل لاء لگانے کس خوشی میں آ گئے ہیں۔ آپ نے ہم سے ٹائم لیا ہے۔ ملنے آئے ہیں اور شب خون مارنے والے کا پیغام لائے ہیں۔ جا کر بتا دو اس رات میں نقب لگانے والے چوہے کو کہ ہم سیاست دان ہیں، بکاؤ مال نہیں ہیں۔''

اب رضوی صاحب گرج رہے تھے۔

چونکہ سب وہسکی پی کر اپنے اپنے ضمیر کی حاضری دے رہے تھے اس لئے جتوئی صاحب کے لئے مشکل ہو رہی تھی کہ کیا کریں۔ اب رضوی صاحب نے اپنا پیگ بنایا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ سولنگی کو ایسے مواقع پر کھانا لگانے کی پوری مشق تھی۔ اس نے فوراً ہی میز لگا دی۔ اب وہ دونوں جرنیل آستینیں چڑھانے سے رہ گئے کہ رضوی صاحب اپنے خاندانی جلال میں آ چکے تھے اور ان جرنیلوں کو موقع کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا۔ جونہی جتوئی صاحب نے شیواز ریگل کی بوتل ان کے گلاسوں کی طرف کی، وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

''سوری جنرل صاحب، سوری، پلیز Forget it، Enjoy your drinks۔'' اب جتوئی صاحب معاملہ فہمی کر رہے تھے۔

''جتوئی صاحب ویسے یہ ٹکے کے شاعر کیا سمجھتے ہیں کہ ضیاء الحق سے ٹکر لیں گے۔ احمد فراز اور فیض کی بولتی بند ہو چکی ہے۔''

''مسٹر جنرل حبیب جالب کی بولتی تو آپ بند نہیں کر سکے۔ اسے بہت مارا ہے آپ نے مگر وہ تو ڈٹا ہوا ہے۔'' اب رضوی صاحب بول رہے تھے۔

''رضوی صاحب! پلیز آپ اندر جائیں میں آرہا ہوں۔''

''جتوئی صاحب یہ شراب نہیں بول رہی۔ میں بول رہا ہوں۔ہم یہاں گانڈ مروانے لندن نہیں آئے۔ اسی مارشل لاء سے انکار میں آئے ہیں۔اب یہ ہمیں خریدنے آئے ہیں۔ دو نظمیں تو ان سے برداشت نہیں ہوئیں۔ جب عوام کا طوفان اٹھے گا یہ کیا کریں گے۔''

''رضوی صاحب پلیز، جانے دیں۔''

اب وہ دونوں جرنیل ٹھنڈے ہوکر کھانا کھارہے تھے اور کھانے کی تعریف بھی کررہے تھے۔ جتوئی صاحب یہ خوامخواہ سین بن گیا۔آپ کی بھنڈی زبردست ہے بلکہ یہ جو مٹن کر یلے ہیں، کمال ہے اور آپ کی پوری شام۔سوری کچھ ہم سے بھی ایسے ہی غصہ آ گیا۔ویسے اس شاعر کو آپ کیوں اتنی لفٹ کراتے ہیں۔یہ کیا ہے۔ ہمارے مارشل لاء نے تو فیض احمد فیض کو سابق سکھا دیا ہے۔ضیاء الحق سے ملنے آئے، اپنی درخواست پر اور اپنا پاسپورٹ اور ویزا برطانیہ کے لئے لے گئے۔یہ سب لیفٹیے فراڈ ہیں۔''

''سوری سر آپ جانتے ہیں ہم یہاں اپنے ملک میں نہیں ہیں۔دل لگانے کے لئے کچھ تو آسرا کرنا پڑتا ہے۔اوئے سولنگی چھورے دیکھ روٹی مانی میں کمی تو نہیں ہے۔''

''نہیں سائیں، سب لگا دیا ہے، دیکھ لیں، بھنڈی بھی ہے۔دال بھی ہے، روسٹ موسٹ بھی ہے۔سب بھوجن بھاجی رکھ دی ہے۔''

''آپ کو ون فار دی روڈ ڈالوں۔''

''نہیں نہیں، بس ہم نکلتے ہیں۔''

اور پھر وہ زہر مار کر کے اُدھر سے جونہی نکلے، رضوی صاحب اور جتوئی صاحب نے نعرہ لگایا'' جئے بھٹو۔''

اور ساتھ ہی میں جونہی باہر آیا۔دونوں نے مجھے گلے لگا لیا۔''او بھائی! تم تو جالب کے بھی باپ نکلے۔یہ سب تو نہ فیض کہہ سکتا ہے نہ فراز نہ جالب۔تم نے تو ہمارے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔یہ بھڑوے ہم سے وفاداری خریدنے آئے تھے۔بولے آپ کو وزیراعظم بنادیں گے۔وزیر خارجہ بنادیں گے۔صرف ضیاء الحق سے وفاداری کا اعلان کردو۔''

''سائیں میں سمجھ گیا تھا آپ دباؤ میں تھے۔جب انہوں نے سائیں میری پوچھل پہ پاؤں رکھا تو سائیں میرا تو بھیجا اُڑ گیا۔پھر جو میں کر سکتا تھا، کیا۔باقی مجھے آج پتہ چلا میری شاعری بے کار نہیں گئی۔اس میں اثر ہے۔''

''اوشاعر صاحب! ہم بھی ایسے نہیں آپ کو بلاتے۔ آج ان پر آپ کی شاعری کا امتحان لینا تھا۔ پوری اتری ہے آپ کی شاعری۔''

رضوی صاحب بہت خوش تھے۔ انہوں نے بھی کچھ حصہ ڈال دیا۔ اب جتوئی صاحب نے زبردستی میرے لئے ایک پیگ بنایا۔ اپنے لئے تو انہیں بہانہ چاہئے تھا۔ اب رضوی صاحب کیوں پیچھے رہتے تو ہم سب نے اس شام کا آنند لیا اور ایسے محسوس کیا جیسے ہم نے ضیاء الحق کو بیچ چوراہے میں گھیر کے مارا ہے۔''

اب ہمارے جلاوطنوں کے لئے یہی باتیں ہی خواب میں لڑی جانے والی جنگ کے مترادف ہو سکتی تھیں۔

اگلے دن میں اخبار کے دفتر گیا تو مذہبی فرقوں کے جو مختلف جماعت خانے تھے، سب نے ان جرنیلوں کے اعزاز میں تقریبات رکھی ہوئی تھیں اور سب نے اشتہار دیئے ہوئے تھے۔ اب ان جرنیلوں کی وجہ سے میرے اخبار کو پیسے مل رہے تھے اور اخبار کی پانچ سو ہزار کاپیاں بھی بک رہی تھیں تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ایسا صرف پاکستان میں ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان کی تاریخ کی اینٹیں کس نے رکھی تھیں۔ اس پر بے شمار سوالیہ نشان ہیں۔ مسلم لیگ کس نے بنوائی؟ کانگریس کس نے بنوائی؟ قائداعظم تو ایک وکیل تھے۔ سیاست دان کیسے بنے؟ چرچل نے کس طرح ہندوستان کو تقسیم کرنے کے مختلف فارمولے تیار کئے؟ اور پھر کس طرح برطانیہ کے قصیدہ گو مؤرخین نے کیسے کیسے حاشیے چڑھائے وہ غور طلب ہیں۔ ریلوے کا نظام ہمارے لئے نہیں بنا تھا۔ ہندوستان کے میوے، مصالحے، کپاس، سلک، افرادی قوت، لوہا، ربڑ اور اس طرح کی اور قیمتی اشیاء ہندوستان کے کونے کونے سے اکٹھی کر کے بمبئی، کلکتہ، کراچی اور دوسری بندرگاہوں کے ذریعے سے انگلستان پہنچائی تھیں۔ سرسید کی روشن خیالی دراصل مسلمانوں کو تقسیم کر کے دو تین حصوں میں بانٹنے کی کوشش تھی جس پر ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ابن الوقت ہمیں خبر دیتا ہے۔ لارڈ میکالے کا تعلیمی نظام اور کرنل ہال رائیڈ کا لاہور میں ایچی سن کالج، گورنمنٹ کالج اور اسی طرح کے اداروں میں فرق ڈالنے کی کوشش ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ طبقاتی نظام کی جڑیں وہ گہری کر کے ہزاروں سالوں تک حکومت کرنا چاہتے تھے جیسے کہ راجوں، راجواڑوں، نوابوں، ٹھاکروں، رئیسوں، جاگیرداروں کو اپنی جگہ نائب یا اسسٹنٹ لگانا ان کا مقصد تھا۔ ان کی اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایچی سن کالج سے وہ اشرافیہ تیار کرنا چاہتے تھے جو رعایا پر حکومت کرنا سیکھیں۔ آج بھی ایچی سن کالج میں گھڑسواری سے لے کر کھانے کے آداب اور رعایا کو خود سے دور رکھنے کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور

برطانوی حکومت نے بہت جلدی میں بنایا اور دھیان سنگھ کی حویلی انہیں اندرون بھاٹی گیٹ میں مل گئی جہاں یہ کالج قائم ہوا اور شروع میں سترہ طلباء سے اسے شروع کیا گیا اور اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا گیا۔ راستے میں کوئی یونیورسٹی موجود نہیں تھی۔ یہ 1864ء کی بات ہے اور تاریخ میں لکھا ہے کہ ایچی سن سے جو اشرافیہ حکمران بنے گی اسے عملے کی ضرورت ہوگی جسے انگریزی آتی ہو۔ تو سیکریٹریٹ چلانے کے لئے کلرک، سپرنٹنڈنٹ، سیکشن افسر وغیرہ کی تربیت گورنمنٹ کالج لاہور کے ذریعے ہوگی۔

اب رہ گیا نہری نظام جس کے بڑے چرچے ہندوستان اور پھر پاکستان کے سرکاری مؤرخوں نے کئے۔ تو حقیقت یہ تھی کہ برطانیہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے اس لئے انہوں نے ہندوستان کی زرعی زمینوں کا پورا سروے کر لیا تھا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے ہندوستان سے مختلف فصلیں پیدا کرنے کے لئے ایک ایسے نظام کا خواب دیکھا کہ پورے ہندوستان میں بارش کے پانی سے لے کر پہاڑوں سے آنے والے پانیوں کو مختلف چینلز سے گزار کر پورے ہندوستان میں پھیلایا جائے۔ اس کے لئے ایک لفظ انہوں نے دیا وہ یہ تھا "Distributry" جس کا مطلب ہے پانی کو تقسیم کرنا۔ اسے ہم نہری نظام سے یاد کرتے ہیں۔ کیا یہ سب مسلم لیگ کے کرتا دھرتا لوگوں کو معلوم تھا۔ بالکل نہیں تھا کہ انگریز انہیں استعمال کر رہا ہے اور اس بات کی خبر نہرو کو بھی تھی اور ابوالکلام کو بھی تھی۔ محمد علی صاحب کو کیوں نہیں تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کانگریس اور مسلم لیگ نے نہیں کرنا تھا، چرچل نے کرنا تھا اور جب بنگال کے قحط میں لاکھوں لوگ مر گئے اور چرچل سے درخواست کی گئی کہ ان کا ٹیکس، مالیہ اور لگان معاف کر دیا جائے تو اس نے کہا یہ ہندوستانی خرگوش کی طرح کثرت سے بچے جنتے ہیں، ان کو کیا فرق پڑتا ہے اور درخواست ٹھکرا دی۔ کیا محمد علی جناح کو اس تاریخ کا علم نہیں تھا۔ چرچل ہی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کی تقسیم کی تاریخ دے دی تھی اور سرخ قلم سے تقسیم ہند کی سرحدوں کو سرخ قلم سے واضح کر دیا تھا۔ باقی سب فسانہ ہے۔ خود محمد علی جناح نے فسادات کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کے قتل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو ہم کوئی اور فیصلہ کرتے اور کنفیڈریشن کا فارمولا تو خود محمد علی جناح نے دیا تھا جسے نہرو نے نامنظور کیا تھا۔ انگریزوں نے اگلے سو سال کا بندوبست کر لیا تھا کہ حالات نے پلٹا کھایا اور ایک روس تو دوسرا جرمنی اپنی طاقت کے نشے میں مدہوش سامنے آ گئے۔ اب جو ہوا وہ تاریخ ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے چرچل اور آئزن ہاور کے چھکے چھڑا دیئے جس کے بعد برطانیہ کو ہندوستان سے اپنا بستر لپیٹنا پڑا اور اس میں اس کی دور اندیشی بھی شامل تھی کہ چین اور جاپان نئی طاقت کے

طور پر سامنے آ چکے تھے۔ ساتھ میں روس نے بھی اپنا پرچم بلند کر لیا تھا۔ ایسے میں چرچل کو یہ فیصلہ لینا پڑا کہ ہندوستان سے نکلو کیونکہ نکلنے کے بعد بھی کئی سو سالوں تک ہندوستان کسی نہ کسی شکل میں ان کا غلام رہے گا اور اس کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ نہرو نے تعلیم کا ذریعہ انگریزی بنا دیا۔ پاکستان میں اعلیٰ ملازمتوں کی زبان انگریزی قرار پائی۔ پہلے ہم پر انگریزوں نے حکومت کی اور بعد میں ہم پر انگریزی حکومت کر رہی ہے۔ چرچل کی ذہانت ابھی تک کام کر رہی ہے اور ہم آج بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم نے پاکستان ایک نظریے کے تحت بنایا ہے۔ نظریہ کیا تھا؟ اور وہ نظریہ کس نے دیا تھا؟ علامہ محمد اقبال نے۔ وہ تو ساری زمین کو مسلمانوں کا وطن کہہ رہے تھے اور صحیح کہہ رہے تھے۔ انہوں نے تو کسی کو لائسنس نہیں دیا تھا کہ ان کی بات کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کر لیں۔

میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا یہ سب سوچ رہا تھا کہ ضیاء الحق کے گماشتے اب پاکستان کے مختلف فرقوں میں الگ الگ پیغام دیں گے جس سے پاکستان میں فرقہ واریت کو ہوا ملے گی جس کا فائدہ ضیاء الحق اینڈ کمپنی کو ہوگا لیکن پاکستان کا کیا ہوگا مگر اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کون ہے؟ اور کس کو اس کی پروا ہے؟ جس نے بھی پاکستان کے ذریعے اپنا چورن بیچنا ہے تو وہ بیچے گا۔ جیسے ضیاء الحق بیچ رہا ہے۔ اب جب اخبار کا نام نہاد مالک داخل ہوا تو خوشی سے میرے گلے لگ گیا کہ یکدم اتنے اشتہار آ گئے ہیں اور سب کے سب نے ان اشتہاروں کا معاوضہ بھی دے دیا ہے کہ ہمارا اصول ہے ہم اشتہار چھاپنے سے پہلے پیسے لے لیتے ہیں۔ اب میرے پاس تو اس کی خوشی کے مقابلے میں کیا تھا؟ لیکن میں سوچ یہ رہا تھا کہ ضیاء الحق نے پاکستان کو اگلے سو سالوں کے لئے بیچ دیا ہے۔

اخبار نے جیسے چھپنا ہوتا ہے، چھپ گیا۔ جس جس کو جو فائدہ ہونا تھا، ہو گیا تھا۔ میں رات کے تجربے اور اس طرح کے واقعات کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کیا کھویا کیا کھو سکتا ہوں۔ ایسے میں لندن تو آزاد ملک اس لئے تھا کہ چرچل کے پیروکاروں نے ہندوستانیوں کو لڑانے کے لئے طرح طرح کے بھید بھاؤ بنا دیئے تھے۔ کانفرنسیں، یونیورسٹی ریسرچ، ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے آپس میں میل جول کے ذریعے سے نئے سے نئے موضوعات اور تہذیبی تنازعات کے شاخسانوں پر بحث مباحثہ، یہ سب چرچل نے شروع کر دیا تھا اور اسی کی ہدایت پر آج تک ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیاں چل رہی ہیں۔

اخبار تو چلنا ہی تھا۔ چرچل اپنے خیالات کے ساتھ زندہ تھا۔ اس نے لندن میں نئے ہندوستان کو دوبارہ سہ بارہ تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا جسے بی بی سی سے لے کر آکسفورڈ یونیورسٹی، کیمبرج

یونیورسٹی ،لندن یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیاں بڑی مخلصانہ کاوشوں سے انجام دینے میں لگی ہوئی تھیں اور وہاں پر ریسرچ کے نام پر طرح طرح کے مقالے یا تھیسس سامنے آرہے تھے جن میں آدھے ریسرچر برطانیہ کی تاریخی انانیت پر اصرار کر رہے تھے تو آدھے ہندوستان کے رومانس میں آزادی کا راگ الاپ رہے تھے۔ یہ سلسلہ چلنے والا تھا اور اس کی پذیرائی کے لئے میدان بھی ہموار تھا۔ لاکھوں کتابیں اس پر لکھی جاتی تھیں کہ ان سب کتابوں کے قاری دنیا میں موجود تھے جو اس تاریخ سے سبق نہیں سیکھنا چاہتے تھے، اس تاریخ سے لذت لینا چاہتے تھے۔ یہ تاریخ ان کے لئے تفریح کا درجہ رکھتی تھی اور اس کی بنیاد پر وہاں کی فلم انڈسٹری نے اپنا کمرشل سینما استوار کیا۔ ایک طرف برطانیہ میں ویزا لینے سے لے کر وہاں کی گوریوں سے رومانس ان ہندوستانیوں کی مجبوری ہے تو دوسری طرف اسی برطانیہ سے آزادی کے لئے دوڈھائی ہیروؤں کے سہارے پوری فلم انڈسٹری کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک منافق معاشرے کے یہی خدوخال ایک صدی سے چلے آرہے ہیں۔ اگلی تمام صدیاں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں رہنے والوں پر اس طرح وار کرتی رہیں گی۔ نہ دوست کا پتہ نہ دشمن کا پتہ۔ ہم اندھیرے میں تلواریں چلاتے چلاتے خود کو زخمی کر لیتے ہیں اور ہم ہمیشہ زخمی ہی رہیں گے۔ برطانوی مؤرخوں سے لے کر ان کے ادیبوں تک نے ہندوستان کو کبھی تو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے راجوں، راجواڑوں، مغل سلطنت، حیدرآباد سلطنت، اودھ کی سلطنت اور راجستھان کی حکومتوں کے اندرونی تنازعات پر اپنے ناول چمکائے۔ اپنا فکشن دنیا میں بیچا اور پھر ہندوستان کی کوزین بیچی پھر ہندوستان کا لباس بیچا۔ گویا ہندوستان مسلسل بکتا ہی رہے گا۔ ایسے میں جو پاکستان اور بنگلہ دیش بیچ میں بن گئے تھے تو اس کا تاثر زائل کرنے کے لئے پورے یورپ اور خاص طور پر انگلستان میں انڈین ریسٹورنٹ اور انڈین فوڈ یا انڈین کوزین نے دھوم مچادی۔ کہیں کہیں حب الوطنی کا تڑکا لگانے کے لئے بنگلہ دیشی ریسٹورنٹ، لاہور کڑاہی تکہ اور پنجاب تکہ نام کے کچھ ڈھابے ہماری قومی تسکین کے لئے مل جاتے ہیں۔

تاریخ سب کے لئے خودفریبی اور فرار کے بے شمار چور دروازے رکھتی ہے اور ہر شکست خوردہ قوم ان دروازوں سے واقف ہوتی ہے۔ اسے اپنی شکست میں بھی فتح کا کوئی نہ کوئی عنصر دکھائی دے جاتا ہے اور انہیں تو مسلمانوں میں شہادت کا تصور فتح ہی کا ایک نشان ہے اور اسی بناء پر شہادت کا فلسفہ عام ہوا ہے۔ اور ہر حادثے کو شہادت کے رتبے میں بدلنے کا فن بھی ہم نے سیکھ لیا ہے۔ اس پر سعادت حسن منٹو نے اس منافقت پر طنزیہ افسانہ ''شہید ساز'' لکھا ہے ہم شہید بنانے کے کیسے کیسے طریقے ایجاد کر چکے ہیں۔

میں سوچ رہا تھا ہماری تاریخ کیا ہے؟ اصلی تاریخ کیسے چھپا دی گئی ہے کہ آنے والی نسلیں کبھی بھی اسے کھوج نہیں پائیں گی۔ کیا کسی قوم کی تاریخ مقدس گائے ہے کہ اس کو کھوجا نہ جا سکے یا اس پر غلاف چڑھا دیئے جائیں اور غلاف چڑھانے والوں کا بڑا طبقہ تیار کیا جائے۔ اس کی پرورش کی جائے اور ان کو معاشرہ ہر طرح کی مراعات دے کہ یہ وہ معزز تاریخ دان ہیں جو اصلی تاریخ کو چھپانے کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اگر یہ ایسا نہ کریں تو نہ صرف قوم ننگی ہو جائے، ملک کی دھوتی بھی اُتر جائے گی۔ ویسے قوم کی دھوتی سو بار بھیک مانگتے ہوئے، قرض مانگتے ہوئے، امداد مانگتے ہوئے اُتر جائے، اس عریانی کا کوئی ڈر نہیں بس تاریخ کے بدن سے دھوتی نہیں اُترنی چاہئے کیونکہ ہمارے پاس ناز کرنے کے لئے صرف تاریخ ہی تو رہ گئی ہیں اس لئے یہ مقدس گائے ہے۔ اب کوئی مجھے پاکستان کی اصل تاریخ بتا دے۔ کس نے پاکستان بنایا؟ پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے کیا صرف قائداعظم محمد علی جناح ہی یہ کریڈٹ لے سکتے ہیں۔ کیا پاکستان کو بنانے والا ایک بیرسٹر ہی ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اتنا بڑا ہندوستان جہاں ساٹھ کروڑ مسلمان ہوں گے۔ وہاں ایک دو حصوں میں تقسیم خطے کو ایک بیرسٹر بڑی آسانی سے سنبھال سکتا ہے؟ یہ کیا برطانوی حکومت اور خاص طور پر چرچل سمجھ سکتا تھا؟ وہ اس لئے سمجھ سکتا تھا کہ اس نے بہت چھان بین کے بعد یہ تقسیم کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے مہاساگر سمرا ٹھ سے دو ندیاں آزو بازو سے نکال کر ہندوستان کے مہاساگر کا تو کچھ نہ بگڑا ہو گا مگر ان دو ندیوں نے کیسے رواں رہنا تھا، یہ ایک سوچنے والی بات ہونی چاہئے تھی مگر کیا کسی نے سوچا اور اگر سوچا ہو گا تو تب بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ ان دو ندیوں میں آنے والے وقتوں میں جو کوڑا کرکٹ پڑنے والا تھا کیا کسی نے اس کا ادراک کیا ہو گا۔ یہ وہ سوالات تھے جو مجھے مجبور کر رہے تھے کہ پاکستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ جوں جوں میں سوچ رہا تھا، بہت کچھ واضح بھی ہو رہا تھا کہ مسلم لیگ کی تحریک کب شروع ہوئی اور ان علاقوں کے مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا۔ وہ طبقے کون سے تھے اور اس کے مقابل ہندوستان میں کئی بڑی تحریکیں مسلم لیگ کے مقابلے میں بے حد بڑی اور ہندوستان کو حقیقی آزادی دلانے کے لئے متحدہ ہندوستان کی سطح پر چل رہی تھیں۔ تو ایسے میں مسلم لیگ کی تحریک پر انگریزوں کی توجہ کیوں گئی۔ سب سے بڑی تحریک تو متحدہ ہندوستان کی گاندھی، ابوالکلام آزاد اور خان غفار خان کی تھی۔ اس کے بعد Quit India کی تحریک۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک تھی جو متحدہ ہندوستان کی سطح پر جدوجہد کرنے والی تحریکیں تھیں۔ سب تحریکیں ایک طرف اور مسلم لیگ کی تحریک پر انگریزوں نے فوراً آمنا وصدقنا عمل کر دیا اور وہ

بھی ایسے میں کہ کسی کو معلوم نہ تھا کون سا علاقہ کس کے پاس جائے گا۔ کیسے پنجاب کاٹا جائے گا، کیسے بنگال کو تقسیم کیا جائے گا، کیسے راجستھان کے دو ٹکڑے ہوں گے اور کیسے کشمیر کو کاٹا جائے گا۔ کند چھری سے اور پھر کس طرح جونا گڑھ اور امرتسر کو پاکستان سے نکالا جائے گا اور حیدر آباد دکن کو کس طرح بے بس کیا جائے گا۔ کسی نے سوچا یہ کیسی تاریخ ہے۔ کیسے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کن بنیادوں پر حاصل کیا جائے گا۔ مسلمان تو ہندوستان کی رگوں میں آباد تھے تو کیا ہندوستان کی رگوں میں سے قطرہ قطرہ مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرنا تھا۔ کیا یہ مسلم لیگ کے لیڈروں نے سوچا تھا۔ مجھے جواب چاہئے۔ کیا مسلمان صرف پنجاب، کشمیر یا بارڈر کے قریبی علاقوں سے آئیں گے نئے ملک پاکستان میں۔

بہت بڑا سوال یہ تھا کہ ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا کس کی ضرورت تھی اور کیوں ضروری تھا۔ بے اطمینانی، غربت، ناہمواری اور طبقاتی تقسیم کے ساتھ لسانی، مذہبی، ثقافتی اور قومی سطح کی تقسیم تو ہمیشہ سے موجود تھی تو کیا اس وجہ سے ہندوستان کو تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ جو مجھے لندن میں تنگ کر رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ صدیوں کی ریاضت اور تپسیا کے بعد جب مسلمان صوفیاء، علماء، ولیوں اور سجادہ نشینوں نے ہندوستان کے تمام مذاہب اور طبقوں میں ایک طرح کی یگانگت دریافت کر لی تھی اور اس یگانگت کی بنیاد پر سب مذاہب کو ایک ساتھ رہنا سکھا دیا تھا تو پھر اس ایکتا اور یگانگت کو توڑنے کی کیا ضرورت تھی اور مذہب کی بنیاد پر نفرت کا بیج بونے کا آغاز کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ وہ سوالات ہیں جو مجھے گھیرے ہوئے تھے اور ایسے میں پاکستان میں دو جرنیل یہاں کے تمام مذہبی فرقوں کے جماعت خانوں میں مدعو کئے گئے تھے اور اگلے دن میرے اخبار میں ان کی خبریں شہ سرخیوں میں شائع ہونے کے لئے آنے والی تھیں کہ اشتہاروں کی صورت میں ان خبروں کی قیمت ادا کر دی گئی تھی اور مجھے اب پاکستان واپس جانے کی امید ختم ہوتی نظر آئی کہ رات کے واقعے میں جو کچھ ان دونوں جرنیلوں کے ساتھ ہوا، اس کے بعد مجھے یہ پاکستان گھستے ہی گرفتاری کا جال بچھا سکتے ہیں۔

مجھے لندن کبھی تو دوست محسوس ہوتا تھا، کبھی دشمن جو ایک لمحے میں مجھے اکیلا کر دیتا تھا اور اگلے لمحے میں جذباتی سہارا دے دیتا ہے۔ اب میں لاہور میں اپنی بیوی اور بیٹے سے جذباتی طور پر دور ہونے لگا تھا اور دور ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی آنے والے خطوط میں بھی اب گرمی کم ہونے لگی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا، اس کی وجہ میں تھا یا میری بیوی...... یہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔

....

لندن کا موسم بدل رہا تھا۔ یوں تو وہاں کے موسم کے لطیفے مشہور تھے لیکن اب مجھ فضا میں خنکی اور خوشبو کا امتزاج محسوس ہو رہا تھا۔ میں غالباً کرام ویل روڈ پر جا رہا تھا۔ خوبصورت کشادہ سڑک تھی۔ شام ایسے اُتری جیسے کوئی سہاگن کسی گاؤں میں اترتی ہے۔ آسمان پر روشنی تھی اور لندن کی سڑکوں پر قمقمے جل چکے تھے۔ دونوں روشنیاں ایک دوسرے کو جدا بھی کر رہی تھیں اور ملا بھی رہی تھیں۔ میں بس یونہی نکلا تھا۔ ارادہ تھا کہ کرام ویل روڈ کے آخر میں واقع ایک گراسری کی بڑی چین سے کچھ خرید لوں گا یا یونہی وقت گزار لوں گا اور میرے پاس اس سڑک کے کونے پر ایک پاکستانی کے اپارٹمنٹ کا نمبر بھی تھا جو اس نے مجھے جلاوطنوں کی ایک میٹنگ میں دیا تھا۔ ادب سے ایسا تعلق نہیں تھا، ادیبوں سے تھا۔ غالباً یونس نام تھا اور وہ سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ میں نے سوچا آج اُسے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ لندن میں پاکستانیوں کے اتنے طبقوں، اتنے فرقوں، اتنے رنگوں اور اتنی ثقافتوں کو دیکھ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اپنے لاہور سے جلاوطن ہونے کے بعد ایک ایسے پاکستان سے ملنا ہے جس سے میں کبھی واقف بھی نہیں تھا اور اب ایسا ہو رہا تھا۔ ابھی میں شام کے سہانے منظر میں تھا کہ فٹ پاتھ پر سامنے سے ایک گورا گزرا جو ظاہر ہے انگریز ہوگا۔ اس نے بازوؤں میں ایک لڑکی کو اٹھا رکھا تھا اور وہ جب میرے پاس سے گزرے تو لڑکی نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''اس پر ترس نہ کھانا، اس نے ابھی دس منٹ پہلے وہ سامنے والے ارلز کورٹ کے چرچ میں شادی کی ہے۔ اسے یہ بوجھ ساری زندگی اٹھانا ہے۔'' اور وہ گزر گئے۔ میں بھی گزر گیا اور پھر میں یونس کے سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں جب آیا تو اس نے ایک تاریخ مجھے بتا دی کہ وہ خود ادیب نہیں تھا مگر وہاں ہندوستان اور پاکستان کے بڑے چھوٹے سب ادیب آ چکے تھے۔ کیونکہ وہ سینٹرل لندن میں مرکزی مقام پر تھا۔

اس نے بتایا یہاں دو بار جلاوطن شاعروں کو مدعو کر چکا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ ان کی روحیں

اندر سے نا آسودہ ہیں اور وہ زندگی سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میں نے اسی لمحے محسوس کیا کہ میرے اندر بھی روح مجھ سے پردہ کرنے لگی ہے۔ میں ایک انتہائی مایوس انسان ہوتا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب طرح کی متلی ہر وقت میرے اندر پلتی رہتی ہے۔ کاش میں نے کامیو کو نہ پڑھا ہوتا۔ کافکا اور آندرے ژید کو نہ پڑھا ہوتا۔ یہ سب انسان کے اندر کے انسان کو ریزہ ریزہ دیمک کی طرح چٹ کرنے کے عمل کی اطلاع دیتے ہیں۔ ان کا یہ اطلاع دینا اس لمحے مجھ میں ایک احساس کو جنم دے گیا کہ میں بھی کامیو، کافکا اور آندرے ژید ہی کا کوئی کردار ہوں۔ یہ لوگ فرانس اور جرمنی میں کیا دیکھ رہے تھے کہ پوری دنیا کو زوال کی فلاسفی سمجھا دی اور تو اور اپنے پاکستان کے افسانہ نگار انتظار حسین کو جو ترقی پسندی کی بجائے قنوطی انداز اپنائے ہوئے تھے ان کو ایک نئے انسانی ادراک سے آشنا کر دیا جس میں زوال پذیری کے اندر سے ایک نئی زندگی کا بیج پھوٹ رہا تھا۔ یہ عجیب طرح کی فلاسفی تھی جو بظاہر تو زوال پسندی کا اشارہ تھا۔ حقیقت میں تاریک سرنگ کے آخر میں روشنی کا استعارہ تھا۔ اب میں نے جب اس فلاسفی کو سوچا تو خود کو بچانے کے لئے بیدار ہو گیا اور یونس نے جب مجھے بتایا کہ لندن میں ایک ایسا مرکز بھی ہے جو ساؤتھ ایشین فنونِ لطیفہ کو مذہب، ثقافت، ملک وملت سے بالاتر ہو کر دیکھتا ہے اور اس کی ممبر شپ ہوتی ہے اور میں پاکستانی ہوتے ہوئے ممبر شپ لے سکتا تھا اور آپ بھی میرے ساتھ جا سکتے ہیں۔ مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آئی کہ میں ایسٹ لندن کے ساؤتھ ہال اور سینٹرل لندن میں بکھر سا گیا تھا۔ یونس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے پروگرام پہلے سے طے ہو جاتے ہیں اور ممبروں کو اس کی اطلاع ہو جایا کرتی ہے جو نوٹس بورڈ پر آویزاں ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا اب کب یہ پروگرام ہوگا۔ اس نے فوراً ہی تھوڑی سی تلاش سے وہ پمفلٹ ڈھونڈ نکالا اور بتایا کہ دو دن بعد وہاں مختلف زبانوں کی شاعری ہوگی اور پھر ہندوستان کی مختلف ڈانس فارمز کا مظاہرہ ہوگا جن میں کتھک، بھارت ناٹیئم اور کلاسیکل ہوگا۔ میں نے پوچھا ہر شاعر شاعری سنا سکتا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ یہ اوپن فورم ہوتا ہے۔ کوئی باقاعدہ ترتیب شدہ پروگرام نہیں ہوتا اور یہی اس کی خوبصورتی ہوتی ہے کہ اچانک نئی سے نئی دریافت سامنے آ جاتی ہے۔ اب میرے اندر کا شاعر خود کو ساؤتھ ایشیا تک پھیلتے دیکھنا چاہتا تھا۔ یونس نے مجھے آلو گوشت اور روٹی کھلائی۔ ظالم لگتا تھا پیدائشی باورچی ہے۔ میں نے کہا میں تمہارے ہاں سو جاؤں تو اس نے کہا یہ لمبا سا بیڈ ہے جہاں بھی سو جاؤ۔ اور پھر میں نے کہ تین وہسکی کے پیگ لے لئے تھے اور آلو گوشت کا ڈنر کر لیا تھا، سو گیا۔ یہ ایک نئی جاگرتی تھی۔ میں لندن کو پاکستانیوں کے ذریعے سے نہیں دنیا کے ذریعے سے دریافت کرنا چاہتا تھا اور یہ ایک نیا دروازہ مجھے مل رہا تھا اس لئے دو دن بعد ہم دونوں اس سینٹر

میں پہنچ گئے۔ایک تو وہ تھا سینٹرل لندن کے آس پاس، دوسرا وہ بے حد جمالیاتی انداز سے بنایا گیا تھا۔ دیواروں پر مورتیاں سجی تھیں جو رقص کے زاویوں پر تھیں۔ موسیقار اپنے سازوں کے ساتھ وہاں میورل میں مجسمہ سازی کے فن میں دکھائی دے رہے تھے۔

میں یونس کے ساتھ وہاں پہنچا تو کتھک ڈانس کا ایک پروگرام چل رہا تھا۔ وہاں دیکھنے والوں میں انگریز بھی تھے۔ پاکستانی نہ ہونے کے برابر تھے البتہ ہندوستان سے ایک اچھی تعداد میں مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھ گئے۔ سٹیج پر کتھک کی گروپ پرفارمنس چل رہی تھی۔ میرے لئے یہ انوکھا تجربہ تھا۔ روح اور جسم کا ردھم اور پھر اجتماعی حرکات سے ایک کہانی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ لگتا تھا یہ گروپ الگ الگ جسم نہیں رکھتا۔ ان سب کا ایک جسم ہے جو ایک ساتھ سانس لیتا ہے، ایک ساتھ متحرک ہوتا ہے۔ رقص کی اگر کوئی تعریف ہو سکتی ہے تو وہ مجھے اس لمحے سوجھی کہ رقص وہ ہوتا ہے جس میں سے رقاص نکل جائے اور اس کی جگہ رقص لے لے۔ میرے سامنے صرف رقص تھا۔ رقاص یا رقاصاؤں کا کوئی امیج موجود نہیں تھا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا کتھک کا مطلب کیا ہے؟ رقص کے ذریعے کہانی کو بیان کرنے کا علم بھی یہاں ہوا۔ اب مجھے معلوم ہوا لندن تو جادونگری ہے۔ لندن ہی میں ہم ایک بے حد چھوٹے سے پاکستان میں بھی رہ سکتے ہیں اور ایک بڑی دنیا بھی ہم پر کھل سکتی ہے۔ یہ احساس اس دن ہوا اور پھر میں نے سوچا کہ ابھی کتنا اور لندن کو دریافت کرنا ہے۔ وہاں کسی نے دعوت دی کہ اگر کوئی یہاں شاعر ہو اور اپنی کویتا سنانا چاہتا ہو تو سٹیج پر آ جائے کیونکہ یہ کلب اوپن تھا سب کے لئے۔ جو بھی وہاں آ کر اپنا آرٹ پیش کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ ایک ہندی کے شاعر نے کویتا سنائی جس نے کسی کو خاص متاثر نہ کیا۔ ایک انگریز لڑکی نے دو تین نظمیں سنائیں جو اس کی عمر کے حساب سے رومانوی احساس لئے ہوئے تھیں۔ یونس نے مجھے اُکسایا کہ تم بھی سناؤ۔ میں نے حاضرین کو دیکھا تو مجھے سب کچھ معقول معلوم ہوا تو میں نے بھی حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ بس اتنا بتایا کہ میں پاکستان سے ہوں اور جلاوطن کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ اب اس کے بعد وہاں موجود لوگوں میں ہلچل دیکھی جا سکتی تھی۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ اس جلاوطنی کا سبب میری یہ شاعری ہے۔ اب جو نظمیں سنائیں تو وہ ہر سننے والے پر مکمل معانی دے رہی تھیں۔ تالیوں سے مجھے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوا۔ میں نے کئی نظمیں سنائیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو یہاں آ کر لکھی تھیں۔ ان کا درد بھی انہوں نے محسوس کیا۔ جب میں اُترا تو کئی ہندوستانی عورتیں اور مرد کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ جلاوطنی کا پہلا پھل تھا جو میری جھولی میں آن گرا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا میری نظموں کے سامعین کون ہوں

گے۔ آج مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ نہ تو پاکستانی سیاست دان نہ ہی پاکستانی جلاوطنوں نے ان نظموں کی قیمت لگائی البتہ فوجی جرنیلوں نے ان نظموں کی قیمت ضرور لگائی تھی۔ اب مجھے محسوس ہو گیا کہ میں نے جو لکھا ہے وہ پاکستان کے مارشل لاء کے حوالے سے بامعنی ہو چکا ہے۔ میں اتر کر ایک جگہ رکا کہ بہت سے ہندوستانی میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اس کے دو مطلب تھے۔ ایک یہ کہ وہ پاکستان کی سیاسی بساط کو پلٹنے میں دلچسپی رکھتے تھے کہ ہم نے مشرقی پاکستان کو کھو دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد پاکستان کیا سوچ رہا تھا۔ سچ پوچھیں تو کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کی بے غیرتی سندھ، بلوچستان، پنجاب اور خیبر پختونخوا میں پھیل چکی تھی اور دنیا ہمیں بھول چکی تھی۔ وہاں مجھے یوں محسوس ہوا کہ پاکستان اس مارشل لاء کے بعد ایک آئرن کرٹن میں چھپ چکا ہے اور پاکستان کے داخلی حالات باقی دنیا سے یا تو او جھل ہو چکے ہیں یا پھر کسی کو اُن میں دلچسپی نہیں رہی یا ایک پراسراریت کا پردہ سا چھا چکا تھا۔ یہاں میں نے اپنی نظموں کے لئے جو دلچسپی دیکھی اس کی وجہ پاکستان کے حالات تھے اور کچھ لوگوں کی شاعری سے عدم واقفیت بھی تھی۔

میں یہ شام بھول گیا تھا لیکن میرے لئے ایک دروازہ ضرور کھل چکا تھا۔ اب ایک شام میں جلاوطنوں کے علاقے ایسٹ لندن میں اس لئے جا نکلا کہ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں ہندوستان سے دو بڑے شاعر ہمارے جلاوطن شاعروں سے ملنے آ رہے ہیں۔ ویسے وہ اپنے کام سے آئے ہوئے تھے۔ اب مجھے یہ تجسس ہوا کہ ان سے مل لیا جائے۔ انہیں بہت پڑھ رکھا تھا۔ اب جو میں وقت پر پہنچا تو وہی ماحول تھا جو پہلے بھی میں دیکھ چکا تھا۔ ایک تنگ سے کمرے یا لاؤنج میں ٹھسا ٹھس جلاوطن قیدی جمع تھے اور وہاں دو ترقی پسند ہندوستانی شاعر مرکزی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں بس ایک جگہ ٹک گیا اور میں اب ایک سامع تھا۔ ہندوستان ہر لحاظ سے ہمیں یہ باور کرا چکا تھا کہ پاکستان کا قیام کسی بھی حوالے سے مسلمانوں کے لئے بین الاقوامی سطح پر کوئی خوشخبری ثابت نہیں ہوا۔ اب ان دونوں شاعروں کا نام میں یہاں نہیں بتا سکتا۔ ان دونوں کی شاعری متحدہ ہندوستان کے حوالے سے تھی اور مسلمانوں کی یگانگت کو کسی بھی طرح سے قائم رکھنے کے پیغام سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی۔ اُن کا مسلک شاعری میں انسانیت اور محبت کی فلاسفی سے تعلق رکھتا تھا۔ ظاہر ہے تالیاں بجتی تھیں مگر میں نے جو محسوس کیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے شاعر چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سب پاکستان کے قیام سے ناخوش ہیں اور وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان مل کر رہتے تو ہندوستان میں اپنی حیثیت اقلیت کی بجائے برابری پر منوا سکتے تھے۔

سب جو مارشل لاء کے ڈسے ہوئے تھے ان ہندوستانی شاعروں کو پذیرائی دے رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔اس تاریخی حقیقت کو کس نے ریکارڈ کرنا تھا۔کس نے اس پر پاکستانی عوام کوشعور دینا تھا۔ضیاء الحق تو مدرسوں کی سیاست کرنا چاہ رہا تھااور وہ کر گیا پھر وہاں ایک دور ہم جلاوطنوں کی شاعری کا بھی ہوا۔ظاہر ہے سب بڑے شاعروں نے کلام سنایا جو میر تقی میر کی حساسیت سے لے کر فیض صاحب تک کے لسانی پیکر تک آیا اور پھر وہاں ایک مختصر سی شامِ غریباں سب شاعروں نے مل کر برپا کی کہ شاعر ہوں۔المیہ ان کی زندگیوں میں ہو نہ ہو وہ المیہ کی گود میں سسکیاں لینا پسند کرتے ہیں اس لئے رنج والم کو دعوت دینا اور اس پر گریہ کرنا تو ہم سب شاعروں کا معمول رہا ہے۔شہر آشوب شاید سب سے پسندیدہ صنف ہے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے۔ پوری غزل کی روایت ہی شہر آشوب سے لتھڑی ہوئی ہے۔سب سے زیادہ گریہ ہمارے دو جلاوطن شاعروں کی طرف سے تھا۔سب کو شریک ہونا پڑا۔ان دونوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔وہ گھروں میں سوئے ہوئے تھے کہ اس وقت کے فوجیوں نے انہیں گھروں سے اٹھا کر ایئرپورٹ پر کھڑا کیا۔وہ روتے رہے کہ ہم لندن نہیں جانا چاہتے مگر ان کے نام ہائی جیکروں کی طرف سے اس لئے آئے تھے کہ وہ ان کی شاعری کو چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ انہیں شاہی قلعے میں ڈالا جائے۔وہ روتے ہوئے لندن پہنچے اور پھر وہ روتے ہی رہے۔شاعروں کا رونا بنتا ہے۔ پوری غزل کی روایت اس کی گواہ ہے کہ شاعر کو رونا ہی ہوتا ہے۔

اب میں جب وہاں سے نکلا تو راستے میں میرا وہ فلیٹ پڑتا تھا جسے میں نے گوری خاتون جیسمین کو رہنے کے لئے دے رکھا تھا۔وہ اپنے بیٹے کو پڑھا رہی تھی اور اپنے اخراجات کے لئے کھمبے کے ساتھ رات گئے کھڑی ہو کر گاہک تلاش کرتی تھی۔ میں دل سے اُس کی عزت کرنے لگا تھا۔میں سعادت حسن منٹو نہیں تھا جسے سوگندھی سے ہمدردی تھی یا جسے سلطانہ سے یا اُس جیسی سینکڑوں کوٹھوں پر بیٹھنے والی مظلوم عورتوں سے کوئی جذباتی وابستگی تھی۔ میں تو منٹو نہیں تھا لیکن پھر بھی مجھے جیسمین میں وہ ساری عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ میرے اندر منٹو کی روح کیسے آ گئی۔ میں تو ایک معمولی پاکستانی شاعر ہی تھا اور میں کوئی اصلاحی تحریک میں شامل بھی نہیں تھا۔محض ایک انسانی تعلق نے مجھے اسے سمجھنے میں مدد دی تھی۔ بہت بڑا ادب دنیا کی ہر زبان میں عورتوں سے تعلق رکھتا ہے۔فرانس، روس، جرمنی، افریقی ممالک، ایشیائی ممالک اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں یہ کردار فکشن کا سامان بنتے رہے ہیں۔ مجھے کلکتہ، دہلی، لاہور، بمبئی کے ان علاقوں کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھٹن اور تاریکی کے ماحول میں پسینوں سے

بھیگی عورتوں کے جسم کی بو میں جنسی کاروبار کی ساری سرگرمیوں کا علم تھا۔ اس سے بھی زیادہ وہاں موجود ان مردوں کا کردار جو ان کی حفاظت یا ان کی خرید و فروخت کے معاملات کی نگرانی کرتے تھے اور بظاہر ہر علاقے میں ایک طاقتور عورت ہی اس کاروبار کی مالک ہوا کرتی تھی جس کے کئی نام تھے۔ بائی جی، موسی، بیگم جان، خانم یا اسی طرح کے ہی نام ہوا کرتے تھے۔ ان عورتوں کی پشت پر غنڈے راج کرتے تھے اور انہیں تحفظ دیتے تھے۔ یہاں نہ منٹو تھا، نہ بیدی تھا، نہ کرشن چندر، نہ ہادی رسوا، نہ خشونت سنگھ، یہاں صرف میں تھا اور میرے سامنے میرا وہ یتیم قسم کا فلیٹ تھا جس میں جیسمین کو رہنے کا موقع مل گیا تھا۔ جیسمین اور ایشیائی یا دیگر ملکوں کی جسم فروش خواتین میں بہت فرق تھا۔ ویسے تو لفظ جسم فروش مجھے قطعی یہاں درست نہیں لگا تھا۔ وہ جسم فروش نہیں تھی، وہ جسم خرید خواتین تھیں۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ مردوں کے جسم خرید رہی تھیں۔ اگر کوئی خود کو اس خریداری کے لئے پیش کرتا ہے۔ میں اپنے فلیٹ میں اطلاع دے کر یعنی دستک دے کر گیا تو جیسمین کچن میں بیٹے کے لئے کچھ بنا رہی تھی۔ کچن کیا تھا، بس چولہا اور معمولی برتن اور جلاوطنوں کو جو بجلی یا جو گیس مل سکتی تھی، موجود تھی۔ اب میں نے جو وہاں جھانکا تو جیسمین کو ایسا محسوس ہوا میں نے اس کی پرائیویسی میں خلل ڈال دیا ہے کہ پھر بھی میں نے اچانک اس طرح آنے پر معذرت کی اور میں دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ جیسمین نے آ کر پوچھا آپ کو کچھ کھانا پینا ہے تو بتائیں۔ پھر وہ ایک وہسکی کی بوتل لائی اور کہا یہ موجود ہے، کبھی کبھی میں کام سے واپس آ کر سونے کے لئے لیتی ہوں۔ میں نے کہا کچن میں جو کچھ رکھا ہے میں اپنے لئے بنا لوں گا البتہ گلاس اور پانی لا دو میں یہ لے لوں گا۔

جیسمین نے گلاس میں میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بیٹے کو کھانا کھلا کے اپنے معمول کے مطابق تیار ہونے کے لئے آدھے ٹوٹے آئینے کے سامنے سستے سرخی پوڈر سے چہرے کو لیپنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں روٹی تھی یا نہیں تھی، وہ اپنا کاسٹیوم پہننے میں مصروف تھی۔ اپنی وِگ لگانے کے بعد آدھے آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ اپنے کام پر جانے کے لئے تیار تھی۔ میں یہ سب جانتا تھا۔ میں نے گلاس بنایا اور پھر جیسمین سے کہا ایک دو گھونٹ لے لو۔ اس نے مجھے دیکھا اور میرے گلاس سے دو گھونٹ لے لئے اور وہ چلی گئی کہ اس کا کھمبے کے ساتھ کھڑے ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے مقامی پولیس کو دھوکہ بھی دینا تھا اور گاہک بھی تلاش کرنا تھا۔

اس کا بیٹا کھانا کھانے کے بعد بظاہر سونے چلا گیا مگر وہ جاگ رہا تھا۔ وہ عادی ہو چکا تھا اس طرح کی آنکھ مچولی کے لئے۔ میں اسے کوئی نیا سبق نہیں پڑھانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس کے معمول

کے مطابق برتاؤ کرنے دیا کہ بچہ مکمل انسان ہوتا ہے اور جو بھی ذہن پر مرتب کرتا ہے وہ ساری زندگی اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ بچہ بظاہر سو گیا لیکن وہ ایک ایسی نیند میں تھا جو ماں کے آنے تک مضطرب رہتا تھا۔ میں کچن میں گیا اور اپنے لئے کھانا بنانے کی کوشش کی کیونکہ میں بے حد بھوکا تھا۔ میں نے ساری شام بہت پی لی تھی۔ چونکہ وقفوں سے پی تھی اس لئے ہوش میں تھا۔ کچن میں انڈے، ڈبل روٹی، دودھ، پنیر اور اس طرح کی چیزیں رکھی تھیں۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ آملیٹ بنا لیا اور ذرا زیادہ بنا لیا کہ پیٹ بھر جائے اور پھر میں گر گیا اور صبح تک سوتا رہا۔

صبح جو میں نے دیکھا تو جیسمین بیٹے کو سکول چھوڑنے جا چکی تھی۔ حیرت یہ ہوئی کہ وہ کب یہاں آئی ہوگی۔ اس نے میک اپ اُتارا ہوگا اور پھر سوئی ہوگی اور پھر بیٹے کے لئے صبح جاگی ہوگی۔ جیسمین میرے لئے ایک بڑا اہم کردار بن چکی تھی اور میں اُس میں دلچسپی لینے لگا تھا لیکن مجھے اس سے محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے ناشتہ کیا اور دیکھا کہ جیسمین سو رہی تھی۔ یہی وقت اس کے سونے کا ہوتا تھا۔ اس کا بیٹا سکول میں ہوتا تھا۔ اب مجھے اس سوئی عورت پر پیار آنے لگا تھا۔ وہ دنیا سے بے خبر اپنے آپ سے لپٹ کر سوئی ہوئی تھی۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا انسان کو اچھی نیند صرف اپنے آپ سے لپٹ کر سونے ہی میں ملتی ہے۔ اب میرا دل عورت کے لئے مچلنے لگا تھا لیکن میں نے اپنی خواہش کو دبایا کہ اس کی نیند میں حائل ہونے کا مطلب ایک انسان کے ساتھ وہ زیادتی ہوگی جو منٹو کی طوائفوں کے ساتھ ہوتی رہی تھی۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں وہاں سے نکل آیا۔

آج مجھے اخبار کے دفتر پہنچنا تھا۔ وہ کئی وجہ سے تھا۔ ایک تو پاکستان سے ڈاک دیکھنی تھی۔ پھر جیلوں سے بلاوے بھی اسی پتے پر آتے تھے۔ اس کے علاوہ اخبار میں کچھ نئی کہانی اور نئی خبر ڈالنے کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا ہوتا تھا کہ پاکستانی اور اردو پڑھنے والے ہندوستانیوں کے لئے کچھ سنسنی تو بنانی ہوتی تھی۔ اب میں نے جا کر دیکھا کہ اخبار کا مالک میرا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ چھوٹتے ہی میرے گلے لگ گیا۔ ''سر جی تسی تے گرو ہو، تسی تے بی بی سی نوں وی تھک لا دتی اے۔'' یہ اس کی نارمل گفتگو ہوتی تھی۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ میں نے دو دن پہلے جو سٹوری ڈالی تھی یہ اُس کا فیڈ بیک تھا۔ سٹوری میں نے صرف یہ ڈالی تھی کہ پاکستان سے جرنیلی بندوبست چل پڑا ہے اور بے نظیر بھٹو کو پاکستان جانے سے روکنے کے لئے ضیاء الحق کے ہرکارے دوڑ پڑے ہیں۔ اس پر اخبار کو بی بی سی سے بھی زیادہ پذیرائی ملی کہ بی بی سی کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی۔

اب میں نے اخبار کے مالک سے کہا کہ تم بھول جاؤ کہ میں اخبار کیسے چلاتا ہوں، جا کر سو جاؤ اور پھر میں نے کچھ نئی کہانیاں جن کے کچھ ثبوت میرے پاس تھے، میں نے اخبار کے آنے والے دنوں میں لکھ دیں۔ اب جو ڈاک دیکھی پاکستان سے دو خط تھے۔ دونوں میں تصویریں بھی تھیں۔ مجھ سے بیٹے کی تصویر تو پہچانی نہ گئی، بڑا ہو گیا تھا اور میں اتنے فاصلے پر تھا کہ اپنی محبت کی آنچ بھی اس تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میری بیوی تو اب محبت کرنا بھی بھول رہی تھی۔ جیسے میں اس جذبے سے دور ہوتا جا رہا تھا، یوں لگتا تھا میں جیسمین میں اپنی بیوی کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ اتنا عجیب طرح کا تجربہ ہو رہا تھا کہ میں کسی کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ اس نے لکھا کہ اس تاریخ کو اتنے بجے میں اپنے بھائی کے گھر میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔ کیونکہ ہمارے گھر میں فون نہیں تھا۔ جو دن اور وقت اس نے خط میں لکھا تھا وہ گزشتہ شام گزر چکا تھا۔ خسارے پر خسارہ چل رہا تھا۔ میں بے بس ہو رہا تھا۔ ایک خاندان کو توڑ دینا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے اٹھا کر پھینک دینے والا ضیاء الحق کون تھا اور کیا کر رہا تھا کئی نسلوں کے ساتھ۔

میں نے بیوی کو جواب تو لکھا جب اسے دوسری بار پڑھا تو پھاڑ دیا۔ اس میں جذبات ہی نہیں تھے اور میں مصنوعی جذبات ڈال نہیں سکتا تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ اب جو میں نے جیل سے آیا خط دیکھا تو کسی لڑکی نے مجھے اپنا ترجمان بنانے کے لئے وہاں کی سرکار کو لکھا تھا۔ اگلے روز مجھے جیل میں جانا تھا۔ وہاں ایک کونسل کے کمرے میں میرے سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی جو ظاہر ہے اردو میں بات کر سکتی تھی اسی لئے تو مجھے بلایا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ انڈیا سے ہے۔ حیدر آباد دکن کے ایک درمیانے سے مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے نہ انگریزی آتی ہے نہ ہندی۔ صرف دینی تعلیم پڑھی ہوئی ہے۔ باپ سخت مذہبی آدمی ہے۔ اس نے بیٹے کی تلاش میں سات لڑکیاں اوپر نیچے پیدا کر دیں۔ سب سے بڑی ٹھہری میں۔ تو ماں کے ساتھ سل پر مصالحے پیستی پیستی کب بڑی ہو گئی، پتہ ہی نہ چلا۔ میرے سینے کے اُبھار کو سب سے پہلے اَبامیاں نے محسوس کیا۔ خود مجھے بھی پتہ نہ چلا۔ اَبامیاں نے سختی سے دوپٹہ اور باہر نکلنے کے لئے برقعہ لا دیا۔ ابھی پہلی ماہواری نہیں آئی تھی کہ ابا میاں نے اماں سے پوچھا اس کے دن پورے ہو گئے ہیں تو ابھی تک اس کی ماہواری کیوں شروع نہیں ہوئی۔ دنوں کا حساب تو اماں کو رکھنا چاہئے تھا۔ ابا میاں کا حساب کیوں میرے پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔ یہ میں نہیں سمجھ سکتی۔ ابا میاں کے خوف سے اگلے ہی دن میری ٹانگوں میں سنپولیا سرسرنے لگا۔ ہاتھ لگایا تو خون تھا۔ چیخ نکلی کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اماں نے سب سمجھ لیا اور بولیں شہناز! اب تو جوان ہو گئی ہے۔ آج سے تیرے پر پہرہ لگ جائے گا۔ میں کچھ نہ سمجھی اور

پھر ایک دن ابا میاں کی بیٹھک میں ایک ابا میاں کی عمر کا آدمی ہوگا جس نے خضاب لگا رکھا تھا۔ ساتھ میں چالاک سا انگریزی بولنے والا کوئی مسلمان ہی تھا جس نے ابا میاں کو سبز باغ دکھائے اور میرا سودا ہو گیا۔

''سودے سے کیا مراد ہے۔ مطلب تمہیں خریدا گیا۔'' میں نے ٹوک کر پوچھا۔

''آپ نہیں سمجھو گے؟''

واقعی میں سمجھنا چاہتا تھا۔ اس نے پھر بتایا ''حیدر آباد میں عرب ملکوں، دبئی اور ابوظہبی سے وہاں کے سیٹھ لوگاں آتے ہیں۔ حیدر آباد سے میری جیسی لڑکیاں شادی کے پردے میں خرید کے لے جاتے ہیں۔ باقاعدہ نکاح ہوتا ہے۔ عربی لوگ بہت کچھ دے جاتے ہیں اور وہ بہت بڑی رقم لڑکی کے اَبا کے ہاتھ پر رکھتے ہیں جو اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اَبا لوگ آنے والے کچھ سالوں کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔''

''تو اس کا مطلب ہے وہ آدمی جو خضاب لگا کے آیا اس کی کیا عمر ہوگی جو تم سے شادی کرنے آیا تھا۔''

''اس کی عمر کیا ہوگی، وہ تو پچاس سے اوپر ہوگا۔''

''تمہیں کب پتہ چلا وہ پچاس سے اوپر ہے۔''

''اب لڑکی لوگ سے کیا پوچھتے ہو کہ مرد کی عمر کیا ہوگی۔''

''اچھا تو پھر کیا ہوا؟''

''تو ابا میاں نے ہمیں اسی وخت بیٹھک میں بغیر ہم سے پوچھے نکاح کرا دیا۔ اماں نے ہم کو شادی کا جوڑا پہنایا تو ہم رو رہی تھیں۔ ہم کو پتہ نہیں نہیں تھا زیورات کیا ہوتے ہیں۔ کانوں اور ناک میں جب ڈنڈیاں ڈالی گئیں تو میری چیخاں نکل گئیں۔ اب مجھے سجا دیا گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ ابا میاں نے بس رخصت ہوتے ہوئے گلے سے لگ کر اتنا بولا: دیکھو چھ بہنیں تمہارے بعد بیٹھی ہیں، تو بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ تیری وجہ سے ان چھ بہنوں کو بڑا کر لوں گا۔ اچھا برا معاف کرنا......''

بعد میں جس سے شادی ہوئی تھی اس نے بتایا کہ اس وقت کا سکہ رائج الوقت پانچ لاکھ میں میرے کو خریدا گیا اور نکاح کی تو بس رسم تھی کہ ابا کی تسلی ہو جائے کہ وہ مجھے بیچ نہیں رہے تھے، رخصت کر رہے تھے۔''

''پھر آپ کو کیسے پتہ چلا ابا میاں نے آپ کو بیچ دیا ہے؟''

''ہم کو پتہ تھا کہ حیدر آباد کے مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں دبئی اور عرب دنیا کے شیخ شادی کر کے

ادھر سے لڑکیاں لے جاتے ہیں اور پھر ان کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ انگلینڈ سے کوئی مسلمان آیا تھا اور اس نے اتنے پیسے دے دیئے کہ ابا میاں کو لگا باقی چھ لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی۔ جب ہم اِدھر لندن میں آئے تو ہم کو ایک گھر میں، جو زیادہ بڑا نہیں تھا، لایا گیا۔ ہم کو کچھ بھی پتہ نہیں تھا ہم ایک دن میں لڑکی سے عورت اور پھر عورت سے شاید ایک بوڑھی طوائف میں تبدیل ہو گئیں۔''

''مگر یہ سب کیسے ہوا؟''

''وہ ہم کو لے آیا جو خضاب لگاتا تھا۔ اس نے ہم کو بیوی بنا کے روز ریپ کیا۔ ریپ کرتے ہوئے اس نے بولا اس نے ہماری قیمت پانچ لاکھ ادا کی ہے۔ اب وہ پانچ لاکھ اسے پورے کرنے ہیں۔''

''تو پھر آپ یہاں کیسے پہنچیں؟''

''تو پھر اس نے جب مجھے ریپ کیا اور بار بار کیا تو ایک شام وہ بولا کہ مجھے اپنے پانچ لاکھ پورے کرنے ہیں اور وہ میں تم سے پورے کروں گا۔ اس کے بعد ہر شام اس نے محفل سجانا شروع کی۔ کچھ لوگ آتے تھے۔ شراب کی بوتلیں بھی ساتھ لاتے تھے۔ میرا خاوند صرف گلاس اور برف کے ساتھ سستی مونگ پھلی رکھ دیتا تھا۔ بعد میں یہ اہتمام بھی وہ آنے والے کرنے لگے۔ مجھے حکم دیتا کہ تیار ہو کر مہمانوں کی تواضع کرو۔ میں چھپ جاتی تھی۔ وہ پیگ پینے کے بعد مجھے زبردستی وہاں لا کے بٹھاتے اور کہتے تم بھی پیو۔ اس دوران جان بوجھ کے خود اٹھ جاتے اور وہ لوگ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتے، گلے سے لگاتے اور میری تعریفیں کرتے۔ میں اٹھ کر کمرے میں جاتی تو میرا خاوند آ کر مجھے مارتا اور کہتا تمہیں ان کی ہر بات ماننی ہے۔ میں نے پانچ لاکھ پورا کرنا ہے۔ پھر مجھے گھسیٹ کے ان بھیڑیوں کے آگے ڈالتا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا انگریزوں کا قانون کیا ہے۔ نہ ٹیلی فون کا مجھے پتہ تھا اس لئے وہ مجھے ہر طرح سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جب میں بھاگ کر کمرے میں جاتی تو کوئی اجنبی آتا تھا اور مجھ سے لپٹ کے کہتا تھا ہم نے تیرے لئے بہت پیسے دیئے ہیں، ہم سے تعاون کرو، ہماری بیویاں یہاں لندن میں نہیں ہیں، تم سے ان کی خوشبو آتی ہے اس لئے اپنی قمیص اور شلوار اتار دو۔ کچھ چاہئے تو تمہیں دے دیں گے۔ پھر میرا خاوند ان کی مدد کرتا اور زبردستی میرا ریپ کیا جاتا۔ دن میں وہ صبح اٹھ کر چلا جاتا۔ باہر سے دروازے کو تالا لگا جاتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا یہاں سے کیسے نکلوں اور نکلتی بھی تو کہاں جاتی۔ مجھے تو اس شہر کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ انگریزی کے بھی بس کچھ لفظ ہی آتے تھے۔ سارا دن ابا کو کوستی رہتی۔ آخر ایک دن میں نے سوچ لیا کہ مجھے شہر کا نہیں پتہ تو کیا ہے، میں جیل تو جا سکتی ہوں۔ اب میرے لئے کسی انسان کو قتل کرنا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ میں چیونٹی

نہیں مار سکتی تھی مگر کیا وہ انسان تھے؟ یہ سوال سامنے آ گیا۔ جنہیں میں قتل کرنا چاہتی تھی کیا وہ انسان تھے؟ اب میرے لئے یہ مسئلہ تھا کہ مجھے قتل کرنا نہیں آتا تھا۔ اس میں خود میری بھی جان جا سکتی تھی۔ اس پر میں بہت سوچتی رہتی تھی اور ہر شام ان کی جنسی لذت کا سامان بھی بنتی رہتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ شراب پی کر کس طرح جنونی ہو جاتے ہیں اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی کھا جانا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا تو کچھ اور تھا۔ ایک طریقہ بنایا کہ جب وہ سویا ہو گا تو اس کے سینے میں کچن کی چھری کے کئی وار کروں گی لیکن ہوا کچھ اور ہی۔''

''کیا ہوا؟''

''وہ ایسا ہوا کہ میں اپنے خاوند پر چھری چلانے سے پہلے ہی قتل کے منصوبے کے زیر اثر اتنی آ چکی کہ مجھ سے اُس کے سونے کا انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ یہ کام فوراً ہو جائے۔ میں نے ایک تیز دھار چھری کچن میں پتھر پر تیز دھار کر لی تھی۔ جونہی اس نے اپنی شراب ختم کی اور میرے پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا، میں نے پیار کا ناٹک کیا اور وہ نشے میں اس پر اعتبار کر گیا۔ میں کچھ اور کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے کہا آج میں تمہارے ساتھ سیکس کروں گی۔ چونکہ وہ نشے میں تھا، یقین کر گیا۔ میں نے اس کے کپڑے اتارے اور اسے کہا میں تمہارے اوپر آؤں گی اور خود اپنے ہاتھ سے تمہاری مردانگی کو اپنی پسماندگی کے اندر لے لوں گی۔ اُس نے اسے ٹھیک جانا اور میں اس کے اوپر آئی اور اس کا مردانہ عضو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے چھری نکال کر اسے کاٹ دیا۔ ایک چیخ خوفناک سی ابھری اور پھر میں نے وہی چھری اس کے سینے میں اتنی دفعہ زور سے گھونپی کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میرا غصہ ختم نہ ہوا، کم سے کم اتنی دفعہ میں نے چھری گھونپی کہ میں گنتی بھول گئی جیسے اتنی دفعہ میرا ریپ ہوا کہ میں گنتی بھول گئی۔ اب آپ کے سامنے ہوں۔''

''مجھے یہ کہانی عدالت کو سنانی ہے۔''

''ہاں یہ آپ نے بتانی ہے اور اگر اس طرح بتا سکیں کہ کورٹ کے سامنے پوری تصویر بن جائے تو میرے کو انصاف ملنے کی آشا ہو جائے گی۔''

''کیا تم سمجھتی ہو تمہیں انصاف مل سکتا ہے۔''

''نہیں۔ انصاف تو میں نے لے لیا ہے۔ اپنے ہاتھ سے چھین لیا ہے۔ اب جو بھی میرے ساتھ ہو گا وہ انصاف سے بھی اوپر ہو گا۔''

میں نے کورٹ میں پورا ڈرامہ کھینچا اور کورٹ نے اُس پیشی پر تو نہیں بعد میں اُسے صرف چار سال کی سزا دی اور اپنے ملک ڈی پورٹ کرنے کی سزا دی۔ میرے لئے اب اس طرح کے کیس عام سی بات تھی۔ اس میں برطانوی قانون میں بھی کچھ نقائص سامنے آئے کہ غریب علاقوں، دیہاتوں سے جن لڑکیوں کو نکاح کے سہارے سات سمندر پار اتارا جاتا ہے اس میں برطانوی سرکار کو بھی فریق ہونا چاہئے تھا۔ اس پر میں نے نکات اٹھائے۔ جج نے انہیں اہمیت دی لیکن میں وکیل نہیں تھا، مترجم تھا۔ میری حیثیت میرے تک تھی۔

اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ سینٹرل لندن کے اُس ساؤتھ ایشین کلب میں انڈیا سے کچھ فن کار اور میوزک کے لوگ آرہے ہیں۔ میں نے سوچا آج کی شام مجھے وہاں جانا چاہئے۔ وہاں کتھک ڈانس کے لئے وہی گروپ۔ سٹیج پر پہلے گروپ پرفارمنس اور پھر سولو پرفارمنس میں اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کے سب کو نمسکار کیا اور پھر اس نے قیامت ڈھا دی۔ رقاص غائب ہو گیا اور رقص باقی رہا۔ یہ بہت اعلیٰ پرفارمنس تھی۔ اس کے بعد جب سب طرح کا میوزک ہو گیا تو شاعروں کو سنا گیا۔

شام لندن پر سرمئی رنگ کی ہلکی سی چادر پھیلا رہی تھی۔ میں شاعری سنا کر نکلا۔ لندن کی اس شام لوگ رواں دواں قریبی پب، ریستوران، بار یا کلب کی جانب جا رہے تھے۔ ایسا میرا خیال تھا اور میں اکیلا سوچ رہا تھا۔ پاکستانیوں کے علاقے ساؤتھ ہال چلا جاؤں یا شاعروں کے میزبان یونس کے سٹوڈیو اپارٹمنٹ کی طرف جاؤں یا یا کے بعد کچھ دھیان میں نہ آیا کہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میرا رخ گلاسٹر روڈ کی طرف تھا جس کے آگے کرام ویل روڈ آتی ہے اور پھر یونس کا اپارٹمنٹ۔ یہ سب ابھی کچا پکا غیر ارادی طور پر تھا کہ کسی نے مجھے آواز دے کر روکا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو ابھی ساؤتھ ایشین کلب سے شریک ہونے والے نکل رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی جس نے پہلے گروپ پرفارمنس میں اور پھر سولو پر پرفارمنس میں کتھک ڈانس کیا تھا، میرے ساتھ چلتے ہوئے آرہی تھی۔

"آپ کی کویتائیں میرے کو بھا گئی ہیں۔"

"شکریہ۔"

"آپ کے پاکستان کے حالات میں سے اچھا نہیں چل رہا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے، مارشل لاء کا تجربہ آپ کو تو نہیں ہے، ہمیں تو ہو چکا ہے، کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"مجھے معلوم پڑا ہے کہ آپ کو زبردستی اِدھر Exit کیا گیا ہے۔"

''ہاں میں نے بتایا تھا لیکن کوئی بات نہیں، شاعر کا کام Resist کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر شاعر Resist کرتا ہے ورنہ شاعری نہیں ہو سکتی۔''

''میرے اور آپ کے وِچار ایک جیسے ہیں۔ ہر آرٹ چاہے ڈانس کا ہو، پینٹنگز کا ہو یا لٹریچر کا ہو، سب کسی نہ کسی کے against protest ہوتا ہے۔''

''آپ چائے پئیں گی۔''

''اس وقت کون چائے پیتا ہے۔ آپ مسلم ہیں تو چائے پی لیں۔ میں تو اس وقت ڈرنکس لیتی ہوں۔''

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ سارے مسلم چائے پیتے ہیں۔''

وہ ہنسی اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ وہ سانولی رنگت کی بہت ہی اچھے ناک نقشے کی مالک تھی۔ بال بنگال کی گھٹا سے لئے ہوئے تھے۔ لباس ہندوستان کی ثقافتوں کا امتزاج تھا۔ میں نے اسے دیکھا وہ نرتکی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا وہ موہن جوداڑو سے نکلی ہوئی رقاصہ کی مورتی تھی۔ اب میرے لئے تو یہ ایک نعمت تھی۔ میں نے اپنی بات کو خود ہی مکمل کیا۔

''میں ہر طرح کی ڈرنکس لیتا ہوں اور پاکستان میں شراب عام ہے۔ پی جاتی ہے اور پلائی بھی جاتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی کرسی بچانے کے لئے مولویوں کے دباؤ میں آ کر اس پر پابندی لگا دی جس پر لوگ کہتے ہیں انہیں شرابیوں کی بددعا لگی کہ شرابی ملامتی صوفی ہوتے ہیں۔ سب نہیں مگر کچھ ہوتے ہیں۔ اب پاکستان میں تمام مسلمان یا تو بلیک میں ولایتی شراب خریدتے ہیں یا اپنے عیسائی ملازموں کے پرمٹ پر پاکستانی شراب خریدتے ہیں جو ان کارخانوں میں بنتی ہے جس کے مالک پارسی ہوتے ہیں۔ گویا پارسیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں کو شراب دینے کا کام سنبھالا ہوا ہے ورنہ سارے شاعر، مصور، دانشور، سیاست دان، بیوروکریٹ اور معلوم نہیں کون کون ملک چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔''

''اتنی لمبی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے کسی پب میں لے جاتے۔''

''لے جانے کے لئے اتنی ہمت نہیں تھی اس لئے یہ سٹوری بتائی ہے۔''

اب وہاں ایک خوبصورت پب سامنے آیا۔ اس کا نام تھا "Seven Hounds" جس کا باہر کا حصہ خوبصورت پھولوں اور سبز پودوں سے سجا ہوا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ داخل ہو رہے تھے کہ اس شام ویک اینڈ شروع ہو چکا تھا۔ مشکل سے ہمیں جگہ ملی کہ ہم وقت پر آئے تھے۔ ہمیں دو کرسیاں مل گئیں اور میں

نے کاؤنٹر پر جا کر دو ڈبل وہسکی کے گلاس لئے اور ہم نے گفتگو شروع کر دی۔ اب اس نے اپنا تعارف کرایا کہ اس کا نام دیپتی بینر جی ہے۔ میں نے اپنا نام نہیں بتایا کہ اسے معلوم تھا۔ البتہ میں چونکا کہ یہ نام تو بنگالی نام ہے۔ اب میں نے اس کے نقوش اور اس کا آرٹ دیکھا تو میں قائل ہو گیا کہ وہ بنگال سے ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بنگال کا عاشق ہوں۔ چاہے فلم ہو، مصوری ہو، میوزک ہو، رقص ہو، شاعری ہو یا کسی بھی قسم کی فلاسفی ہو، بنگال نے ہندوستان کو سنبھال رکھا ہے۔ ہم نے بنگال کو جو ہمارے حصے میں آیا تھا، اپنے ہاتھوں سے انڈیل دیا جیسے دونوں مٹھیوں سے ریت نکل جاتی ہے یا پانی نکل جاتا ہے۔ ایسا ہی مشرقی پاکستان کے ساتھ ہوا۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے ایسے ہی نکل گیا۔ اب دیپتی بینر جی میرے سامنے وہسکی لے رہی تھی۔ میرے پر ایک اور دنیا کھل رہی تھی۔

''آپ یہاں کیسے؟ آپ کے بارے میں پڑھا ہے کہ بنگالی گھروں میں رقص اور شاعری تو بچپن ہی میں سیکھ لیتے ہیں۔''

''ہاں میری بھی ایک کتھا ہے جیسے کتھا کلی میں ایک کتھا ہوتی ہے۔ ایسے ہی کتھک ڈانسر کی بھی کتھا ہے۔''

''ہاں کتھا تو سب کی ہوتی ہے۔ میری بھی ہے۔ نہیں سناؤں گا۔ یہ شام ہم دونوں کے بیچ آ گئی ہے تو اس کا سواگت کرتے ہیں۔ اپنی اپنی کتھا بھول جاتے ہیں۔''

''آپ کی کتھا کچھ تو آپ نے اپنی کو بتا سنا کے بتا دی تھی کہ آپ کیسے Exit ہوئے ہیں۔''

''ہاں کتھا کبھی بھی نہیں کہی جا سکتی۔ جسے ہم کتھا کہہ کر سنا رہے ہوتے ہیں وہ ہماری کمزوری ہوتی ہے۔ ہم کتھا کے مکمل آرٹ کا پالن نہیں کر سکتے۔ کتھا انگلیوں سے پھسل جاتی ہے ریت کی طرح۔''

''اب تو بات کو کھوجنا پڑے گا، بہت بڑی بات کر دی ہے آپ نے۔''

''میری کتھا میں کچھ انوکھا نہیں ہے۔ بس ایک بے وفائی ہے۔ مگر اب سوچتی ہوں میری ماں نے ٹھیک کیا اپنی زندگی بچا لی۔''

''اب کتھا تو سننی ہو گی۔''

''کلکتہ سے ہوں۔ میرے فادر کتھک ڈانسر تھے۔ ان کا اپنا شانتی نکیتن تھا۔ ویسا نہیں جیسا ٹیگور سر کا تھا۔ بس ان کی کاپی تھا۔ وہاں میری ماں فادر سے کتھک سیکھتی تھیں۔ وہ اور فادر کی عمر میں بہت فرق تھا۔ وہ فادر کے کہنے میں آ گئی اور ان سے شادی کر لی۔ اب جسم کی کلا کا اپنا گیان ہوتا ہے اور پتی پتنی کا

ملاپ کچھ اور بھی مانگتا ہے۔ میں جونہی پیدا ہوئی، میری ماں جو کہ اپنی کلا کو بھی چھوڑ بیٹھی تھی، جان گئی کہ میرے فادر کی محبت عورت نہیں ہے، اپنے آرٹ سے ہے۔ اُدھر ماں کی جوانی اور اسے کوئی اور پسند آ گیا جو اس کی کلا کا دیوانہ نکلا۔ بس مجھے سوتا چھوڑ کر ماں کسی گاڑی سے بیٹھی۔ گاڑی نے سیٹی لگائی اور وہ ہزاروں میل دور نکل گئی۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں گئی۔''

''تو پھر تمہیں کس نے پالا۔''

''فادر نہیں پال سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک فرانسیسی عورت کے آشرم میں داخل کرا دیا جو کلکتہ میں ایسے اناتھ بچوں کے لئے تھا۔ اب میں بڑی ہوتی گئی اور تین زبانیں سیکھ گئی۔ فرانسیسی، انگریزی اور بنگالی۔''

''تو یہ جواب تم بول رہی ہو یہ ہندی بھاشا ہے۔ یہ کیسے سیکھی۔''

''لو...... ہندی بھاشا یا اردو بھاشا تو چلتے پھرتے بندہ سیکھ لیتا ہے۔ ایسی کیا بات ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوا۔ فادر آتے تھے ہر سنڈے مل جاتے تھے اور پھر ایک دن انہوں نے اس آشرم کی فرانسیسی لیڈی سے بات کی کہ وہ مجھے کتھک ڈانس سکھانے کے لئے روزانہ دو گھنٹے کے لئے وہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔ بہت سے کاغذوں پر فادر نے دستخط کئے اور فیصلہ ہوا کہ وہ یہیں آشرم میں آ کر سکھائیں گے اور اس طرح میں فادر سے یہ کلا سیکھ گئی۔''

''یہاں کیسے پہنچیں۔''

''یہ بات اتنی مشکل نہیں ہے۔ مجھے میری فرانسیسی میڈم نے جب دیکھا کہ میں زبانیں سیکھ گئی ہوں۔ میرا کتھک ڈانس فادر کی وجہ سے بہت پرفیکٹ ہو چکا ہے تو انہوں نے مجھے پہلے فرانس اور پیرس میں پرفارم کرنے کے لئے انتظام کیا۔ اب کیا تھا، میرا کتھک ڈانس میوزک کے ساتھ قیامت ڈھا گیا۔ بڑے بڑے ہال بھر جاتے تھے، کس نے کیا کمایا مجھے معلوم نہیں۔ ایسے میں۔''

''ہاں ایسے میں کیا ہوا؟''

''ایک فرانس کا میوزیشن تھا۔ تھیٹر کے آرکسٹرا میں تھا۔ بس وہ میرے قریب آیا، بہت تیز تھا، اپنے فن کا استاد تھا، گنی گنوان تھا، بھگوان تھا۔ میں نے اسے قریب آنے دیا...... میرا گلاس خالی ہے۔۔ پلیز۔''

''اوہ سوری......ابھی لاتا ہوں۔'' میں کاؤنٹر پر گیا اور دو گلاس لے آیا۔

''ہاں تو پھر یہ ہوا کہ وہ میرے کتھک ڈانس کے اوپر اپنا آرکسٹرا بنانے لگا۔ جب میں نے یہ سنا تو میں پاگل ہوگئی۔ کبھی آپ نے آئس سکیٹنگ ڈانس دیکھا ہوگا۔ بس ویسے ہی وہ چاہتا تھا میں کتھک کروں تو وہ اس پر اپنی مرضی سے میوزک دے۔ اس کے پاس کچھ آئیڈیاز تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اور وہ ایک اوپرا بنائیں جس میں جپسی ڈانس ہو۔ جس میں ماڈرن ڈانس کے سارے سٹائل ہوں کیونکہ کتھک ڈانس ہر دوسرے ڈانس کے ساتھ خود کو Accomodate کر سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ مل کر ایک گروپ بنائے گا جس میں پورے یورپ، سکینڈے نیویا اور پھر امریکہ کے وہ شہر آجاتے ہیں جہاں کلاسیکل، کنٹری، بوتیک اور جپسی آرٹ کے چاہنے والے رہتے ہیں۔ وہاں میرا کتھک اور اس کا میوزک مل کر جادو جگا سکتا ہے اور ہم اپنے شوز کر سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ فرانس کی میڈم تو مجھے یہاں اپنے فائدے میں استعمال کر رہی ہے۔ میں اس کی ملازمت کیوں کروں۔ اس نے جتنا مجھ پر خرچہ کیا ہے اس سے زیادہ کے تو وہ فرانس کی کرنسی میں شوز کر کے لے چکی ہے۔ اس میوزیشن کا نام جو بھی تھا، سب اسے ماریو کہتے تھے۔ ماریو کے ساتھ ایک دن میں چلی گئی۔ ہم نے شادی نہیں کی مگر ہر طرح کے تعلقات ہو گئے۔ میں بولی مجھے اپنا پیٹ نہیں پھلانا۔ میری کمر اور اس کی لچک کی عمر بہت لمبی ہونی چاہئے۔ میں زندگی بھر بچہ نہیں لوں گی۔ میں کسی کے بچے سے اپنی مامتا پوری کرلوں گی۔ ایک اور بات بھی میں نے بولی کہ میں ابارشن نہیں کراؤں گی۔ اگر تم سے یہ پاپ ہو گیا تو جسم پر سہہ لوں گی مگر اس دن کے بعد تم مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ وہ مان گیا اور ہم کئی ملکوں میں گئے۔ ہم خود اپنے منیجر تھے۔ خود آرٹسٹ تھے۔ خود ہی آرگنائز رہوتے تھے۔ ماریو کے اندر کسی جپسی کی روح تھی۔ وہ Vagabond تھا مگر میں نہیں تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ میں بھی پیتی تھی مگر وہ کسی اصول کو نہیں مانتا تھا۔ وہ پوری دنیا کے دائرے سے باہر رہنا چاہتا تھا۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسا خودرو موسیقار تھا جس کی موسیقی جنگلی ہوتی ہے۔ وہ کسی ڈسپلن کو نہیں مانتی۔ وہ تجربے پر تجربے کرتا تھا مگر میری کمر کتنا بوجھ اٹھا سکتی تھی۔ آخر کو کتھک سے جپسی پر بھی آجائیں تو ہوں تو میں ایک لڑکی۔''

''یہ گلاس بھی تمام ہوا۔ میں اور لے آتا ہوں۔''

گلاس بھر گئے۔ گویا وہ ایک آخری گھونٹ سے آنے والے گھونٹ سے جڑ گئی۔

''تو پھر میں نے ماریو کو لات ماردی۔ میں کب تک جپسی بنی رہتی اور کب تک اپنے آپ سے

ناراض رہتی۔ دیکھو اپنے آپ سے انسان کو ناراض نہیں رہنا چاہئے۔ وہ اندر ہی اندر مرنے لگتا ہے۔''

''بہت اچھی بات کی ہے۔ انسان کو اپنے سے جدا بھی نہیں ہونا چاہئے۔ ہم دن میں کئی بار خود سے جدا ہو جاتے ہیں۔''

''بس تمہاری اس بات سے یہ بات یاد آئی کہ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ میں بائی سیکشوئل ہوں۔ تم ننگی ہو کر الٹی لیٹ جاؤ۔''

میں سمجھ گئی اور میں نے کہا ''تم بائی سیکشوئل ہو میں تو نہیں ہوں۔ میں تو انسان ہوں۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا، میں بھاگ کر یہاں آ گئی اور اب جو ہوں وہ آپ کے سامنے ہوں۔''

''شکر ہے میں بائی سیکشوئل نہیں ہوں۔''

''مجھے آپ سے کچھ خطرہ نہیں ہے۔''

''لیکن خطرہ محسوس نہیں کرو گی تو میں سمجھوں گا میں مرد نہیں ہوں۔ اس لئے خطرہ محسوس کرو۔''

''ہاں میں خطرے میں ہوں، ایک گلاس اور لا دو۔''

میں ایک اور گلاس لے کر آیا اور پھر اس نے مجھے بتایا:

''میں لندن آ گئی اور مجھے یہ جگہ اپنے لئے بہت اچھی لگی ہے۔ یہاں پرفارم کرنے لگی تو مجھے کئی پروگرام ملنے لگے۔ میرے کئی انٹرویو بی بی سی نے کئے اور میں اب اکیلی ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں۔''

یہ آخری گلاس ہم دونوں کو اور قریب لے آیا۔ مجھے معلوم تھا صرف ڈرنک ہی انسان کو انسان سے ملانے کا ایک فوری ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اب میں نے اس سے پوچھا وہ کیا کھانا پسند کرے گی۔ اس نے کہا چھوڑو یار ساتھ ہی تو میرا اپارٹمنٹ ہے اور میں آج اپنی پسند کا کھانا بنا کر آئی ہوں۔ چلو میرے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا بنایا ہے، بس ہم باہر نکلے تو رات میں لندن کی ہوا نے سیدھا ہم پر ایک حملہ کیا۔ ایسی ہوائیں میں ہر رات کو محسوس کر چکا تھا۔ سڑک کے فٹ پاتھ خالی تھے کہ یہ ویک اینڈ نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں شامل ہو چکے تھے اس لئے کوئی حجاب نہیں تھا۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی مرد سے محبت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف اپنے رقص سے محبت کرتی ہے اور اسی میں مطمئن ہے۔ یہ شاید کوئی پیغام تھا جو وہ دینا چاہتی تھی یا اس کا سچ تھا۔

ہم اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچے۔ دیواروں پر رقص کے زاویے بکھرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ

رقاص ہی کے مجسمے اور امیج موجود تھے۔ واقعی رقص سے اس کی محبت کا علم ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک گلاس دیا اور کچھ بچی وہسکی رکھ دی کہ جتنی دیر میں کھانا لگے گا تم فارغ نہ رہو۔ میں نے بھی غنیمت جانا اور پھر اسے بھی دعوت دی کہ کھانے کے ساتھ وہ بھی لے لے۔ اس نے بتایا کہ وہ ماس مچھی نہیں کھاتی، شاکاہاری ہے۔
میں نے حیرت سے کہا ''بنگالی اور مچھی چاول نہ کھائے۔'' اس نے بتایا کہ چاول تو وہ لیتی ہے، مچھلی اس لئے نہیں لیتی کہ ایک بار اس نے ندی سے زندہ مچھلی پکڑ لی تھی تو وہ ایسے تڑپی تھی جیسے نرتکی کا بدن اور پھر جب اسے زمین پر ڈالا تو اس نے جو کتھا کلی کی وہ میرے لئے ایک بڑا سبق تھا اسی لمحے مجھے معلوم ہوا یہ تو پچھلے جنم میں میری بہن رہی ہے۔ ایسے ناچتی ہے کہ میں بھی کیا ناچوں گی۔ بس اس دن سے مچھلی میری بہن ہے، میری دیدی ہے اور مجھے ہر بار پرفارم کرتے ہوئے لگتا ہے کہ مچھی میرے ساتھ کتھک کر رہی ہے اور مجھے اس سے شکتی ملتی ہے۔ اب بو بو میں شکتی کو کیسے کھا سکتی ہوں۔

اب میں تو حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دال سبزی لائی جو میں نے کھالی اور خوب دل سے کھائی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں کھانے کو عزت دے رہا ہوں یا نہیں۔ تو میں نے کھانے کو اللہ کی نعمت سمجھ کے لیا جیسا کہ میرا اصول ہے۔ یہاں تک کہ جب میں نے پلیٹ کو چاٹ لیا تو وہ بولی ''میرے کو کھانے کا یہ آخری پارٹ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی پلیٹ چاٹ لیتی ہوں۔ تم مجھ کو ٹھیک لگے ہو۔''

میں نے ایسے ہی کہہ دیا دپتی تم اپنا ڈانس سکول نہیں کھولتیں۔''

اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ ''تمہیں کیسے معلوم پڑا میں یہ سب چاہتی ہوں۔''

میں نے اسے آفر دی کہ میرا اخبار بکتا نہیں ہے لیکن وہ لندن، برمنگھم، مانچسٹر، بریڈفورڈ اور دوسرے چھوٹے شہروں تک بھی جاتا ہے اور اس کا زیادہ ریڈر گلاسگو میں ہے تو میں اس اخبار میں تمہاری اکیڈمی کا اشتہار دے دوں گا پھر دیکھتے ہیں۔ یہ اخبار صرف مولویوں اور گراسری سٹور کے اشتہاروں سے چھپتا ہے۔ اس میں پاکستانی ریسٹورنٹس کے اشتہار بھی ہوتے ہیں۔ یہ اخبار ہر جگہ بڑے ہوٹلوں اور سٹورز پر پڑے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی کاپی لے جاتے ہیں تو یوں سمجھو تم ایک پل میں ہر انڈین، ہر بنگالی اور ہر پاکستانی کے گھر پہنچ جاؤ گی۔ اب تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کہا ''تم اگر آشیر باد دو تو میں یہ اکیڈمی کھول سکتی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں لڑھک کر صوفے پر ڈھیر ہو جاؤں، ہمارے درمیان ہر بات طے ہو گئی اور پھر میں نے ایک اچھے سے بستر پر صبح کی۔ وہ ابھی سوئی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا میں کہاں ہوں۔ کھڑکی

کھولی باہر ٹریفک جا رہی تھی۔ زیادہ گاڑیاں پولیس کی تھیں، ہسپتال کی تھیں، تعمیراتی کاموں سے تعلق رکھنے والی تھیں۔ میں نے چائے بنائی اور پھر سوچنے لگا کہ میں ایک ایسا انسان ہوں جسے جہاں جگہ مل جاتی ہے وہاں قیام کر لیتا ہے۔ اس میں برائی بھی کوئی نہیں تھی۔ میں نے اپنا ناشتہ اس کے کچن میں تیار کر لیا کہ وہ کچن بے حد سادہ تھا۔ ہر شے سامنے رکھی تھی۔ جب میں نہا کر نکلا تو وہ چہک رہی تھی۔ نائٹ سوٹ میں وہ اچھی لگ رہی تھی لیکن نہ اس نے نہ میں نے اسے کسی بھی قسم کے محبت یا رغبت کے جذبے سے دیکھا تھا۔ ہم دو انسان تھے اور انسانوں کی طرح ملنا چاہتے تھے۔

ہیلو کہہ کر وہ چائے لے کر بیٹھ گئی۔ رات کی بات ہوئی اور پھر اس نے یاد کرایا کہ آپ نے کچھ وعدے کئے تھے۔ میں نے کہا مجھے یاد ہیں، آپ اپنی تصویر اور اشتہار کی کاپی مجھے دے دیں گی تو اشتہار چھپ جائے گا۔ تصویر کا مطلب آپ کی تصویر نہیں، کتھک ڈانس کی تصویر تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ اکیڈمی کیا سکھا رہی ہے۔

وہ بات جان چکی تھی اور اس نے مجھے اگلے دن سب کچھ دینے کا وعدہ کیا اور میں وہاں سے نکل آیا اور اب میں اپنے اخبار کے دفتر گیا جہاں اخبار کا مالک مجھ سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے تو گویا اپنی مصروفیت کو اس اخبار سے پورا کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ٹھکانہ تھا یا جب وہ کچھ کما لیتا تھا تو مٹھی میں پاؤنڈ تھما دیتا تھا جو اچھے خاصے ہوتے تھے۔ اب وہ بولا:

"او سر جی! اخبار تو بس بی بی سی سے بھی اوپر چلا گیا ہے۔ پوچھو کیوں؟"

"ہاں میں نے پوچھ لیا، کیوں؟"

"او جان کے ٹوٹے! بے نظیر نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بولو کیوں؟"

"کیوں؟"

"او یار! امریکہ نے بازی پلٹ دی ہے۔ اب امریکہ ضیاء الحق سے جان چھڑانا چاہتا ہے کیونکہ ضیاء الحق کمبل بن گیا ہے جو امریکہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"او یار تم کب سے دانشور بن گئے ہو۔ یہ تمہارے سوچنے والی بات نہیں ہے۔ کیوں دماغ پر زور دیتے ہو۔ تم رات کو بکری کا بھیجا فرائی کھاؤ اور عیش کرو۔"

"نہیں یار تم مجھے اتنا پینیڈو کیوں سمجھتے ہو، میں لندن میں پاکستانی سیاست کا سب سے بڑا پاٹے خان ہوں۔"

دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں پاکستانی سیاست کا تجزیہ نگار ہوں۔ بہر حال میں نے اس سے خبر معلوم کرنے کے لئے پوچھا ''اب بتاؤ کیا بات ہے اور ہمارے اخبار کو اس خبر سے کیا فائدہ ہوگا۔''

''او میری جان! بے نظیر کو امریکہ نے اجازت دے دی ہے کہ وہ پاکستان کے شہر لاہور میں جائے گی تو اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔''

''کیا یہ اندر کی خبر ہے۔''

''او نہیں یار، یہ بس خبر ہے، کل کا کیا ہے یہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اچھے صحافی کا کام ہے کہ وہ غلط اور ٹھیک کے درمیان اپنی جگہ بنائے۔''

اب میں تو اس کا قائل ہو گیا کہ اس نے مجھے صحافت کی الف بے سکھا دی تھی کہ بھائی واقعے پر نظر رکھو۔ واقعہ ہی اگلے واقعات کو جنم دیتا ہے۔ سو میں نے بات سمجھ لی اور ان سے کہا اب بتائیں اخبار میں کیا لگانا ہے۔ اس نے کہا ''یہ میرا تجربہ ہے کہ اس وقت پورے یورپ کا ایک ہی فیصلہ ہے کہ مارشل لاء کی حکومت جائے اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا بدلہ لیا جائے۔''

''لیکن بھٹو کی پھانسی کا بدلہ لینے کے لئے تو اگلے سو سال بھی ناکافی ہیں۔ کیسے بدلہ لیں گے۔ جب بھٹو صاحب نے خود کہا تھا کہ جب مجھے مار دیا جائے گا تو ہمالیہ کے پہاڑ روئیں گے۔ بین کریں گے۔ تو وہ تو رو رہے ہیں۔''

''ہاں وہ رو رہے ہیں مگر اب آپ کو بے نظیر کے پاکستان جانے کو اس اخبار میں ایسے پیش کرنا ہے کہ پاکستان میں قیامت آ جائے گی۔''

''پاکستان میں قیامت نہیں آئے گی۔''

''کیوں نہیں آئے گی جب بی بی لاہور ایئر پورٹ پر اترے گی۔ زخمی عوام کو ہوا کا ایک جھونکا ملے گا۔ وہ عوام جو خبروں کو ترس گئی ہے۔ جو بی بی سی ریڈیو کی آکسیجن پر سانسیں لے رہی ہے۔ سوچو اُسے جیتی جاگتی للکارتی بی بی ملے گی۔''

''میں آپ کے سیاسی شعور کا قائل ہو گیا ہوں۔''

''او باؤسن، عام آدمی کا سیاسی شعور بڑے بڑے جعلی دانشوروں سے اچھا ہوتا ہے۔ کبھی عام آدمی کو Under Estimate نہیں کرنا۔''

''اب کرنا کیا ہے؟''

''اب یہ تو آپ کا کام ہے۔ میں کوئی صحافی یا شاعر تو ہوں نہیں۔ ہاں بے نظیر کے پاکستان جانے کے لئے میں نے مارکیٹنگ کر لی ہے۔ بڑے اشتہار آ رہے ہیں۔ یوں سمجھو سارا اخبار اشتہاروں سے بھرا ہوگا اور اس کی اشاعت چونکہ لاکھوں میں ہوگی تو ہم اشتہاروں سے اپنے پیسے پورے کر لیں گے اور اخبار ہر سٹور پر اس جگہ پر جہاں پاکستانی اور انڈین آتے ہیں، رکھوا دیں گے۔ ہر کوئی فری میں اخبار لے جائے گا۔''

''ٹھیک ہے میں سرخیاں نکالوں گا۔''

''مثلاً۔''

''مشرق کی بیٹی آئی ہے۔''

''مہران پنجاب، بلوچستان اور خیبر کی بیٹی آئی ہے۔''

''واہ کیا سلوگن ہیں۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو مجھے بھٹو کی پھانسی کو بھی اس میں مکس کرنا ہے۔''

''تو کرو۔''

''بھٹو کی وارث آئی ہے۔''

''شہید کی چادر لائی ہے۔''

''او یار بس کر، میں رو پڑوں گا۔ اب یہ محاذ تم سنبھالو۔ دو دن بعد یورپ میں کہرام مچ جانا چاہئے۔''

''سب ہو جائے گا۔ مگر بی بی یہاں سے کس وفد کو ساتھ لے کر جا رہی ہے، ظاہر ہے صحافی بھی ہوں گے۔ تو کیا آپ کے اخبار کا صحافی نہیں ہوگا۔''

''اوئے جگر کے ٹوٹے، کتنا بھولا ہے تو، ہمارا تو اخبار لوکل کمیونٹی میں بھی پوری طرح نہیں آتا۔ اُدھر تو بی بی سی، سی این این، الجزیرہ، ایف جی بی، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی، پیرس نیوز ایجنسی سے لے کر چین اور جاپان کے صحافیوں کے سامنے ہیں ہم کیا بیچتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے میں کوئی ایسا چکر چلاؤں کہ بی بی کے ساتھ جانے والے وفد میں میرا بھی نام شامل ہو جائے اور پھر میں آپ کے اخبار کا پرچم تھام کر جہاز سے اتروں۔''

''پھر تو بہہ جا بہہ جا ہو جائے گی۔ اپنی تو جے جے کار ہو جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں آپ کے

جتوئی صاحب اور رضوی صاحب سے تعلقات ہیں۔ ہمارے اخبار کا جھنڈا بی بی کی فلائٹ میں شامل کرا دیں۔''

''ٹھیک ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

میں نے اخبار اگلے دو دنوں کا ترتیب کیا دینا تھا کہ سارے صفحات اشتہاروں سے بھرے جانے تھے۔ دو تین چیختی سرخیاں اور بھٹو صاحب کے ساتھ بے نظیر کی تصویریں تیار تھیں اور میرا کام ختم۔ میں ادھر سے نکلا تو سیدھا ساؤتھ ہال طیفا بٹ کے ریستوران پہنچا۔ ابھی تیاری چل رہی تھی۔ طیفا بٹ ابھی بن سنور کے نہیں پہنچا تھا کہ ایسے میں سولنگی پہنچ گیا۔

''شکر ہے سائیں آپ مل گئے۔ میں تو ایسے ہی تکے سے پہنچا ہوں۔ سوچا تھا آپ سے ملاقات نہ ہوئی تو ادھر یہ چٹھی چھوڑ جاؤں گا۔''

''آپ میرے ساتھ چلو، کوئی آپ کا ٹھکانہ نہیں ہوتا بس تکے تیر سے کام چلاتے ہیں۔''

''بات تو بتاؤ، کس لئے یہ سب جلدی ہے۔''

''او جناب بی بی صاحبہ لاہور جا رہی ہیں۔ اجازت نکل آئی ہے امریکہ بہادر سے۔''

''اب کیا بھٹو شہید کی بیٹی امریکہ کے اشاروں پر چلے گی۔''

''سائیں چلنا پڑتا ہے۔ سب اُدھر سے ہوتا ہے۔ باقی سب تماشا ہے۔ دیکھتا جا، شرماتا جا۔''

''اب میری کیا ضرورت پڑی ہے۔''

''آپ کو جتوئی صاحب نے کہا ہے ڈھونڈ کے لائیں کہ جناب لسٹیں بن رہی ہیں، کون بی بی صاحبہ کے ساتھ لاہور جائے گا۔ بس چلو میرے ساتھ یا شام کی کچاہری میں آجاؤ۔''

''میں شام کا مسافر ہوں۔ شام کی کچاہری میں آجاؤں گا۔''

سولنگی جیسے غائب ہو گیا۔ میں نے سوچا میری زندگی میں ایک اور تبدیلی آنے لگی ہے۔ میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ بیوی بیٹے سے ملوں گا۔ ان کے لئے تو اچانک ہی میرا آنا ہو گا۔ کیا کیفیت ہو گی۔ بیٹا کتنا بڑا ہوا ہو گا۔ بیوی کس طرح ملے گی۔ یہ سارے جذبات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں طیفا بٹ کے ہوٹل میں بیٹھا لاہور میں بے نظیر کے جہاز کو لینڈ ہوتا دیکھ رہا تھا کہ باہر بھٹو کی شہادت کے سوگوار اتنی تعداد میں ہوں گے کہ ایئرپورٹ سے مینارِ پاکستان تک لوگوں کا ایسا ہجوم ہو گا کہ سروں پر تھالی پھینکیں تو وہ سیدھی مینارِ پاکستان میں جا کر گرے گی۔

شام ہوتے ہی میں جتوئی صاحب کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ سولنگی نے بتایا بڑی بیٹھک ہے، نام فائنل ہونے ہیں بابا۔ آج تو کھانے کا دستر خوان بہت بڑا ہے۔ چھ کھانے تو میں نے بھوجن کئے ہیں، باقی بڑے بڑے ہوٹلوں سے تکے، چانپیں اور پتہ نہیں کیا کیا بولا ہے جتوئی صاحب نے۔ اور پھر وہ کچن میں گیا۔ میں نے ڈائیننگ ٹیبل سجی دیکھی اور پھر کچن میں بھی جھانکا۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں وقت تھا۔ بار سج گئی تھی۔ بار بوائز آ چکے تھے۔ سب کچھ ٹھن ٹھنا رہا تھا۔ میں نے ایک پیگ پیشگی لے لیا اور آرام سے سوچنے لگا۔ اب جو لوگ آئے ان میں چوری کھانے والے مجنوں بھی تھے۔ ایسے جیالے بھی تھے جنہوں نے کوئی قربانی نہیں دی تھی۔ ایسے سیاست دان بھی تھے جو مارشل لاء سے پہلے اور بھٹو کی پھانسی سے پہلے انگلینڈ میں کاروبار کے لئے آ چکے تھے اور ان کا بس اتنا کنٹری بیوشن پارٹی کے لئے تھا کہ بھٹو کی پھانسی پر دس بیس لوگوں نے لندن میں احتجاج کیا تھا اور وہ کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔

اب ایسا تھا کہ بہت سے لوگ آئے۔ میں بہت کم کو پہچانتا تھا۔ وہ سب بڑھ بڑھ کر وہسکی لے رہے تھے اور اونچی آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ زیادہ تر پنجاب سے تھے اور پارٹی کی امداد کے لئے جھنڈوں، جلسوں اور ہڑتالوں کے لئے چندے دے دیا کرتے تھے۔ اب وہ شاید بی بی صاحبہ سے اس کا معاوضہ اس شکل میں وصول کرنا چاہتے تھے کہ اپنی اپنی ٹکٹ لے کر ان کے ساتھ اسی جہاز میں پاکستان اترنے کے بعد قومی سیاست میں کہیں پاؤں پسار سکیں۔ سب دو چار پیگ لینے کے بعد کھل گئے۔ ضیاء الحق کی ماں بہن تو سب کرتے ہی تھے، آخر میں نعرہ لگاتے تھے ''جئے بھٹو'' اور پھر کھانے کے ساتھ انہوں نے جو انصاف کیا وہ تو دیدنی تھا۔ پلیٹیں کہیں، خوراک کہیں، گلاس کہاں، بوتل کہاں، روٹی کے ٹکڑے کہاں، بوٹی کہاں، یوں لگتا تھا پانی پت کی لڑائی کے بعد کا منظر ہے۔ میں خاموشی سے یہ دیکھتا رہا اور پھر میں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور سولنگی سے کہا میں اب کہیں نہیں جاؤں گا، ادھر تمہارے ساتھ سو جاؤں گا۔ سولنگی نے بتایا کہ ایک بیڈروم بالکل خالی ہے، آرام سے سو جائیں۔ صبح میں آپ کو ناشتہ کروا کے بھیجوں گا۔ البتہ جو لسٹ بنی تھی وہ جتوئی صاحب نے آخر میں یہ کہہ کر بتائی کہ بی بی صاحبہ خود آپ کو دعوت دیں گی کہ کس نے ان کے ساتھ جانا ہے البتہ رضوی صاحب خود جتوئی صاحب اور میرا نام لیا کہ شاعر بھی ساتھ جائے گا اور راستے میں اپنی نظمیں سناتا ہوا جائے گا کہ ماحول گرم رہے۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب لگی مگر میں پارٹی کا مزاج جانتا تھا اس لئے خاموش رہا۔ اب میں سوچ چکا تھا۔

بی بی کی روانگی کے چھ دن پہلے مجھے بتایا گیا کہ آپ ساتھ جا رہے ہیں اور آپ بغیر پاسپورٹ

یہاں سے جائیں گے کیونکہ برطانوی حکومت آپ کو سیاسی پناہ کا سرٹیفکیٹ دے گی اور اس پر آپ سفر کر کے واپس آ جائیں گے۔ خیر میں نے اسے اتنا سنجیدہ نہ لیا اور اخبار کا نمبر نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے بے شمار اشتہار لگائے، سب کے عنوان اور کاپی میں نے خود بنائی کہ اخبار کی ذمہ داری تو میری تھی اور میں سوچنے لگا کہ کیا مجھے ان شرائط پر جانا چاہئے اور بیوی بیٹے سے ملنا چاہئے یا میری قانونی حیثیت کیا ہو گی۔

اس سلسلے میں ایسٹ لندن میں جو میرے ساتھ جلاوطن ہو کر آئے تھے، میں ان سے مشورہ کرنے لگا۔ اس میں پشاور، کوئٹہ، لاہور کے سیاسی کارکن، شاعر اور نظریہ ساز سب شامل تھے۔ میرا اپارٹمنٹ سولنگی کے ساتھ الاٹ ہوا تھا جسے میں نے جیسمین کو دے دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو پڑھا سکے۔ شام پڑے میں وہاں اس اپارٹمنٹ میں تھا جو ٹوٹے پھوٹے انقلابیوں، کامریڈوں اور جلاوطن ترقی پسندوں کا آخری ٹھکانہ تھا۔ ایک سدا بہار اداسی وہاں پر پاؤں پسارے ہوئے تھی۔ وہاں دو جلاوطن سینگ پھنسائے ہوئے تھے۔ ایک کا مؤقف تھا کہ بےنظیر نے بھٹو صاحب کے خون کا سودا کر لیا ہے اور امریکہ کی مدد سے پاکستان کے کڑے مارشل لاء میں لاہور ایئرپورٹ پر اتر رہی ہے۔ اسے امریکہ کی آشیرباد حاصل ہے۔ دوسرے کا مؤقف تھا کہ اگر ایسا ہے بھی تو یہ معروضی حقائق ہیں اور سیاست میں لچک کا ایک مقام ہوتا ہے۔ اب دونوں بڑھ چڑھ کر بات کر رہے تھے۔ اصل میں وہ ٹائم پاس کر رہے تھے۔ میرے آنے پر وہ اس لئے بھی خاموش ہو گئے کہ میرے ہاتھ میں شام گزارنے کا راشن ایک سکاچ کی بوتل تھی۔ بس اب تو دونوں کے قہقہے آسمانوں پر تھے۔ فوراً گلاس اور پانی کے ساتھ برف حاضر کی گئی اور اس سے پہلے کہ اور حصہ دار آتے، میزبان اور ہم دو ٹوٹے انقلابی جت گئے۔ جب طبیعت رواں ہوئی تو وہاں چھ سات جلاوطن اور کامریڈ اپنی اپنی بساط کے مطابق سستی مہنگی جو بھی ہاتھ لگی لے کر آ گئے کہ یہ یہاں کا معمول بھی تھا اور آج تو بی بی کے لاہور جانے پر تبصر۔ ے ۔ رنے تھے۔ شہید بھٹو کی بیٹی کو مینارِ پاکستان پر جلسہ کرنے کے لئے لاہور پہنچنا تھا اس لئے سب بے حد پرجوش تھے۔ اس جوش میں شراب نے آگ لگا دی۔ یہ سب انقلابیوں کی مجبوری تھی کہ وہ شام کو اگر نہ پئیں تو مر جائیں۔ اب سب نے طرح طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ اس میں انقلابیوں نے بےنظیر کے خلاف چوتھے پیگ میں چڑھائی کر دی کہ بےنظیر امریکی کندھوں پر جا رہی ہے۔ وہ ہم جیسے انقلابی ورکرز کے بغیر کیسے جا سکتی ہے۔ ایسے میں کچھ سینئر شاعر جو میرے ساتھ جلاوطن ہوئے تھے بولے کہ بھائی ہم تو وطن کھو چکے ہیں۔ اب ہم کیوں جائیں گے بی بی کے ساتھ۔

ایسے میں بہت گنڈ ڈالا گیا کہ سب بے چارے حالات کے مارے ہوئے اور وہ جو برطانوی حکومت کی غفلت کا شکار تھے، بول پڑے کہ ہم کہاں رہ رہے ہیں۔ سردیوں میں ہم ٹھٹھرتے ہیں، گرمیوں میں ہم سڑتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے شاعر ہیں، دانشور ہیں، کیا یہ سب بے نظیر کو کوئی بتائے گا۔

''بے نظیر جاگیرداروں میں گھر چکی ہیں۔ بھول جاؤ اسے پاکستان کی پہلی خاتون پرائم منسٹر بننا ہے اس لئے کوئی بھی سمجھوتہ ہوگا وہ کریں گی۔''

''نہیں یار آپ بی بی کو جانتے نہیں ہو، جس نے باپ کی لاش نہ دیکھی ہو، وہ کتنی بڑی بیٹی ہے۔''

''فوج کے ساتھ سمجھوتہ کئے بغیر جمہوریت بحال نہیں ہوسکتی۔ فوج کا مستقل کردار تسلیم کرنا پڑے گا۔''

اب جو میں نے دیکھا سب کی بوتلیں اور گلاس خالی تھے اور وہ ایک دوسرے کی تلاشی لینے کے درپے تھے۔ سب نے میزبان کے گھر کی مکمل تلاشی لے لی کہ کہیں کوئی قطرہ کسی بوتل میں، کسی الماری کے کونے میں چھپا ہوا مل جائے۔ کہیں سے بوند برآمد نہ ہوئی۔ بزرگوں نے دہائی دی کہ نیچے سے پکڑ لاؤ، کچھ کرو۔ کسی نے بتایا اب تو دکانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ ایک نے کہا خفیہ طریقے سے یہاں ایک مائی ہے اس کے دروازے پر دستک دیں تو وہ ڈبل قیمت پہ بوتل دے دیتی ہے۔ اس پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ وہ بزرگ اب آپے سے باہر ہو گئے۔ ''اگر شراب نہیں ہوتی تو بلاتے کیوں ہیں۔ جو جلدی آ جاتے ہیں وہ ساری پی جاتے ہیں۔ بھئی کچھ تو One For the Road کے لئے رکھ لیتے ہیں۔ اب مجھے نیند کیسے آئے گی۔ بھئی کچھ کرو۔ اس پر میزبان نے کہا آپ میرے ساتھ چلیں۔ ادھر ایک پب رات تک کھلا رہتا ہے۔ مہنگا تو ہوگا مگر کوئی بات نہیں، آپ جو چاہیں گے لے لیں، میں ساتھ ہوں۔ اس بات پر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

میں نے بہت پی لی تھی اور مجھے کچھ یقین تھا کہ اگر میں اپنے سرکاری فلیٹ میں جاؤں گا تو جیسمین کچھ نہ کچھ بچا کے رکھتی ہے۔ ضرورت ہوگی تو وہ کہیں سے ایک دو پیگ نکال کے لے آئے گی۔ اب میں رات اپنے جلاوطنی کے نتیجے میں لندن ایسٹ کے علاقے میں سولنگی کے ساتھ جو فلیٹ مجھے الاٹ ہوا تھا، وہاں جا رہا تھا۔ میرے اندر ایک کشمکش چل رہی تھی کہ جب میں اپنی چابی سے اپارٹمنٹ کھولوں گا تو سامنے جیسمین کس حالت میں ہوگی۔ میرے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا کہ میں اپنے آنے کی اطلاع

جیسمین کو پہنچا دیتا۔ اپارٹمنٹ میں کوئی لینڈ لائن نہیں تھی۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ جب تم اس طرح اپنے اپارٹمنٹ میں جا کر سو جاؤ گے تو یہ جیسمین کے لئے کوئی کمزور لمحہ نہیں ہو گا کہ اس وقت اسے لندن کی کسی سڑک پر کھمبے کے ساتھ ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ شراب پینے کے بعد مجھے اپنے اس اپارٹمنٹ میں کھانا یا کھانے کے نام پر کچھ تو مل ہی جائے گا اور نہیں تو ڈبل روٹی انڈا تو مل ہی جائے گا۔ اور میں اس پر مطمئن تھا۔ اب ایسا ہوا کہ میرے اپارٹمنٹ کی چابیاں تو میرے پاس ہوتی تھیں، جیسمین اور اس کا بیٹا اندر ہوتے تھے، میں باہر سے چابی لگا کے داخل ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ڈر جاتے تھے لیکن انہیں میری آہٹ کا احساس رہتا تھا۔ آج بھی میں نے وہاں پہنچ کر دروازے کو چابی سے کھولا۔ عام طور پر جیسمین کے تیار ہو کر اپنے کام پر جانے کا وقت ہوتا تھا۔ میں اس کے اس دھندے کو کام یا جاب سمجھتا تھا۔ جونہی میں اندر داخل ہوا، سامنے کا کمرہ جو بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس کے ساتھ کچن تھا اور ایک طرف بیڈ روم تھا۔ میں داخل ہوا تو جیسمین کا بیٹا بیڈ روم کے دروازے سے لگ کر اندر جھانک رہا تھا۔ مجھے جیسمین دکھائی نہیں دی۔ جونہی میں آگے بڑھا، وہ بچہ ڈر گیا اور اپنے ہوم ورک کی ٹیبل پر آ گیا۔ لگتا تھا وہ ہوم ورک کرتے کرتے ادھر کو آ گیا تھا۔ اندر بیڈ روم میں جیسمین کے ساتھ کوئی تھا۔ مجھے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندر روشنی مدھم تھی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ کوئی جیسمین کے ساتھ ہے۔ میں نے مخل ہونا ضروری نہ سمجھا اور نہ ہی میں نے چاہا کہ اندر جو ہو رہا ہے وہ دیکھوں۔ میں بچے کے ساتھ بیٹھ گیا مگر اس کی آنکھوں میں چھپی نفرت مجھ سے چھپ نہ سکی۔ وجہ میں جانتا تھا۔ یہ عجیب وغریب رشتہ تھا میرا اس کی ماں کے ساتھ۔ چند لمحوں بعد کمرے سے جیسمین اور سولنگی باہر آئے۔ میں حیرت میں ڈوب گیا کہ سولنگی کا یہاں کیا کام اور وہ کب سے یہاں آ رہا ہے اور کیسے اس نے جیسمین کو دیکھا اور پھر گاہک بن گیا۔ بات تو میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ اس اپارٹمنٹ کی چابیاں اس کے پاس بھی تھیں اور ہم دونوں کے نام یہ تھا اس لئے کسی بھی وقت وہ یہاں آ بھی سکتا تھا اور چونکہ بالکل اکیلا تھا تو اس کے لئے تو گویا یہ آسان ترین حل تھا اپنی جسمانی تنہائی کو دور کرنے کے لئے۔ اب جو وہ باہر آیا تو مجھے دیکھ کر شرمندہ ہوا کہ میں نے گویا چوری پکڑ لی تھی۔ اب وہ اپنی زبان میں بولنے لگا ''سائیں اِدھر ہمارے کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ چھوکری موکری کیسے ملے گی، یہ ہم کو ادھر بیٹھی مل گئی جو اس نے کسی سے لینا ہوتا ہے وہ ہم اس کو دے کے آ جاتا ہوں۔ جب ہمارے کو ذرا بھی اندر گھٹن ہوتی ہے۔ اس کی صاف گوئی بھی مجھے قائل نہ کر سکی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میری بیوی سے ناجائز تعلقات استوار کئے ہیں۔ طوائف یا کال گرل بھی کبھی کبھی آپ کو بیوی لگنے لگتی ہے اور جیسمین کے معاملے میں تو میں کچھ کچھ

اس کا خیال رکھنے والا بن چکا تھا۔

سولنگی خاموشی سے نکل گیا۔ میں نے کچن میں جو کچھ ملا کھالیا اور جا کے ایک طرف سو گیا۔ مجھے محسوس ہوا اس رات جیسمین بھی کام پر نہیں گئی۔ شاید سولنگی کی شکل میں اسے جو ملنا تھا، مل گیا تھا۔

اب ایک شام مجھے بلایا گیا کہ بی بی کا قافلہ روانہ ہونے والا ہے۔ بی بی سی کی خبروں میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اُدھر میرے اخبار نے بھی موقع غنیمت جان کر خوب خوب اشتہار کمائے۔ شام کو جب بڑی بیٹھک جتوئی کے اپارٹمنٹ میں لگی تو فلائٹ کی ٹکٹوں اور دیگر ضروری ہدایات کے لئے سب جمع ہوئے۔ مجھے بتایا گیا کہ میں اپنی خدمات کے باعث ساتھ جاؤں گا۔ یہاں آ کر علم ہوا کہ ایک بڑے بزنس مین نے ڈھیر سارا پارٹی چندہ دے کر جہاز میں میری سیٹ چرالی ہے۔ میرے لئے یہ بہت بڑا صدمہ نہیں تھا۔ میں اندر سے نہ خوش تھا نہ ناراض۔ اس لئے کہ اس طرح بی بی کے جہاز کی سواری بن کے جانے میں کوئی تجسس اور جوش نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جہاز سے تو صرف ایک ہستی نے اترنا تھا اور پاکستانی عوام تو صرف اس کو لینے آئے ہوں گے۔ میں جہاز میں گھسا ہوا ایک چوہا ہوں گا جو اِدھر اُدھر پھدک رہا ہو گا اور پھر میرے لئے اپنی بیوی اور بیٹے سے ملنے کے کیا مواقع ہوں گے۔ جس کے پاس پاسپورٹ ہی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جہاز کی کوئی سواری اس جہاز میں نہیں تھی جس میں طیارہ اغواء کرنے والوں نے ایک فہرست کے ذریعے راتوں رات جیلوں سے نکلوا کر اس جہاز کے ذریعے سب کو جلاوطن بنایا تھا۔

اب میں اخبار کے دفتر آیا اور اپنے ہاتھ سے یہ خبر لگوائی کہ بی بی کے ساتھ کوئی جلاوطن شاعر نہیں گیا۔

اب پاکستان میں تبدیلی آنے والی تھی۔ کیسے آنی تھی، کیسے حکومت تبدیل ہونی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا مگر آسمان پر اس کی تیاری جاری تھی۔

... .

بے نظیر بھٹو کا سنا کہ بے مثال استقبال لاہور میں ہوا۔ بی بی سی نے خوب پیٹ بھر کے خبریں سنائیں مگر اب بی بی سی کی خبروں کا جادودم توڑ چکا تھا کہ خبریں اب لوگوں کی دہلیز پر اُتر چکی تھیں۔ میں بی بی کی فلائٹ سے لاہور نہ اتر سکا۔اب میرے مقامی اخبار کے لئے اگلے کچھ عرصے کے لئے راوی چین لکھ رہا تھا۔اس لئے میں نے لندن میں خود کو دیپتی کے کلب کے حوالے کر دیا۔اب ہر شام وہاں گزر رہی تھی۔ دیپتی کتھک سکھانے کے لئے بے تاب تھی۔ میں نے اور اس نے مل کے ایک کالج میں ایک گھنٹے کے لئے ایک بہت کھلا ہال کرائے پر لے لیا جس کا فرش لکڑی کا تھا جو کتھک کے لئے ضروری ہوتا ہے۔میرے اخبار میں مسلسل اشتہار شائع ہونے کی وجہ سے بہت اچھا ریسپشن ملا اور پاکستانی، بنگالی اور انڈین گھرانوں کی پندرہ لڑکیوں کو میرٹ پر چن لیا گیا۔اس نے کلاس شروع کر دی۔ میں عام طور پر کلاس کے آخر میں جاتا اور دیپتی کو سکھاتے دیکھتا اور پھر ہم وہاں سے نکل جاتے۔کبھی کسی پب میں کبھی کسی ریستوران میں۔کئی دفعہ طیفا بٹ کے کھانے کو دل مچل جاتا تو ہم وہاں چلے جاتے۔سب حیران تھے کہ میں نے ایک بنگالی انڈین لڑکی سے دوستی کر رکھی ہے۔پاکستانیوں کے لئے عام طور پر اس بات کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا۔زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ بنگالی آوارہ ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ...... اچھا ہوا بنگالیوں سے جان چھوٹی۔یہ تو کوئی مجھ سے پوچھے کہ ہم نے بنگال کھو کر اپنا کتنا نقصان کیا۔

ہم دونوں اکثر گھومتے پھرتے تھیٹر دیکھنے کے بعد یونہی آوارہ بھی پھرتے رہتے اور شاعری، مصوری، رقص، فلم اور آرٹ پر باتیں کرتے رہتے۔ مجھے دیپتی سے سیکھنے کا بہت موقع ملنے لگا اس لئے میں اس سے چپک گیا۔ وہ مجھ سے بنگال کا رس نچوڑنے لگی تھی اور میں بنگال کے اسرار اور جادو میں رہنے لگا تھا۔ مجھے پاکستان میں اپنی بیوی اور بیٹا دور ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔مگر میں کیا کر سکتا تھا۔انسان بے حد خود غرض مخلوق ہے۔اسے جہاں جو سہارا مل جائے وہ لپک کر لے لیتا ہے۔دوسروں کی آگ سے ہاتھ

تاپ لیتا ہے اور دوسروں کے کمبل سے گرمی نکال لیتا ہے۔ مجھے اس جادو میں بہتے ہوئے پتہ ہی نہ چلا کہ ہم کب ایک دوسرے کے لئے ضرورت بن گئے۔

یونہی ایک رات ہم چلتے چلتے دور نکل گئے۔ رات میں کہرا گھل مل گیا تھا۔ سرما کی رات تھی۔ اچانک دیکھا تو ہم دونوں کہرے کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ دور دور تک کوئی گاڑی اور کوئی راہ گیر ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک میں نے دیپتی کو خود سے لپٹا لیا اور ہم کہرے میں سانس لینے لگے۔ ہم خود بھی دھند کا حصہ ہو گئے اور ایسے میں چلتے چلتے دیپتی کے اپارٹمنٹ میں آ گئے۔ اس نے میرے اور اپنے لئے ایک ڈرنک بنائی اور روی شنکر کا ستار کا کیسٹ لگا دیا۔ اب مجھے تو لگا میں کسی اور دنیا میں جا بسا ہوں اور ایسا ہی تھا۔ وہ بنگال کو اپنے اندر چھپائے رکھتی تھی۔ جب چاہتی تھی اس کی خوشبو اور شادابی کے جھونکے ہمارے اوپر پھوار کی طرح برسا دیتی تھی۔ وہ جنگلوں، جھیلوں، ندیوں اور چائے کے باغوں کی تراوت اور تازگی پھیلا دیتی تھی۔ وہ کس کی تلاش میں تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ لندن اور برطانیہ میں بے شمار ہندوستانی، بنگلہ دیشی بکھرے ہوئے تھے۔ اسے مجھ میں کیا دکھائی دیا۔ نہ کلچر، نہ زبان، نہ زمین، نہ ذات، نہ پات، بس ایک رشتہ تھا آرٹ کا، اظہار کا۔ شاید دنیا میں سب سے مضبوط رشتہ یہی ہوتا ہے۔ اب روی شنکر سے استاد اللہ رکھا، ہری پرشاد چورسیا، استاد عامر خان، استاد امجد خان اور بھی بہت کچھ جن میں بنگال کا فوک، بنگال کا کلاسیکل، اس وقت لگا کئی زمانے، کئی جنگل، کئی دریا، کئی ندیاں، کئی جھرنے، کئی ہوائیں، کئی موسم میرے اندر جھوم رہے تھے اور معلوم نہیں کب ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔ صبح ہم نے ایک دوسرے کی گرمائش کے سہارے آنکھ کھولی۔

میں کچھ دنوں کے لئے بھول ہی گیا کہ لندن میں کچھ اور بھی میرے ٹھکانے ہیں۔ جیسمین کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ سولنگی اب مجھ سے آنکھ نہیں ملانا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی مجھے تلاش کرنے نہیں آیا۔ طیفا بٹ خوش تھا کہ بے نظیر کا لاہور میں بہت بڑا استقبال ہوا ہے۔ میں اپنے ان جلاوطن ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میری طرح سے ادھر ادھر کسی بھی سرگرمی میں شریک نہیں تھے۔ نہ ہی انہیں خبر تھی کہ لندن میں ثقافتی اور سیاسی سطح پر کیا کچھ ہوتا ہے۔ میں نے اخبار کے دفتر میں اپنی ڈاک دیکھی تو پاکستان سے کوئی خط نہیں آیا تھا۔ فون کی سہولت تو تھی نہیں کسی اور ذریعے سے فون کر کے حالات کیا معلوم کرتا کہ خبر ہو تو اڑ کر پہنچتی ہے۔ خبر نہ ہو تو مطلب ہے خبر نہیں ہے۔ جو تھا ویسے ہی ہے۔ البتہ جیل میں کسی کے لئے مجھے ترجمے کا کام مل گیا تھا جس کے لئے میں وہاں گیا تو ایک پندرہ یا شاید چودہ سال کا لڑکا تھا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے وکیل نے اسے سمجھایا کہ میں اس کی بات عدالت میں بیان کروں گا کیونکہ وہ اردو میں بات کرتا تھا یا پنجابی میں۔ وکیل نے بتایا اس کی ماں پاکستان سے شادی کے بعد آئی تھی۔ باپ میرپور آزاد کشمیر سے تھا۔ وہ اس کی ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ پھر اس کی ماں نے ہی اسے یہاں بڑا کیا۔ آگے کی بات یہ خود بتائے گا جو اس نے عدالت کو بیان دینا ہے۔ اب میں نے پنجابی بلکہ کسی حد تک پوٹھوہاری یا میرپوری لہجے میں اس سے بات کی۔ اس پر وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا میں نے ماں کو قتل کیا ہے۔ عدالت کو کیا بتانا ہے۔ وہ اپنے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے مار دیا۔ کچن کی لمبی چھری سے سیدھا اس کے سینے پہ چھری مار دی۔ خون کا دھار سیدھا میرے منہ پر پڑا۔ ماں کا خون بہت گرم تھا کیونکہ وہ کسی دیسی کے ساتھ کمرے میں تھی۔ جونہی وہ دیسی آدمی باہر نکلا، ماں شلوار کے بغیر پڑی تھی۔ بس اسی میں اس پر میں نے چھری سے وار کر دیا۔ وہ مجھے اپنی زبان میں بتا رہا تھا جو میں اپنے طریقے سے لکھ رہا ہوں۔ اب میں نے پوچھا کہ آخر تم نے اس ماں کو کیوں مارا جو تیرے باپ کے چھوڑنے کے بعد تمہیں ہر طرح سے سب کچھ دے رہی تھی۔ اس نے بتایا میرے میں غیرت آ گئی تھی۔ میں حیران ہوا کہ غیرت کا لفظ ایک بریڈفورڈ کے لڑکے کے دماغ میں کیسے آیا۔ وہ تو پیدا ہی یہاں ہوا ہے اور پلا بڑھا بھی یہاں ہے۔ اس کے اندر غیرت کا لفظ کیسے آیا اور اس نے کیوں ماں کو قتل کیا۔ اب مجھے تجسس ہوا اور جب میں نے کریدا تو اس نے بتایا کہ جب باپ اسے چھوڑ کر گیا تو ماں نے مجھے پالنے کے لئے کام پر جانا شروع کیا۔ وہ کہاں جاتی تھی، مجھے نہیں پتہ تھا۔ ایک دن سکول سے آیا تو کوئی بیڈروم میں میری ماں کے اوپر تھا۔ میں سمجھا نہیں۔ پھر میں نے دیکھا جب میں سکول ہوتا تھا وہ مردوں کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ ایک دن سکول میں کسی پاکستانی لڑکے نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ تمہاری ماں میرے باپ کے ساتھ سیکس کرتی ہے۔ اس پر سب نے میرا مذاق اڑایا۔ اب میں سکول میں سب سے الگ رہنے لگا تھا۔ سکول سے آنے کے بعد میری ماں نے ایک لوکل ٹی وی پر مولوی کا پروگرام میرے لئے لگوا رکھا تھا کہ مجھے اپنے مذہب کا علم ہوتا رہے۔ اسی میں ایک دن اس مولوی نے بتایا کہ جو عورت اور مرد نکاح کے بغیر سیکس کرتے ہیں دونوں کو سنگسار کر کے مار دینا چاہئے۔ وہ مولوی روزانہ اسی طرح کی باتیں کرتا تھا۔ یہ باتیں میرے دماغ میں بیٹھتی گئیں اور ایک دن اس مولوی نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو اس طرح کی بدی کو مٹاتا ہے اسے جنت ملتی ہے۔ اس طرح میں نے فیصلہ کر لیا اور ایک دن میں نے موقع دیکھ کر ماں کو مار دیا۔

بات صاف ہو گئی تھی کہ اس کی ماں نے اسے گھر میں جو مقامی چینل یا کیبل ٹی وی لگوا دیا تھا اس

نے ہی اس کی جان لے لی۔ کورٹ میں میں نے اس کے بیان کو من وعن بتا دیا جس سے مجھے امید تھی کہ اس کی سزا بہت کم ہو جائے گی۔ آخر یہی ہوا، اسے اصلاح کے لئے اس جیل میں رکھا گیا جہاں وہ تعلیم بھی جاری رکھ سکتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی تربیت اور سپورٹس بھی اسے حاصل ہو گئی تھی۔

اب لندن میں میری واحد دلچسپی دیپتی رہ گئی تھی۔ سولنگی اور جتوئی صاحب کا سلسلہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ واپس پاکستان جانے کا خواب مدھم پڑتا جاتا تھا۔ میں پہلے بھی لاہور کے لئے اجنبی اجنبی تھا اور اب تو سب مجھے اپنے سے دور ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے اس حقیقت کو جانا کہ قربت ہی وہ واحد احساس ہے جو انسان کو انسان سے جوڑے رکھتا ہے۔ رشتہ قائم ہی قربت سے رہتا ہے ورنہ اس کو کسی دیو مالائی طاقت سے جوڑ کے رکھنے میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ دیپتی کے ساتھ اب میں رہنے لگا تھا۔ میں اس کے اپارٹمنٹ میں دن بھر کی ضرورت کا سامان اکثر خود لے کر جاتا تھا۔ وہ منع کرتی ضرور تھی مگر اندر سے خوش تھی کہ کوئی اس کا خیال رکھتا ہے۔ عورت جتنی مرضی بہادر ہو، خود مختار ہو، طاقتور ہو پھر بھی اندر سے وہ چاہتی ہے کہ کوئی مرد ایسا ہو جو اس کا خیال رکھے اور اسے خبر نہ ہونے دے کہ وہ اس کا کس حد تک خیال رکھ سکتا ہے۔ مجھے اس کی خبر تھی اس لئے میں بغیر جتلائے خاموشی سے اس کی ضرورتوں کو ایسے سنبھال رہا تھا جیسے وہ میری محبوبہ یا بیوی ہو۔ اسے اس کی خبر تھی۔ اچانک ایک شام جب اس کی پرفارمنس باقاعدہ ٹکٹ کے ساتھ ہوئی تو میں نے دیکھا بہت سے گورے بھی تھے اور پاکستان کی وہ کلاس جو آرٹ اور تھیٹر سے دلچسپی رکھتی ہے وہ بڑی تعداد میں تھی۔ یہ وہ کلاس تھی جو زیادہ تر کراچی سے برطانیہ آئی تھی۔ ان میں ڈاکٹرز، سکالرز اور پڑھے لکھے شعبوں سے تعلق رکھنے والے خاندانی پس منظر کے حامل لوگ تھے۔ ظاہر ہے یہاں ہر ذوق کے حامل لوگوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پرفارمنس اتنی موثر تھی کہ سٹیج کی روشنی ستار کے ساتھ طبلے کی تھاپ پر تبدیل ہو جاتی تھی۔ دیپتی کے ردھم کے ساتھ بھی روشنی کا کھیل جاری رہتا تھا۔ کسی نے اسے بہت تخلیقی سطح پر ترتیب دیا تھا۔ میرے لئے یہ اتنا بڑا تجربہ تھا کہ میں نے پہلی بار خود پر رشک کیا کہ میرا رشتہ دیپتی سے ہے۔ پرفارمنس کے بعد سب نے کھڑے ہو کر تالیوں سے دیپتی کو داد دی۔ یہ اس کی پہلی پروفیشنل پرفارمنس تھی۔ لوگ دیر تک بات کرتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی نائٹ لائف شروع ہونے کی وجہ سے سب نے ہال کو خالی کر دیا۔ اکیلا میں بیٹھا تھا۔ اب دیپتی آئی اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ہم دونوں اب خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے لگ کر جا رہے تھے۔ میں اب اس کی کیا تعریف کر سکتا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ تمہیں نیا سفر مبارک ہو۔ یہ تمہیں دنیا میں بہت آگے لے جائے گا۔ میں ہوں گا

کہ نہیں مگر تم ایک تہوار کی طرح منائی جاتی رہو گی۔اس پر اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔شاعری میرا ایسا ہنر تھا جس سے میں جب چاہتا تھا دپیتی کو اپنا بنا لیتا تھا۔ چلتے چلتے راستے میں مارک اینڈ سپینسر کا گراسری سٹور آیا۔میں نے اسے کہا مجھے کچھ لینا ہے اور ہم اندر گئے۔زیادہ لوگ نہیں تھے۔میں سیدھا پھولوں کے سیکشن میں گیا اور ایک بے حد خوبصورت گلدستہ اٹھا لیا اور اسے جھک کر پیش کر دیا۔وہ بہت خوش ہوئی اور ہم اس کے اپارٹمنٹ میں آ گئے۔میں نے ایک شیمپین اسی موقع کے لئے لا کر رکھ دی تھی۔اب موقع تھا کہ دپیتی کی پرفارمنس کو تہوار کی طرح منایا جائے۔اس نے کہا رک جاؤ۔وہ باتھ روم میں گئی اور اس نے شاور لیا کہ پرفارمنس کے بعد یہ ضروری ہوتا ہے۔پھر وہ اپنی مرضی کا لباس لے کر آ گئی جو بے حد خوبصورت تھا۔ ہم نے شیمپین کھولی اور اس کی اس پرفارمنس کو تہوار کی طرح منایا۔پھر میں کچن میں گیا اور وہ بھی آ گئی۔ہم نے رات کا کھانا بنایا۔جس میں سلاد کے ساتھ مچھلی، کباب اور بنی بنائی روٹی تھی۔جو لطف یہ کھانا بنانے میں آیا وہ الگ سے ایک تجربہ ہے۔ساتھ میں ہم ڈرنک بھی لیتے گئے۔اصل خوشی تو کچن میں ایک ساتھ کھڑے ہونے کی تھی۔ایسا کسی فائیو سٹار ہوٹل کے ڈنر میں بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ہم دونوں ایک تو ہو چکے تھے لیکن ابھی تک ہم بس دوست تھے۔وہ تھکی ہوئی تھی، جلدی سو گئی۔میں نے اسے کہا ابھی میں بیٹھوں گا۔ میں نے کاغذ قلم لیا اور دپیتی کے لئے ایک نظم لکھنے لگا۔نظم کب مکمل ہوئی اور کب میں سو گیا معلوم نہیں۔صبح اس کی میز پر نظم رکھی تھی۔میں جا چکا تھا۔نظم اس نے پڑھی۔

دپیتی کے لئے ایک نظم

چار دِشاؤں کی ہوائیں جب آپس میں ملتی ہیں
تو تمہاری کمر کا ایک لوچ ان ہواؤں کے گرداب میں آ جاتا ہے
اور پھر تم افلاک کی پراسرار خاموشی کو اپنے رقص میں لے لیتی ہو
اس لمحے کائنات ایک پل کے لئے تھم جاتی ہے
اور تم جب رقص میں پھریری لیتی ہو تو سات سمندروں میں خروش پیدا ہوتا ہے
ہمالیہ کے سلسلے پر ہوا برف کو چومتی ہے
برف ہنستی ہے
جب تم قدم سے قدم کو تھرکنے کے لئے ایک جیون دان کر دیتی ہو
تو آسمانوں پر پرندوں کے سلسلے ہلکورے لیتے ہیں

تمہاری ایک تھرک میں کئی زمانے تھرکتے ہیں
ایک حرکت سوئے ہوئے کئی جنگل جگادیتی ہے
ہر زاویہ ہر ادا ہر حرکت پر چلت پھرت
اپنے بھید بھاؤ میں
صدیوں کے جنم ساگر پر دستک ہوتی ہے

یہ نظم لکھ کر میں چلا گیا۔ میرے اندر بھی ساگر جنم لینے لگے تھے۔ میں کہ جلاوطن تھا اب مجھے اپنا گھر کہیں دکھائی دینے لگا تھا۔ میں جب گھر سے نکلا تھا تو بدحواس تھا۔ بھول گیا تھا کہ میری ایک بیوی اور ایک بیٹا لاہور میں تھا۔ بیوی اب میرا انتظار کررہی ہوگی۔ بیٹے کو معلوم ہی نہیں کہ باپ کیا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم رشتوں کو آب وہوا کہاں سے ملتی ہے۔ ابھی تو میں نے اڑنا ہی سیکھا تھا کہ دام میں آگیا۔ میں تو بیوی اور بیٹے کی صورتیں بھی بھولنے لگا تھا۔ مدھم مدھم سا کوئی خیال تھا۔ اب خط بھی وقفے وقفے سے آنے لگے تھے۔ ایسے میں یادیں بھی دھندلانے لگی تھیں۔ یادیں بھی ایک متھ کی طرح ہوتی ہیں۔ جو ہوتی تو ہیں مگر ان کا وجود نہیں ہوتا۔ یادیں بس واہمہ سا ہوتا ہے۔ جس کے سہارے ہم فرار حاصل کرسکتے ہیں۔ ہر انسان کو فرار چاہئے ہوتا ہے۔

چند دن اِدھر اُدھر کی خبر لینے کے بعد میں اخبار کے دفتر آیا تو مجھے دیپتی کا نوٹ ملا کہ تم کہاں ہو۔ اگر وقت ہو تو میری کتھک کی کلاس میں آجاؤ، پھر شام ایک ساتھ گزاریں گے۔ میں سوچ ہی رہا تھا اور کچھ خوفزدہ بھی تھا کہ میری نظم اسے اچھی لگی ہوگی یا نہیں۔ میں شام سے پہلے کا انتظار کرنے لگا اور وقت پر پہنچا تو گلے سے آکر لگ گئی۔ اس کی سٹوڈنٹس اپنا کاسٹیوم تبدیل کررہی تھیں اور پھر وہ آگئیں۔ دیپتی نے سکھانا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دو تین لڑکیوں اور دو لڑکوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ لڑکے بھی کتھک سیکھنا چاہتے ہیں۔ میں بیٹھ کر دیکھتا رہا۔ یہ سارا عمل ایک گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا تھا اور طبلے اور ستار کی کیسٹ چلا کرتی تھی۔ لندن میں طبلے اور ستار بجانے والے اتنی آسانی سے نہیں مل سکتے تھے۔ دیپتی بڑی مہارت سے ہر ایک کو اس کے بدن کے لوچ کے حساب سے الگ الگ سمجھاتی تھی۔ کبھی کبھی خود ہاتھوں سے ان کے جسموں کو زاویے پر لاتی تھی اور کہتی تھی اسی زاویے پر رکے رہیں تاکہ جسم اس زاویے کا عادی ہوجائے۔

میں بہت باریکی سے دیپتی کے کتھک آرٹ کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ دیپتی نے ایک

شاعر سے کیوں دوستی کی یا دوستی کے مراحل میں ہے۔ موسیقار، گلوکار، راگ راگنی اور خیال کے گیانوں کو چھوڑ کر دیپتی کس سے خوشی کی امید رکھتی ہے۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا اس کے سٹوڈنٹس اپنے اپنے بیگ اٹھائے یا لٹکائے شام کی دہلیز سے باہر چلے گئے اور میرے سامنے کھڑی تھی اور اسے اچھا لگا کہ میں اس کی کلاس میں آ کر بیٹھا ہوں۔ کہنے لگی:

''کیا سوچا ہے؟''

میں چونکا کیا مطلب؟ مجھے کیا سوچنا تھا؟

''مطلب شام سامنے کھڑی ہے، معصوم سی گڑیا کی طرح، اسے گود لینا ہے یا یہیں چھوڑ جانا ہے۔''

اب میں سمجھا ''شام کو کیا گود لینا، اب تو یہ ہمیں گود لے گی۔''

اس پر وہ خوش ہوئی۔ شاید میری ایسی باتوں سے وہ خوش ہو جاتی تھی۔ ہم چلتے چلتے ایک بڑے سٹور کے آگے رک گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔ اشاروں میں طے پا گیا کیا لینا ہے کیا نہیں لینا۔ میں نے باسکٹ پکڑی اور دونوں نے پہلے وائین وہسکی ڈالی پھر ڈبل روٹیاں کئی قسم کی، انڈے، مچھلی فروزن، کچھ سلاد سبزی اور کچھ اس نے اپنے لئے چیز اور چاکلیٹ لے لی۔

اس کے اپارٹمنٹ تک ہم بہت مگن اور مطمئن جا رہے تھے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارا رشتہ کیا بننے والا ہے لیکن اس کی کسے پرواہ تھی۔ جو بھی ہے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دوستی کو شادی یا انسانی نفسانی سیکس سے جوڑنا دنیا کی سب سے گھٹیا بات مجھے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ایسے کہ پانچ سے دس منٹ کے اس ایکٹ میں محبت کی جگہ کچھ اور بات ہوتی ہے جو جسمانی ہارمون اور لبیڈو کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اس کا دماغ اور احساس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ بات میں نے کہیں پڑھ لی تھی اور اس پر ایمان لے آیا تھا۔ اس وقت سے مجھے سیکس کوئی قابل نفرت اور شرمندگی میں لپٹی ہوئی ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ سوچ کر میں دیپتی کے ساتھ دوستی میں آزاد ہو گیا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں آ کر ہم نے پہلے تو اپنی اپنی پسند کی ڈرنک بنائی۔ اس نے شاور لیا کہ کتھک ڈانس کی استاد کو گھر آ کر وہ لبادہ تو اتارنا ہوتا ہے۔ اس نے پھر ہلکی سی نائیٹی پہنی اور خود کو بے حد آزاد محسوس کیا۔ اب ہم دونوں اپنے گلاس لے کر کچن میں پہنچ گئے۔ اس نے سلاد بنایا جس میں کا ٹیج چیز، اولیوز اور مشروم کو کسی سیرپ اور اولیو آئل سے تر بتر کیا۔ میں نے مچھلی فرائی کی اور کل کے بچے ہوئے کچھ سالن گرم کئے جن میں چاول، کباب اور دال بہت پسند تھے دیپتی کو اور مجھے بھی۔

اب باتیں شروع ہوگئیں۔ دیپتی نے اپنے گرورابندرناتھ ٹیگور سے بات شروع کی اور پنڈت روی شنکر سے ہوتے ہوئے کئی قسم کے پنڈتوں کے چرن چھونے کے بعد اس نے خود ہی ایک میوزک لگایا اور اس نے کلاسیکل رقص شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگی یہ میری روح کا وقت ہے۔ یہ میں روز کرتی ہوں اور یہی میری ہستی ہے۔ وہ اس وقت پورے چاند کے جوبن پر آئی ہوئی رات تھی جو کہتی تھی مجھے ڈھلنا نہیں ہے۔ میں شاید اس کے لئے ایک گواہ تھا یا سامع تھا یا ناظر تھا۔ میرے بغیر وہ ادھوری تھی۔ مجھے تو شاید ادھورا ہی رہنا تھا۔ اسے بھی شاید مکمل ہونے کی جلدی نہیں تھی۔ اس نے دو ڈرنک لے کر جو کتھک کے اسرار ورموز دکھانے شروع کئے تو میں اس کی لے کاری اور بھید بھاؤ کے سمندر میں بہت آگے چلا گیا۔ کب وہ تھک کر میری گود میں آن گری، کسی کو پتہ نہ چلا اور پھر ہم دونوں کو معلوم نہیں ہوا کہ زندگی کی سب سے بڑی سچائی کیا ہوتی ہے لیکن ہم دونوں نے اسے پانے کی کوشش ضرور کی اور اس رات وہ سچائی صرف محبت اور ایک دوسرے کی حفاظت میں ہمیں ملی۔

جب ہم صبح ناشتہ کر رہے تھے، دیپتی نے کہا مجھ سے شادی کرو گے۔ میں شادی میں وشواس نہیں رکھتی۔ کیا تم میرے بغیر پھیروں اور نکاح کے کاغذ کے رہنا چاہو گے۔ میں نے پورے ایمان کا سہارا لے کر کہا نہ پھیروں کی ضرورت ہے نہ کاغذی نکاح کی۔ ہم نے ایک دوسرے کو مان لیا، یہی بہت ہے اور ہم ایک دوسرے سے ایمان دار رہیں گے۔ جب نہیں رہیں گے تو اپنے راستے بدل لیں گے۔

اب میری زندگی بدل رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ میری بیوی اور بیٹے کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ مجھے نہیں دلچسپی تھی پاکستان کی سیاست سے، جمہوریت سے، انقلاب سے۔ میں ایک شاعر تھا، مجھے نہیں چاہئے تھا پابلو نرودا، ناظم حکمت، نزار قبانی، محمود درویش پیسلو میلوش، فروغ فرخ زاد اور کسی حد تک کمزور سے فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کا کردار۔ میں اس طرح کے انقلابی فلسفے سے آزاد ہو کر صرف ایک شاعر اور انسان کی زندگی میں واپس آنا چاہتا تھا اور مجھے اس حوالے سے ایک رول ماڈل مل چکا تھا۔ وہ والٹ وہٹمین تھا۔ امریکی شاعر جس نے اپنی انفرادی زندگی کو تہوار سمجھ کے منانے کا فلسفہ دیا اور میں اب اس پر چلنا چاہتا تھا۔ میں بہت کچھ بھول جانا چاہتا تھا اور میں اپنے آپ میں ایک ہی طرح کا انسان ہو رہا تھا۔ اب میرا دماغ اور دل لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ادب دنیا اور کائنات سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ درختوں، پودوں، پھولوں، پھلوں، سبزیوں اور پانیوں کے جہان میں رہنا چاہتا تھا۔ جلاوطنی سے تنگ آ کر میں کسی جھیل میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا اور وہ جھیل دیپتی کی شکل میں شانت اور

سوشیل میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں اور وہ ایک بڑے سمندر میں رہنا سیکھنا چاہتے تھے اور وہ سمندر یورپ تھا، لندن تھا یا کچھ بھی تھا۔ اب میں نے خود کو اپنی یادوں سے الگ کرنے کی کوشش کی اور یادوں کو لپیٹ کر صرف یاد بنا دینا چاہتا تھا اور جس کے پاس کوئی جاگیر نہ ہو وہ کم سے کم اپنی یادوں کی گٹھڑی کو یاد میں بدلنے پر تو قدرت رکھ ہی سکتا ہے۔ دیپتی نے مجھے ایک اور طرح کی زندگی کا ذائقہ دے دیا تھا۔ ذائقہ کیا تھا جیسے ایک امکان سے دوسرے امکان میں آدمی سفر کر جاتا ہے۔ جیسے ایک موسم سے دوسرے موسم میں جانکلتا ہے۔ جیسے ایک زمانہ دوسرے زمانے کی طرف نکل جاتا ہے۔ مجھے ایسے ہی محسوس ہو رہا تھا اور میں اپنی زندگی کی یادداشت سے محروم ہو رہا تھا اور ایک دن اچانک مجھے اخبار کے دفتر لاہور سے ڈاک میں خط ملا۔ میں کچھ رک سا گیا۔ ڈر سا گیا کہ کافی دنوں بعد یہ خط آیا تھا اور میں بھی کچھ کچھ غافل ہو چکا تھا کہ کوئی رشتہ میں پاکستان چھوڑ آیا ہوں اور بیٹے کی تو اب تصویر بھی خطوں میں نہیں آتی تھی۔ وہ کتنی شکلیں بدل چکا تھا، میں اس سے بے خبر تھا۔ میں خود کو تیار کرنے لگا کہ خط میں کیا ہوگا۔ خط کھولا تو کچھ بہت تفصیل سے نہیں تھا کہ تفصیل میں تو باتیں کی جاتی ہیں۔ اس خط میں باتیں نہیں کی گئی تھیں، کچھ اطلاع دی گئی تھی۔ خط سے پتہ چلا کہ میری بیوی کو پیٹ میں تکلیف ہوئی جس سے مسلسل درد کے ساتھ کھانے پینے میں دشواری اور ابکائیاں آتی تھیں۔ کسی کو معلوم نہ ہوا کیا ہے۔ آخر معلوم ہوا پتے میں بے شمار پتھریاں ہیں جو میں نے اندازہ لگایا کہ روزانہ لاہور کالج کی کینٹین سے سموسہ کھانے کی وجہ سے ایسا ہو سکتا تھا۔ اب میرے آپریشن کے لئے گھر میں کوئی تیمارداری کو موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنے کزن میجر فراز سے رابطہ کیا۔ اس نے مجھے سی ایم ایچ میں داخل کرا دیا اور اس نے میری تیمارداری کے لئے اپنی یونٹ کے لوگوں کو لگا دیا۔ بدقسمتی سے اینستھیزیا میں رکاوٹ آ گئی اور مجھے ہوش میں لانے کے لئے زندگی بچانے والی دوائیں استعمال کرنی پڑیں۔ بڑی مشکل سے میری جان بچی۔ اس پر میجر فراز خود کئی دن بیٹھے رہے اور میری تیمارداری میں لگے رہے۔ تمہارا بیٹا اکثر ان کی گود میں رہتا تھا اور وہ ان کو نہ صرف اپنا دوست بلکہ اپنا سب کچھ سمجھنے لگا تھا۔ سکول میں اسے داخل کرا دیا گیا تھا اور وہ خوش تھا۔ یہ ساری خبریں وہ مجھے اس لئے بتا رہی تھی کہ میں ایک ٹوٹا ہوا رابطہ تھا جس کو جوڑنے کی یہ ایک کوشش تھی۔ خط ختم ہو چکا تھا۔ محبت، وابستگی، اپنائیت، ذاتی تعلق سے یہ خط عاری تھا۔ مجھے دھچکا لگا لیکن میں نے غور کیا تو قصور اپنا نکل آیا۔ میں نے کوئی کوشش اس رشتے کو بچانے کی نہیں کی تھی۔ اگر آپ کسی پودے کو پانی نہ دیں تو وہ سوکھ جاتا ہے۔ اگر کسی پودے کو پیار سے نہ دیکھیں تو وہ مرجھا جاتا ہے۔ یہ دستور ہے۔ اگر آپ زمین پر مسلسل نہ چلیں تو دلدل بن جاتی ہے۔ اگر آپ

کسی پرندے کو پیار سے نہ دیکھیں تو وہ دوبارہ آپ کے درخت کی شاخ پر لوٹ کے نہیں آتا۔

خط نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں بیوی اور بیٹے سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ ان سے رشتہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے بیٹے کے لئے بھی مجھے ایسی تڑپ محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ وہ جب دنیا میں آیا تو میں یا جیل میں تھا یا شاہی قلعے میں۔ اس نے میری گود کو چکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے واپس جانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے بھٹو کی جماعت بکھرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی یا ضیاء الحق سے اپنے آنے کے حوالے سے کچھ سمجھوتے کرنے والی تھی۔ لندن میں بیٹھے ترقی پسند انقلابی جو اپنی زندگی اور گھر داؤ پر لگا آئے تھے ان کی خبر لینے والا کوئی نہیں تھا۔ پارٹی کے وڈیرے، جتوئی، رضوی، لغاری اور تالپور سب اپنے مستقبل کو کسی اور رخ پر دیکھ رہے تھے۔ اب سیاست میں دولت داخل ہو رہی تھی۔ اس کا آغاز ضیاء الحق نے پنجاب سے کیا اور پنجاب کو صنعت کاروں اور چیمبر آف کامرس کے نوخیزوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس نے اس لئے کیا کہ خاندانی سیاست کی جگہ تاجروں، پراپرٹی ڈیلروں، رئیل اسٹیٹ کے سوداگروں اور کنسٹرکشن کے گاڈ فادرز کو لایا جائے۔ یہ سب ضیاء الحق نے اپنی فوج کو ساتھ جوڑے رکھنے کے لئے خوبصورت پیکیج دریافت کیا تھا جو رہتی دنیا تک چلنے والا تھا۔ اس پر میرے جیسے شاعروں اور جذباتی قسم کے ترقی پسندوں اور انقلاب کی آہٹ سننے والوں کے لئے اندھیرا شروع ہونے والا تھا۔

اب تو مجھے سورج نکلنے سے پہلے کے اندھیرے نے بتا دیا تھا کہ نکلنے والا سورج کتنا گدلا ہوگا، کتنا دھندلا اور داغدار ہوگا۔ بہت دنوں سے جتوئی اور رضوی کی محفلیں سکڑ چکی تھیں۔ میرا جو استقبال وہاں ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ نہ مجھے اس کی شراب کی ضرورت تھی نہ اس کے ڈنر کی۔ سولنگی کی وجہ سے میں استعمال ہوا تھا اور پھر سولنگی نے بھی میرے اور اپنے مشترک فلیٹ کو استعمال کر لیا۔ جب اس نے جیسمین کو ایک کال گرل سمجھ کر اپنے ہی فلیٹ میں مسلسل معلوم نہیں کتنی بار استعمال کیا ہوگا۔ اس نے جیسمین کی توہین کی تھی۔ ظاہر ہے میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اب وہ میرے سامنے آ سکتا تھا اس لئے سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

پاکستان کی سیاست اور پاکستان سے اپنے تعلق کو میں نے پگھلتے ہوئے محسوس کیا۔ سب کچھ بے اعتبار ہو چکا تھا۔ میں اکیلا لندن کی سڑک پر کھڑا تھا اور کوئی واحد سہارا اگر مجھے محسوس ہوا تو وہ دیپتی تھی۔ اب میں زندہ رہ سکتا تھا تو دیپتی کی وجہ سے تھا۔ کوئی اور بھروسہ، کوئی اور وجہ، کوئی اور جواز میرے پاس نہیں

تھا۔اب شام کو میں ڈپٹی کی کلاس میں پہنچنا چاہتا تھا کہ سولنگی آ گیا۔ میں نے اسے نہیں پہچانا۔ وہ رونے لگا۔غریب ہاری کا بیٹا تھا اور وڈیروں کے دسترخوانوں کے نوالے چگتا تھا۔ میں نے اس کو نظر انداز کیا۔ اسے معلوم تھا کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ وہ بولا:

''سائیں! معاف کر دیں، دل بے ایمان ہو گیا تھا۔ میں نے سائیں اس گوری سے پوچھا تھا تمہارا ایک ٹائم کا کیا دینا ہے۔ جو اس نے بولا میں نے دے دیا تھا۔اپنے فلیٹ میں وہ رہتی ہے تو اس کا فائدہ نہیں اٹھایا پھر بھی معاف کر دیں۔آئندہ نہیں ہوگا۔''

میں خاموش رہا، وہ بھی خاموش بیٹھا رہا۔اب مجھے کچھ کہنا تھا۔

''دیکھو جو عورت کسی کی پناہ میں آ جاتی ہے تو پھر وہ نہ رنڈی رہتی ہے نہ کال گرل، نہ وہ طوائف ہے نہ کنجری اور نہ گشتی۔ وہ صرف ایک عورت ہوتی ہے۔اور اگر تم نے اس کے پیشے کا فائدہ اٹھانا تھا تو سڑک پر لگے کھمبے کے پاس جا کر سودا کرتے۔''

''سائیں! بھول ہو گئی۔''

''اور اگر اسی فلیٹ میں تمہیں کچھ کرنا تھا تو پہلے دوستی کرتے۔اگر وہ اجازت دیتی تو تم اس کے قریب آتے۔ دوستی کا مقام دیتے، عزت کرتے۔انسان سمجھتے اور اگر وہ رشتہ قائم ہوتا اور وہ اجازت دیتی تو پھر تعلق قائم کر سکتے تھے۔''

''سائیں ہم اَن پڑھ ہاری ہیں۔جس کا حسب نسب ہاری ہو وہ ازلوں کا ہارا ہوا انسان ہوتا ہے بلکہ انسان کب ہوتا ہے، بس ہاری ہوتا ہے۔''

''اچھا ہوا تم نے معافی مانگ لی۔اصل معافی تمہیں جیسمین سے مانگنی ہے۔''

''سائیں مجھے لے چلو۔میں معافی کیا ناک سے لکیریں نکالوں گا۔''

''اچھا اب بولو کیسے آئے ہو؟''

''سائیں! پاکستان میں کوئی بڑا تانبا تپ رہا ہے۔''

''مجھے اِدھر اس کی گرمائش پہنچی ہے؟''

''ہاں سائیں، سب وڈیرے اِدھر سے ٹکٹ کٹا گئے ہیں۔جو مال پانی بنانا تھا، عیش عشرت کرنی تھی، کر لی۔اب پاکستان میں ان کا چن چڑھے گا۔''

''کیسا چن چڑھے گا؟''

''وہ ایسے کہ اب اُدھر وہ شہید بھٹو کے قل پڑھیں گے۔ شہید بھٹو کی پھوڑی پہ بیٹھیں گے۔ ماتم کریں گے اور اپنے ووٹ پکے کریں گے۔ سائیں لہو بکتا ہے اور لہو سستا بھی ہوتا ہے مہنگا بھی۔ مگر بھٹو کا لہو تو بولنے والا ہے۔ بولتا لہو مہنگا بکتا ہے سائیں۔''

اب میں ساری بات سمجھ چکا تھا۔ چُوری کھانے والے مجنوں اب اپنا پیٹ بھر کے صحرا کی طرف نکل گئے تھے۔ پاکستان میں اب بھٹو کے خون کی تجارت ہونے والی تھی۔ کون کتنا بڑا تاجر ہے، یہ پتہ لگنے والا تھا۔

''سائیں وہ جتوئی، لغاری، رضوی گئے، فلائٹس پکڑ کر۔ اب سب بڑے بڑے گھر اور اپارٹمنٹس خالی پڑے ہیں۔ چابیاں مجھے دے گئے ہیں صاف صفائی کے لئے۔''

''تو تم وہاں اکیلے رہو گے۔''

''ناں سائیں! آپ کو لینے آیا ہوں۔ چل کے موج مستی کریں گے۔ بہت کچھ سائیں مال پانی چھوڑ گئے ہیں۔ نقد بھی دے گئے ہیں۔''

''سولنگی میں اب کہیں اور رہنے لگا ہوں۔ تم جاؤ۔ میں وہاں نہیں رہوں گا۔ میرا اپنا یہاں اچھا بندوبست ہو گیا ہے۔''

''سائیں کوئی شادی تو......''

''نہیں شادی کے علاوہ بھی یہاں انسانوں کے رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔''

''سائیں اب ہم ہاری بھلا کیا سمجھیں گے۔''

''بس یہ سمجھو کہ تم جاؤ اور رہو۔ میرا نمبر اور پتہ تمہارے پاس ہے۔ جب میری ضرورت ہو یا کوئی خبر دینی ہو، آجانا۔ اب میں اکیلا نہیں رہا۔''

سولنگی چلا گیا۔ پاکستان کی خبریں اب بی بی سی کی بجائے ادھر ادھر سے بھی عام ہو چکی تھیں۔ بھٹو کی بیٹی نے شادی کر لی۔ بڑے ترانے بنے۔ بڑے شگن گائے گئے۔ دنیا میں بے نظیر ایک علامت بن گئی مزاحمت کی، اور پاکستان کی پہلی مسلمان خاتون وزیر اعظم بننے کے لئے سبز رنگ کا لباس بھی تیار کرا چکی تھیں۔ یہ سب باتیں ایک پل کی نہیں تھیں، پلوں کے نیچے سے پانی تو بہہ ہی چکا تھا، میرا اور دیپتی کا تعلق بھی بہت دور جا چکا تھا۔ ہم دونوں کہاں کہاں سے ہو آئے تھے۔ کتھک فیسٹیول پیرس میں تھا۔ ہم دونوں وہاں گئے۔ میں تو دیوانہ ہو گیا دیپتی کا کہ میں کون تھا اور کیا ہو گیا؟ کتھک ایسی عالمی زبان ہے کہ دنیا ناچ

اٹھی۔اس زبان کو جاننے والے کہانی میں سانس لیتے ہیں۔ یہ نہیں بتاتے انہوں نے کیا دیکھا یا کیا نہیں دیکھا۔

میں پیرس سے ہوتا ہوا یورپی ملکوں میں گیا اور میں خود کو بھول گیا۔ مجھے صرف دیپتی یاد رہی جو میرے ساتھ ہوتی تھی۔انسان میں ہوا کی سرشت ہوتی ہے نہ انسان کسی کا ہوتا ہے نہ ہوا کسی کی ہوتی ہے۔

میں اندر سے بدلنے لگا تھا جیسے کسی نے اندر ایسے موسم گھول دیئے ہوں جن کی وجہ سے سب کچھ بدل چکا تھا۔نہ میں لندن کے پاکستانی کرداروں سے ملنا چاہتا تھا نہ جلاوطنی کے طوق کو لٹکائے لٹکائے پھرنا چاہتا تھا۔صرف جیل سے رشتہ روزگار کا جڑا ہوا تھا اس لئے وہ کام کر لیتا تھا اور دیپتی کے ساتھ گھر میں ہاتھ بٹا لیتا تھا۔کبھی وہ گھر کی چیزیں لے لیتی، کبھی میں ڈرنکس ڈبل روٹی پکڑ لیتا۔ہم دونوں کی ضرورتیں بھی کچھ زیادہ نہیں تھیں۔وہ ایسی عورت نہیں تھی جسے تحفے چاہئیں، جسے مردوں سے قیمتی زیورات چاہئیں۔اس کی انڈین جیولری بہت تھی۔وہ اپنی پرفارمنس کے لئے استعمال کرتی تھی۔اب اس کے سٹوڈنٹس بڑھنے لگے تو میں نے اسے روک دیا کہ اس طرح تم ہر سٹوڈنٹ پر توجہ نہیں دے سکو گی اور تمہارے سیکھے ہوئے سٹوڈنٹس جہاں بھی جائیں گے، تمہارے لئے نیک نامی کا سبب نہیں بن پائیں گے۔وہ یہ بھید جانتی تھی۔اس نے روک لگا دی اور پھر تو جیسے اس کا ٹروپے تیار ہوا تو ایک بڑی پرفارمنس ٹکٹ کے ساتھ لندن کے بہت بڑے ہال میں کسی نے سپانسر کر دی۔ میں اور دیپتی بیک سٹیج پر لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ میک اپ کے مراحل سے گزر رہے تھے کہ پولیس اندر داخل ہو گئی اور ہم سب ڈر بھی گئے اور حیران بھی ہوئے۔جب پولیس افسر نے میرا نام لیا تو میں گھبرا گیا۔اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی جرم کیا تھا، اس لئے کہ دیپتی میرے متعلق کیا سوچے گی۔ میں سامنے آیا کہ کیا بات ہے۔پولیس افسر نے کہا ''آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔'' اب دیپتی سامنے آئی ''کس لئے ، یہ میرے Husband ہیں۔آپ کو بتانا ہوگا یا میں ساتھ جاؤں گی اور پھر اس شو کی جتنی آمدنی ہے میں Damages کے ساتھ وصول کروں گی۔یہ نہیں جاسکتے۔''

میں دیپتی کی اس جرأت پر حیران رہ گیا۔پھر بھی میں نے دیپتی سے کہا مجھے پوچھنے دیں بات کیا ہے؟اس پر پولیس افسر نے کہا اس کے اپارٹمنٹ میں قتل ہوا ہے۔اب میں چونکا۔میں نے دیپتی کو بتا رکھا تھا کہ حکومت نے جو اپارٹمنٹ جلاوطنی میں دیا تھا میں وہاں نہیں رہتا۔اسے میں نے ایک غریب عورت اور اس کے بیٹے کو دے رکھا ہے۔دیپتی نے پوچھا ''کس عورت کا قتل ہوا ہے۔''

پولیس افسر نے بتایا کہ جیسمین نام کی عورت کو اس کے بیٹے نے کچن کے چاقو سے قتل کیا ہے۔

ہمیں اس اپارٹمنٹ کے سرکاری مالک سے پوچھ گچھ کرنی ہے کہ یہ اس کے نام پر ہے۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ میں دپتی کو ایک طرف لے گیا اور اسے بتایا کہ قصہ کیا ہے اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری پرفارمنس کے دوران ہی میں یہاں واپس آ چکا ہوں گا۔ اس پر وہ ساری بات سمجھ گئی اور میں پولیس کے ساتھ چلا گیا۔

جب میں پولیس سٹیشن پہنچا تو سولنگی پہلے ہی وہاں موجود تھا کہ اپارٹمنٹ میں وہ میرا شریک تھا۔ ریکارڈ واضح تھا۔ وہاں جیسمین کی لاش پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہسپتال کے سٹریچر پر پڑی تھی۔ مجھے اس کے اس انجام کا افسوس ہوا۔ وہ تو بیٹے کو پڑھا لکھا کر اچھا انسان بنانا چاہتی تھی۔ اس کے لئے وہ اتنی مشقت کر رہی تھی۔ اسی بیٹے نے جو بمشکل گیارہ سال کا ہوگا، نے اسے قتل کر دیا۔ اس لڑکے کو کیا معلوم غیرت کیا ہوتی ہے۔ مجھے ایسا ہی ایک کیس جو میرپور آزاد کشمیر کا میں نے عدالت میں کیا تھا، یاد آ گیا جس میں لڑکے نے غیرت میں ماں کو اسی طرح کچن کے چاقو سے قتل کیا تھا اور اسے پچھتاوا نہیں تھا۔

اب پولیس افسر سے میں نے کہا میرا بیان ریکارڈ کر لو اور مجھے جانے دو۔ یہ پاکستان ہوتا تو میں پہلے حوالات میں بند کیا جاتا اور اگلے روز بات ہوتی لیکن یہ لندن تھا۔ اس لئے انہوں نے میرا بیان لیا جو ریکارڈ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا میری بیگم کی پرفارمنس ہے جس کا ٹیکس حکومت برطانیہ پہلے سے لے چکی ہے۔ اگر اس پرفارمنس کو میری وجہ سے نقصان ہوا تو حکومت برطانیہ کو عدالت میں ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس پر پولیس افسر نے مجھے نہ صرف جانے دیا بلکہ میرے لئے گاڑی دی جو مجھے چھوڑ کر آئی۔ سولنگی دور سے دیکھتا رہا۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھا جو بیٹھا تھا۔ جو اکثر وہاں پڑھ رہا ہوتا تھا۔ جیسمین اپنے جسم کے ساتھ سو رہی تھی۔ وہ جسم جس نے لاکھوں مردوں کو فارغ کیا تھا، تسکین دی تھی، اب وہ جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جسم کی اہمیت کا مجھے اس دن احساس ہوا کہ جسم کیا طاقت رکھتا ہے۔ کیا اس میں روزی کمانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کوئی بازوؤں سے مزدوری کرتا ہے، کوئی جسم کے دوسرے اعضاء سے مزدوری کرتا ہے۔ کسی نے اس اناٹومی پر کچھ لکھا ہے۔ معلوم نہیں......

میں نے پولیس افسر سے اجازت لے کر جیسمین کے چہرے سے چادر ہٹائی تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ مجھے اسے اس حال میں نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل میک اپ تھا جیسا وہ دھندے کے لئے کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی لپ سٹک پھیلی ہوئی تھی جبکہ وہ اپنے گاہک سے کہا کرتی تھی کہ یہ ہونٹ میرے بیٹے کے لئے ہیں۔ ان کو میں چومنے نہیں دوں گی۔ تو پھر اب اس کے ہونٹوں پر

لپ سٹک کیوں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جیسے مجھے کہہ رہی تھی میں نے آپ سے گھر لیا تھا، میں شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دینا، میں بیٹا نہیں پڑھا سکی۔ میں نے چادر اوپر ڈال دی اور نکل گیا۔

میں جب ہال میں پہنچا تو پرفارمنس چل رہی تھی۔ میں نے ہال میں جا کر خوب داد دی اور پھر میں بیک سٹیج جا کر دیپتی کے گلے لگ گیا۔ وہ سمجھی میں اسے داد دینے کے لئے گلے لگا رہا ہوں۔ اصل میں تو اس کی جرأت اور اپنے لئے اپنائیت کی خاطر میرا دل اسے بے تحاشا چومنے اور گلے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ ساتھ ہی جیسمین کی موت پر میں کوئی جذباتی سہارا بھی لینا چاہتا تھا اور اسے ابھی کیا بتاتا، بس دل چاہتا تھا اسے اپنے سے الگ نہ کروں لیکن اس کے چاہنے والے بہت سے نوجوان ہندوستانی لڑکے لڑکیاں اور گورے گوریاں بھی تھے اس لئے مجھے الگ ہونا پڑا۔ اپارٹمنٹ جانے سے پہلے میں نے اسے کہا اس کامیاب پرفارمنس کی خوشی میں جہاں چاہو ہم ڈنر کر سکتے ہیں۔ وہ کافی تھک چکی تھی اس لئے جو اس وقت اسے قریب کی جگہ محسوس ہوئی، ہم ایک پب میں چلے گئے۔ پب میں کم لوگ تھے کہ رات کافی بیت چکی تھی اور پب اپنے آخری دموں پر تھا۔ ہم نے کچھ ڈرنکس لیں اور اس پب میں اس وقت جو مل سکتا تھا، منگا لیا۔ سلاد، مچھلی اور بیف کی چند ڈشیں تھیں۔ اب ہم دونوں کا ایک سفر شروع ہونے والا تھا۔ آج شام جس طرح پولیس کو دیپتی نے مجھے لے جانے کے لئے روکا، یہ غیر معمولی بات تھی۔ اس نے میرا اور اپنا رشتہ طے کر دیا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ دیپتی کو لندن میں ایک بڑی کامیابی ملی تھی جو اس کے اور میرے مستقبل سے جڑی ہوئی تھی۔ دیپتی نے ایک بات کی جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کہا ''تم میرے ساتھ ہمیشہ کے لئے رہنا چاہتے ہو؟ مطلب جتنا ہمیشہ انسانوں کا ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ہاں، اس میں کوئی وشواس ہے تمہیں۔''

''نہیں۔ میں تو آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''جب تک ہوں تم سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''تمہارا پاکستان؟''

''وہ اب میرا نہیں رہا۔''

''اور تمہاری بیوی۔''

''میں اب اس کا نہیں رہا۔''

''اور وہ؟''

''وہ بھی شاید میری نہیں رہی۔''

''تو پھر سنو! میں نے سوچا ہے تم جو اتنی اچھی شاعری کرتے ہو اس کا کوئی ریڈر تو ہو گا لیکن کتنا ہو گا۔''

''اس کا کوئی ریڈر نہیں نہ سننے والا ہے۔''

''سننے والا تو اب آئے گا۔ یہ جتنا Crowd ٹکٹ لے کے آیا تھا، آپ کا سننے والا ہو گا۔''

''وہ کیسے؟ کہاں آپ کا فن، کہاں میری شاعری۔''

''کسی نے اب تک سوچا نہیں، آپ کی شاعری کو میں کوریوگراف کروں گی۔ آپ سٹیج پر شاعری پڑھیں گے اور میں اس کے مطلب کے حساب سے کتھک کروں گی۔ کتھک کا مطلب تو کتھا بیان کرنا ہے تو آپ کی شاعری کو میں کتھا بنا کے پرفارم کروں گی اور پھر دیکھنا آپ کی شاعری کا معنی کیا بنتا ہے۔''

مجھے کچھ بات سمجھ میں آئی کہ میری نظموں میں منظر بنتا ہے اور کتھک کا فن نہ صرف منظر باندھ سکتا ہے، کردار کے جذبات کو بھی اجاگر کر سکتا ہے۔ اس طرح تو مجھے شاعری کا ایک نیا اظہار کتھک میں دکھائی دے رہا تھا جسے دیپتی نے دریافت کیا تھا۔ اب تو میں نے سوچ لیا کہ مجھے اپنے آپ کے لئے دیپتی کے ساتھ رہنا ہے۔ میرے اندر ایک عجیب طوفان سا پیدا ہوا۔ میں ایک شاعر اور ایک کتھک ڈانسر، مل کر یورپ میں عجیب فیوژن پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی تاثر میں ہم پب سے نکلے اور جو بھی راستے میں ملا اسے گلے سے لگاتے ہوئے گئے اور دیپتی کے اپارٹمنٹ میں ہم ایک دوسرے کے ہو گئے۔

اب میں نے اپنا آنے والا دن دیکھ لیا تھا۔ مجھے کیا لکھنا تھا اور کس ردھم میں لکھنا ہے اور اس کی کہانی میں کیا معانی ہوں گے، یہ سب اب مجھے نہ صرف سیکھنا تھا بلکہ تخلیقی سطح پر پرفارم بھی کرنا تھا۔ اس نئے طریقے سے شاعری کے میڈیم کو استعمال کرنے کے لئے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اب جو میں نے سوچا تو ایک اور انداز کا طرزِ احساس میرے اندر پیدا ہونے لگا اور میری نظموں کا رخ بدل گیا۔ ایک ڈرامائی کیفیت اب شاعری میں پیدا ہونے لگی۔ ایسے محسوس ہوا کہ جس طرح فلمی گیت نگار کو اپنے موضوع کی کیفیت کو سمجھنا ہوتا ہے اور ناٹک کی حرکات وسکنات کے حساب سے شعر بٹھانا ہوتا ہے۔ مجھے بھی ایسے ہی کرنا تھا مگر یہ فلمی گیت نہیں تھا، یہ کلاسیکی موسیقی کی آواز تھی جو مجھے پیدا کرنی تھی۔ میں نے جب ایسا تجربہ کیا اور دیپتی نے اس کے لئے رقص کے بھید بھاؤ اور کوریوگرافی کی ڈرائنگ بنائی اور ہر انگ کو میری شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا، طبلے، ستار اور پیانو کے ملاپ نے ایسا سماں باندھا کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ

کیسا فیوژن تھا، کیسا آرٹ تھا۔ شاعری ہمیشہ سے موسیقی اور تھیٹر کے ساتھ فلم کو طاقت دیتی رہی ہے۔ آج ایک نیا جلوہ شاعری دکھا رہی تھی۔ اب میری شاعری میں ہندی اور ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بھی ضرورت کے حساب سے استعمال ہونے لگے تھے۔ دیپتی نے اپنی پرفارمنس کو الگ سے بھی رکھا ہوا تھا اور میرے ساتھ بھی اسے پبلک پرفارمنس کے لئے خاص انداز میں متعارف کرا دیا تھا۔ اب دن رات ہم ساتھ ساتھ تھے، میں کہیں نہیں جاتا تھا۔ مجھے ضرورت بھی نہیں تھی لیکن برطانوی سرکار مجھے جلاوطنی کا جو بھاڑا بھتہ دیتی تھی میں دو تین مہینے بعد وصول کر لیتا تھا۔ جیسے آدمی کی پنشن جمع ہوتی رہتی ہے وہ لے یا بعد میں لے۔ اسی طرح عدالت میں کسی قیدی کا کیس بھی مل جاتا تھا۔ میں دیپتی پر بوجھ نہیں تھا اور اسے اس کا علم تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں دیپتی کا رکھیل بن جاؤں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت جلدی ہمارے درمیان فاصلے نکل آتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب تو ویسے بھی ہم نے اپنے شو تیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کچھ آرٹ پر لکھنے والے انگریزی پرچوں میں تبصرے بھی آ جاتے تھے اور جس کو ہندوستانی اور ایشیائی ملکوں کے تعلیم یافتہ خاندان پڑھتے تھے اور پھر ان کو اپنی شام کے لئے ہماری پرفارمنس کا انتظار رہتا تھا۔ میں نے ایک شو ایسا کامیاب کیا کہ لندن سے باہر بھی سپانسر یہ پرفارمنس لینے کے لئے آ گئے اور پھر برمنگھم، مانچسٹر، بریڈفورڈ، لیڈز اور سکاٹ لینڈ میں بھی اس کے لئے تقاضے آنے لگے اور ہم نے بھاؤ تاؤ کر کے یہ شوز لے لئے۔ میرے لئے تو یہ سب انوکھی دنیا تھی اور دیپتی بہت احتیاط سے چل رہی تھی کہ ہم کمرشل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ہمیں صرف تھیٹر کی برطانوی دنیا کے متوازی اپنی دنیا بنانا تھی اور پھر جہاں جہاں ایشیائی باشندے اکثریت میں تھے، پورے یورپ سے تقاضے آنے لگے جن میں جرمنی، فرانس، اٹلی، سپین بہت خواہش رکھتے تھے کہ ہم وہاں آئیں۔

دنیا کے مزاج اور پرانے تھیٹر کو دیکھنے کے بعد مجھے اور دیپتی کو تجربہ کرنے کا خیال آیا کہ کیوں نہ ہم ہندوستانی آرٹ میں دوسرے ملکوں کے تجربات بھی شامل کر لیں۔ ایک شام یہ خیال دیپتی کے اپارٹمنٹ میں دوسری ڈرنک پر مجھے آیا۔ دیپتی اچھلی کہ ہمیں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ چونکہ یہ خیال میرا تھا جس کی بنیاد شاعری پر تھی اس لئے میں زیادہ اندر سے جذباتی موج میں آ گیا تھا اس لئے میں نے بتایا کہ پاکستان میں فیض احمد فیض نے جبر اور ظلم کو اپنا شاعری استعارہ بنا لیا ہے اور وہ پاکستان میں آنے والے مارشل لاؤں میں عوامی تحریکوں کا ناخدا بن جائے گا اور وہ آنے والے زمانوں کے لئے اپنی شاعری کو ایشیا میں ہونے والے مظالم، ناانصافیوں اور سیاسی جبر کے خلاف استعمال کرنے کا ایسا ہنر آزمائے گا کہ اس کی

اولاد اس کی رائلٹی رہتی دنیا تک کھاتی رہے گی۔

دپتی نے بتایا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی بنگال کی تاریخ اور تہذیب کو فن میں استعمال کر کے نوبل انعام لے لیا اور کیا فیض اتنا بے وقوف ہے کہ ہندوستانی سیاست اور پاکستانی آمریت کی تاریخ کو استعمال نہیں کرے گا۔

اب سوچنا ہمیں تھا کہ میں اپنی شاعری میں پاکستانی مرثیے اور نوحہ گری کو استعمال کئے بغیر اپنی شاعری میں روس، فرانس اور دوسری اقوام کے انقلاب کی جدوجہد کو استعارہ بنا کر دپتی کے کتھک ڈانس پر پرفارمنس میں پیش کر سکوں۔ ابھی کچھ اور چھوٹی مظلوم قومیں ایسی ہی تاریخ میں تھیں جنہیں ان یورپی خداؤں نے کچل کے رکھ دیا تھا۔ ان میں سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور نیچے آئیں تو مالٹا، سلووینیا، آرمینیا وغیرہ معلوم نہیں کیا کیا علاقے تھے جو غریب کسان تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی قومیں دیہاتوں میں آباد تھیں نہ کسی کی فوج نہ کسی کے قلعے۔ تو ایسے میں ہر قوم کا ایک فوک بھی تھا اور شاعری بھی تھی۔ میں نے ریسرچ کر کے اس کو حاصل کیا اور اب میرے ہاتھ خزانہ لگ گیا۔ سب کی کہانی ایک جیسی تھی کہ بادشاہ کی ملکہ خوبصورت یا بیٹی خوبصورت، ان میں سے کسی پر دوسرے ملک کا حکمران عاشق ہو جاتا تھا جنگیں ہونے لگتی تھیں البتہ فوک میں ان سانحوں پر نوحے لکھے گئے اور وہ نوحے ان کی تاریخ کا قصہ بن گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں تو کربلا کا استعارہ گریہ کے لئے بے حد تخلیقی اظہار کا پیمانہ بن چکا ہے کہ زندہ کرداروں اور واقعات کی انتہائی جذباتی اور فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اب میں نے ذرا غور کیا تو ہر قسم کا سٹرٹیجک ہیرو ہوتا ہے۔ ہر قوم کا نوحہ ہوتا ہے۔ ہر قوم کا شہید ہوتا ہے۔ ہر قوم کا مرثیہ ہوتا ہے۔ ہر قوم کا کیتھارسس ہوتا ہے۔ ہر قوم کا خزینہ ماضی ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو وہ قوم نہ صرف زندہ رہتی ہے بلکہ وہ لولی لنگڑی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کو شہید بھی چاہیئے، خزینہ ماضی بھی چاہیئے، فوک بھی چاہیئے اور ایسا استعارہ بھی جو ہر زمانے میں کام آ سکے۔ اب میں نے دپتی کے ساتھ بہت محنت سے کتھک کے اندر ایسی جگہیں بنائیں جو دنیا کے اس ماضی کو ایک یونیورسل سچائی میں سمو سکیں۔ اب یہ کام تو میرا تھا۔ دپتی نے تو اسے اپنے آہنگ میں ترتیب دینا تھا۔ میں نے اب دنیا کی تاریخ کے ایسے کرداروں کو ڈھونڈا جو ان کی لوک روایات کے ہیرو تھے۔ پھر میں نے ان کو زمانوں تک پھیلی سیاسی جدوجہد کو تلاش کیا۔ پھر ان کے سٹرٹیجک ہیروز کو سمجھا پھر ان کے نوحوں کی روایات کو دیکھا پھر ان کے اجتماعی غم کے احساس کو جدوجہد میں ڈھلتے دیکھا۔ میں نے بہت وقت لائبریریوں میں گزارا۔ ایسے میں مجھے ان کی قدیم شاعری کو سمجھنا پڑا کہ اس شاعری میں یہ رزمیے تھے۔ یہ

ساری حکایات ان کی اسی شاعری میں لکھی گئی تھیں۔اب عالمی ادب تو ایک اور طرح مجھ پر آشکار ہو رہا تھا کہ ہر قوم کی ایک کربلا ہے، ہر قوم کا ایک سٹریٹیجک ہیرو ہے۔ ہر قوم کو ایک ایسے ہیرو کی تلاش ہوتی ہے جو ان کی قوم کی مرنے کے بعد قیادت کر سکے۔ساری قوموں کی قیادت ان کے مردہ ہیرو کرتے ہیں۔یہ دنیا کی بڑی سچائی ہے۔اور زندہ ہیرو یا تو مرنے کی تیاری اور جتن کرتے ہیں یا ان مردہ ہیروز کے کفن بیچتے ہیں۔یہ سب قوموں کی مجبوری اور ان کی تاریخی حقیقت ہے۔

کیا دنیا ہر طرح کے ہیرو سے محروم ہو چکی ہے۔یا قوموں نے ہیرو پیدا کرنے بند کر دیئے ہیں کہ ہر بڑی قوم خود کو چار ہزار سالوں تک کھینچ کے لے جاتی ہے اور اپنے ہیروز کی قدامت پر ناز کرتی ہے۔ مسلمانوں کی خوش بختی کہ کربلا کا سہارا مل گیا ورنہ سانحے، نوحے، مرثیے اور بین کی روایت کو کہاں سے شروع کرتے۔ایسے ہی ہر قوم کو اپنے لئے رونے کا ساز وسامان مہیا کرنا پڑتا ہے۔نہیں تو یونانی کہانی کی اساطیر کے مطابق کیتھارسس کا فلسفہ وجود ہی میں نہ آتا۔اب اس سرمائے کو شاعری اور کتھک سے جوڑنا تھا۔اس کے لئے اردو، ہندی اور پھر انگریزی میں بھی اس کے ترجمے کئے گئے تاکہ جیسا ماحول اور جیسا شہر اور اس کے دیکھنے والے ہوں ویسا ہی شو ترتیب دیا جا سکے۔اس سارے مطالعے سے مجھے یورپ کی تہذیب یافتہ قومیں اپنی شاعری میں بے حد چھوٹی محسوس ہوئیں۔ہر قوم اپنی شاعری میں عریاں ہو جاتی ہے۔یہ شاعر کا کمال ہوتا ہے۔جیسا پاکستانی شاعری میں ہماری مارشل لاء کی حکومتیں آپ کو بے لباس دکھائی دیتی ہیں ایسے ہی باہر کی قوموں کی بھی یہ کیفیت رہی ہے۔یہ جو آپ لڑتے مرتے رہے ہیں تو اس کے پیچھے ان قوموں کے تعصّبات تھے۔ان قوموں کے چھوٹے ظرف تھے۔ان کی بے ایمانیاں تھیں۔ان کی قوم پرستی کے فاشسٹ نظریے تھے جو دوسروں کو برداشت نہ کرنے کے حوالے سے شرمناک تھے۔اب میں یہ سب تو کتھک میں نہیں لا سکتا تھا مگر میرے پر ان قوموں کی سائنس، آرکیٹیکچر اور فنونِ لطیفہ کی بڑائی کے پیچھے چھپی کمینگی کا راز کھل گیا۔ان قوموں نے بڑے ذہین تاریخ دانوں کی گود میں پناہ لے رکھی تھی اور ان تاریخ دانوں کو ہندوستان میں مہاتما مانا جاتا تھا کہ ان کے پاس جدید ہتھیار اور جدید تھیوریاں تھیں۔ میں نے ان کی لوک داستانوں اور ان کی شاعری میں ان قوموں کی جڑوں میں پوشیدہ نسلی اور قومی نرگسیت کے رازوں کو پا لیا تھا۔

دیپتی سے اکثر بحث ہوتی رہتی تھی اور ہم دونوں پر دنیا اب کسی اور طرح آشکار ہو رہی تھی۔میں واضح طور پر بدل رہا تھا۔میں بنگالی آرٹ اور فوک کو جان چکا تھا کہ اس کی روح کن پانیوں میں تھی اور کن

ساحلوں میں اس نے اپنا جیون شروع کیا تھا۔ دیپتی نے مجھے نہ پاکستانی رہنے دیا نہ جلاوطن۔ میں کہیں بھی نہیں تھا۔ میں اور دیپتی ہر وقت ایک دوسرے سے بندھے رہتے تھے۔ یہ کسی بھی قسم کا جسمانی بندھن کم تھا اور جذباتی کے ساتھ ذہنی تعلق زیادہ تھا۔ ہم دونوں خوش تھے۔ اپنی مرضی سے کھاتے تھے، مرضی سے پیتے تھے، مرضی سے سوتے تھے، مرضی سے اٹھتے تھے۔ یہ سب تو مجھے خواب میں بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر بوجھ نہیں تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور ایسے میں ہمارے پاس جو بھی پیسے ہوتے تھے وہ کبھی کم نہیں ہوتے تھے۔ ہم لٹانے پر بھی آتے تو وہ لٹتے نہیں تھے، اور بڑھ جاتے تھے۔ پاکستان سے اب خط آنے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ پہلے مجھے کسی نے بتایا کہ تمہارے نام جو خط پاکستان سے ڈالے جاتے ہیں وہ سینسر ہوتے ہیں۔ وہ کسی فوجی مرکز پر جاتے ہیں اور کئی کئی مہینوں بعد تم تک پہنچتے ہیں۔ میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ اب جو خط آنے کم ہوئے تو میں سوچنے لگا کہ شاید حکومت وہ خط روک رہی ہے لیکن جلد ہی میرے پر کھلا کہ خط نہ آنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ ایک دن میں گھومتے گھامتے اخبار کے دفتر گیا اور اپنی ڈاک دیکھی تو کچھ خاص نہیں تھی۔ گھر سے دو خط آئے ہوئے تھے اور تاریخوں سے معلوم ہوا کہ ایک ہفتے کے فرق کے ساتھ تھے۔ میں نے پہلا خط کھولا تو میری بیوی نے بتایا کہ میجر فراز میرے کزن کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی اور اس کا ایک بیٹا تین سال کا تھا۔ وہ بیٹا چھوڑ کر دوسری شادی کے لئے امریکہ چلی گئی تھی۔ اب میجر فراز میری بیوی کے قریب آ چکا تھا جیسا کہ خط میں لکھا گیا۔ میری بیوی نے اس پہلے خط میں مجھے آگاہ کیا کہ مجھے بتاؤ کیا تم آ سکتے ہو یا کیا تم نے وہاں کوئی شادی کر لی ہے۔ اگر کر لی ہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نہیں روکوں گی۔ اگلے خط میں اس نے لکھا کہ مجھے تم سے خلع چاہئے کہ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میرے بیٹے کی دوستی میجر فراز اور اس کے بیٹے سے ہو چکی ہے۔ اب بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں آزاد ہو جائیں۔ تمہارا بیٹا تم سے زیادہ اب میرا بیٹا ہے یا میجر فراز کا بیٹا ہے۔ میں یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ تم وہاں سے مجھے آزاد کر دو، نہیں تو میں عدالت کے ذریعے آزاد ہو جاؤں گی۔

اب ان خطوط کے بعد میں نے خود کو آزاد محسوس کیا۔ میرے دل اور ضمیر کا بوجھ اُتر چکا تھا کہ اسے مجھ سے بہتر سنبھالنے والا مل چکا تھا۔ پاکستان کی آرمی کا افسر ایک معتوب شاعر سے بہتر تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔

پاکستان سے جو رشتہ باقی تھا وہ ایسے ٹوٹا کہ جیسے کسی ملک کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور وہ ایک

دوسرے سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اپنے مشترکہ ماضی کو بھی ساتھ لے جانے پر تیار نہیں ہوتے جیسے دریا اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ چاہے آگے چل کر وہ دریا خشک ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں اس جھٹکے سے تو سنبھل گیا تھا کہ کب تک اپنی بیوی اور بیٹے کو جھوٹ کے آسرے پر زندہ رکھتا۔ میں شاید اس کے لئے تھا بھی نہیں۔ اب وقت کسی اور طرف جا رہا تھا۔ پاکستان میں سیاست کے سارے انداز بدل گئے تھے۔ اب سیاست میں تجارت اور سرمایہ کاری کا تڑکا لگ چکا تھا۔ زمینوں کے سوداگروں نے نئے سے نئے طریقے آزمانے شروع کر دیئے تھے۔ ملک زرعی معیشت سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ اسمبلی کے تمام ممبران راتوں رات کھرب پتی بننا چاہتے تھے۔ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ اور پھر غیر جماعتی انتخابات نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ سوال کرنے والے طبقوں کو خاموش کرانے کے انوکھے طریقے دریافت ہوئے۔ طالب علم تنظیموں پر پابندی لگنے کے باوجود ایک اسلامی تنظیم کو تعلیمی اداروں پر قبضہ کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگئی اور پھر جو ہونے لگا وہ آنے والے پاکستان کی گواہی دینے لگا۔ بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں تمام زرعی اور زرخیز زمینوں پر ضیاء الحق کی حکومت کی سرپرستی میں ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنانے کے منظم منصوبوں پر کام ہونے لگا۔ پاکستانی افواج کے سپاہی اور جونیئر رینک کے افسر شہادت کے خوبصورت نغموں میں شہید ہونے لگے۔ شاعروں، گلوکاروں اور موسیقاروں نے ان کو شہادت کے ایسے سنہرے سپنے دکھائے کہ ہر سپاہی، ہر لانس نائیک اور ہر لیفٹیننٹ، ہر میجر یہاں تک کہ کرنل تک جان ہتھیلی پر رکھے ان ترانوں پر شہید ہونے کے لئے وقت سے پہلے شہادت مانگنے لگے۔ اس میں سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے جی کھول کر حصہ لیا اور ان کے گھرانوں پر ثابت کر دیا کہ جو شہید ہو گا وہ اپنے رہ جانے والے خاندان کے لئے باعث عزت وافتخار بن جائے گا۔ اس کی آڑ میں بڑے بڑے جرنیلوں نے پراپرٹی ڈیلروں کا روپ دھار کے زرعی زمینوں کو ایسا ہڑپ کیا کہ ملک گندم، کپاس، سبزیوں اور چاولوں سے رفتہ رفتہ محروم ہوتا گیا۔ شمالی پنجاب میں آموں کے باغوں کے ذخیرے تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ وہ آم جو پاکستان کے سفیر تھے، ساری دنیا میں وہ آم پاکستان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت تھے، وہ آموں کے پیڑ ایسے قتل کئے گئے کہ مجید امجد نے تو ہر چند نہر کے کنارے کھڑے درختوں کے کٹنے کا نوحہ اس طرح کیا تھا کہ

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب کہ اے آدم کی آل

لیکن شمالی پنجاب کے آموں کے باغات کے کٹنے پر کسی نے ایک مصرعہ نہ لکھا کہ ضیاء الحق نے فوج کے جرنیلوں کو گیارہ سال خاموش رہنے کا ایسا انعام دیا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سپاہی اور جونیئر افسر شہید ہونے کو تیار تھے کہ ترانوں کی فیکٹریاں لگا دی گئی تھیں اور چونکہ ہم محبِ وطن اور جذباتی قوم ہیں، ہمیں بہت جلد متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یوں ہم نے ہر محاذ پر لاشیں اٹھائیں اور ان لاشوں پر پلازے، فیکٹریاں اور رہائشی کالونیاں جرنیلوں نے کھڑی کر دیں۔ یہاں تک کہ جو میدانِ جنگ تھا 1965ء کی جنگ میں وہاں سے بھی آگے تک جرنیلوں نے رہائشی سوسائٹی کے بے شمار فیز کھڑے کر دیئے۔ گویا انہوں نے انڈیا کو سبق دے دیا کہ اب تم اپنے ٹینک اِدھر نہیں لا سکو گے کہ اِدھر تو ہماری سوسائٹی کا فیز دس نمبر موجود ہوگا اور جب ہم اٹامک پاور بنیں گے تو ٹینکوں کو تو ویسے بھی زنگ لگ چکا ہوگا۔

اب ایسے میں جن آموں کے باغات کو تہہ تیغ کیا گیا تھا ان میں سے کچھ آم بچ گئے تھے اور انہیں آم کی پیٹیوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے ان آم کی پیٹیوں میں امریکی بارود رکھ دیا۔ ان پوٹلیوں میں جو آموں کو جلدی پکانے کا کام کرتی ہیں۔ بارود اصلی تھا۔ پوٹلی مقامی تھی۔ سادہ کسان کیا جانتے تھے کہ آموں کی پیٹیوں میں پاکستان کی نجات چھپی ہوئی ہے لیکن کیا اسے ہم نجات کہہ سکتے ہیں؟ نہیں۔ ضیاء الحق نے جو بیج بونے تھے وہ اس نے بو دیئے تھے۔ اب اس سے جو فصل تیار ہونی تھی وہ تو آنے والے پاکستان کی کئی نسلوں پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ آم کی پیٹیاں بیچ بازار اور چوراہے کے پھوٹ گئیں۔ ابھی شام اترنے والی تھی کہ آموں کی پیٹیاں فضا میں ہی آموں کو پکائے بغیر پھٹ گئیں۔ اس سے فضا میں جو جہاز پھٹا اس میں ضیاء الحق کا گیارہ سالہ اقتدار بھی موجود تھا۔ امریکی سفیر بھی موجود تھا اور جرنیل بھی موجود تھے جو اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔

لندن کی اس شام میں ایسٹ لندن کے ان ساتھی جلاوطنوں کے فلیٹس کی طرف چل پڑا کہ ایک عرصہ ہوا میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ کون کس حال میں ہوگا معلوم نہیں تھا۔ وہ جو ہر شام کو ایک فلیٹ پر جمع ہو کر اپنی اپنی دارو کی چھوٹی چھوٹی بوتلیں جیبوں میں ڈال کے آئے تھے۔ پہلے میں وہاں گیا۔ کسی نے مجھے نہیں پہچانا کہ میں نے داڑھی چھوڑ رکھی تھی وہ بھی رابندر ناتھ ٹیگور والی اور پیچھے بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ جب میں بولا اور بتایا کہ میں کون ہوں تو سب کو حیرت ہوئی۔ مزید حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے دو سکاچ کی بوتلیں سامنے رکھ دیں۔ میں پاکستان کے حالات بی بی سی کے ذریعے سے نہیں مایوسی کے اندھیروں میں پڑے ہوئے ان جلاوطنوں کے ذریعے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب جو شام چھکی تو سب کی

چونچیں تر ہو گئیں اور اندر سے ہر طرح کا درد اور اداسی پھوٹ پھوٹ کے باہر آنے لگی تھی۔ ایک انقلابی جس نے زندگی کا سودا کیا تھا، رو پڑا کہ بےنظیر نے امریکہ سے سودا کیوں کیا ہے؟

''کس نے کیا سودا کیا ہے؟ کیا یہ بی بی سی نے بتایا ہے۔'' اب میرے بولنے کا موقع تھا۔

''پاکستان کا زہریلا ڈکٹیٹر کیسے اسے پاکستان میں آنے دے سکتا ہے جو اپنی فوج کو ہر طرح سے دولت، رغبت اور تجارت کا ایسا راستہ دکھا چکا تھا کہ آنے والے زمانوں میں پاکستان پر اگر جمہوریت نے آنا بھی تھا تو ان کی چھتری کے نیچے آنا تھا۔ یہ سب کچھ امریکہ نے ہمیشہ کے لئے طے کرا دیا تھا۔ اب شاید امریکہ کو ضیاء الحق کی ضرورت نہیں رہی تھی اور امریکہ کو پاکستانی عوام کے غصے کو قابو میں لانے کے لئے ضیاء الحق کی قربانی دینی تھی۔ ہمارے فوجی آمر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جو انہیں استعمال کرتا ہے وہ ان کا استعمال اپنے حق میں کسی وقت بھی کر سکتا ہے اور اس لمحے کا ہم کو انتظار رہنا چاہئے۔ میں نے جو بات کرنی تھی کر دی مگر وہاں تو دکھوں کا بازار گرم تھا۔ معلوم ہوا پاکستان ایمبیسی نے ہمیں پاسپورٹ جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اب ایسے میں وہاں موجود بزرگوں نے تو کسی نہ کسی طرح اپنی بچی کھچی فیملی سے ملنے کے لئے اسے اچھی خبر سمجھا اور جو میری عمر یا آس پاس کے لوگ تھے وہ اپنا اپنا پاکستان کھو چکے تھے۔ کوئی یورپ میں کہیں قسمت آزمانا چاہتا تھا، کوئی پاسپورٹ لے کر لیگل ہونے کے بعد یہیں انگلستان ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ کوئی کسی بھی زمین پر نہیں اترنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی چوہوں نے کتر کتر کے بے جان کر دی تھی۔ ان جلاوطنوں میں دو سینئر شاعر اور استاد بھی تھے جو شاعری چھوڑ چکے تھے۔ جن میں کوئی امنگ باقی نہیں رہی تھی۔ ایسٹ لندن کے گھٹیا اور ٹھنڈے ٹھار فلیٹوں میں دوسری جنگ عظیم کے قیدی تو رکھے جا سکتے تھے۔ انسانو کے لئے یہاں کوئی گرمائش موجود نہیں تھی۔ جس علاقے میں جلاوطنوں کو بسایا گیا تھا وہ آج بھی دوسری جنگ عظیم کی بیرکس سے مشابہ تھا۔ جو ذرا سیاسی طور پر ہوشیار تھے یا جوان لوگ تھے وہ تو اِدھر اُدھر کھسک گئے تھے۔ جیسے میں نے کھوج لگا کر اپنے لئے کئی راستے نکال لئے تھے ایسے ہی کچھ لوگ اپنے عزیز رشتہ داروں کی مدد سے برمنگھم جا نکلے، کوئی ساؤتھ ہال، کوئی ہونسلو، کوئی بریڈفورڈ میں قسمت آزمانے جا پہنچا۔ اب کچھ لوگ جو اپنے ملک میں بھی کہیں کسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے وہ راضی برضا یہاں کی حکومت کے دیئے گئے پیسوں میں سر چھپا کر بیٹھے رہے تھے۔ وہ اس شام میرے سامنے جمع تھے اور آہ و زاری کا سماں تھا جس کا مجھے پہلے علم تھا۔ یہ اب زوال کی اس حد تک آ چکے تھے کہ ڈبل روٹی، سلاد اور دودھ پر ان کا گزارا تھا۔ شراب پینے کے لئے وہ کسی خداترس انقلابی یا پاکستانی کی طرف دیکھتے تھے۔ کہیں سے

کوئی شام ہاتھ آ گئی تو ٹھیک ورنہ آپس میں سستی بیئر کے سہارے شام گزار کے سو رہتے تھے۔ کسی سیاسی جماعت نے ان کی خبر نہ لی۔ سیاسی جماعت تو ایک ہی تھی اور اس میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اشرافیہ نے کچھ تو مارشل لاء کے حاکموں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنے لئے مستقبل محفوظ کر لیا تھا اور کچھ نے لہو لگا کر شہیدوں میں نام کر کے جمہوریت کا راگ مالا گلے میں پہن کے انقلاب پسندوں میں عزت پانے کا جتن کر لیا تھا لیکن ان جلاوطنوں کی کسے پرواہ ہو سکتی تھی کہ پاکستان میں کروڑوں عوام کی روزمرہ کی زندگی خبروں میں رہتی تھی۔ اس لئے بھٹو صاحب کی پارٹی کئی حصوں میں بٹ کر کام کر رہی تھی۔ اس شام میرے سامنے میرامن کی داستان ''باغ و بہار'' کے آغاز میں قبرستان کا منظر درپیش تھا جس میں چار درویش رات کی سنسان خاموشی میں قبروں کے بیچ کفنیاں پہنے ایک دوسرے کے روبرو اپنا اپنا قصہ سنانے بیٹھے تھے۔ میں واحد سامع تھا۔ ایک سینئر شاعر کہ پروفیسر تھا اور بیچ اندھیری رات کو پولیس نے اسے گھر سے اٹھایا اور کہا تمہاری بیگم کو جیل سے نکال کے ایئرپورٹ پہنچا دیا ہے، وہ ضد کر رہی ہے کہ اس کے خاوند اور بچوں کو بھی اسی کے ساتھ جلاوطن کیا جائے۔ اب آدھی رات کو وہ پاجامے کے ساتھ بچے لے کر لاہور ایئرپورٹ پہنچا دیا گیا تھا۔ میرا پہلا درویش وہی تھا۔ اس نے کہا اے آزاد مرد کہ تو اب لندن کا شناسا اور سرد و گرم چشیدہ ہے۔ جان لے کہ میری بیگم اور بچے بےنظیر بھٹو کے ساتھ پاکستان جا پہنچے ہیں اور مجھے یہاں چھوڑ گئے ہیں، تو میرا تو کوئی آسرا اور سہارا نہیں۔ مجھے کسی طرح پاکستان کی راہ دکھاؤ۔ دوسرا درویش کہ اس سے بھی لاغر ہو چکا تھا، اپنی کفنی کے اندر سے منہ نکال کے گویا ہوا کہ اے آزاد مرد! ہم راندۂ درگاہ بزرگوں پہ نگاہ کر، کون سے جنم سے ہم کس جنم تک آ چکے ہیں۔ ہم کہ جنموں کے بچھڑے ہوئے لوگ ہیں۔ کب وطن سے بچھڑے، کب اپنوں سے بچھڑے یاد نہیں۔ کبھی منقار پہ کلام گونجتا تھا اب نہ کلام نہ دشنام۔ منقار زیر پر ہیں اور آپ سے کچھ نہیں مانگتے، بس اس جہنم سے ہم کو آزاد کرا دو۔

''لیکن آپ تو پشاور واپس جا سکتے ہیں جب حکومت نے پاسپورٹ دینے کا کہہ دیا تو یہاں کیا رہنا۔ لعنت بھیجیں ولایت کو اور پاسپورٹ بنوا کے جائیں۔''

''کہاں جاؤں گا۔ کڑیل جوان بیٹے کو کہ پروفیسر تھا، یونیورسٹی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ ہمارے قبیلوں میں بہت دشمنی کا سلسلہ چلتا آ رہا تھا۔ میرے بیٹے سے قتل ہو گیا ہے اور وہ جیل میں ہے۔ میں نے جو بھی یہاں سے تعلقات استعمال کرنے تھے، صلح اور قتل کا تاوان دینے کے لئے وہ ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ صرف میرے بیٹے کی جان بدلے میں لینا چاہتے ہیں۔ دو بچے اور ایک بیوی بیوہ ہونے کے لئے تیار بیٹھی

ہے۔ وہ عدالت میں کسی بھی پیشی پر اسے قتل کر دیں گے۔ میں جانا چاہتا ہوں تا کہ ان سے اپنی جان تاوان کے طور پر دے کر بیٹے کی جان بچا لوں۔"

"تو پھر آپ پاسپورٹ لے کر جائیں۔"

"اگر گیا تو موت ہی دیکھنے کو ملے گی اپنی یا بیٹے کی۔"

ایک بزرگ کہ جو بھٹو کی پارٹی میں مڈل کلاس کی نمائندگی کرتے تھے۔ وکالت نے کیا چلنا تھا، پارٹی کے کارکنوں کے چھوٹے موٹے کیسوں میں ضمانت کرانے کے لئے مشہور تھے۔ گھر ان کا خاندانی جائیداد سے چلتا تھا جس میں دو چار دکانیں تھیں جو کرائے پر دے رکھی تھیں اور اس کے جلاوطن ہو جانے کے بعد پیچھے ان دکانوں کے کرائے دینے والا بھی کوئی نہ رہا اور شاید ان پر قبضہ بھی ہو سکتا تھا کہ مارشل لاء کی اس حکومت نے قبضہ گروپ کلچر بھی متعارف کرا دیا تھا اور یہ قبضہ گروپ اسمبلیوں میں آسانی سے منتخب ہو کر آنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا کہ سیاست کو حرام کی دولت کا تڑکا لگ چکا تھا۔ وہ اپنی کفنی میں سے بمشکل سر اٹھا کر بولا کہ "میں نہ پیچھے جانے کے قابل رہا ہوں نہ یہاں رہ سکتا ہوں۔ کیا کروں۔"

"جو بھی کرنا ہے وہ تو آپ کو کرنا ہے۔ سنا ہے بے نظیر صاحبہ حکومت بنا لیں گی تو پھر اپنے اپنے زخموں اور قربانیوں کی قیمت وصول کرنے کا وقت آ جائے گا۔"

"قربانیوں کی قیمت وصول کرنے والوں کی لمبی قطاروں میں میرے جیسے کو کون گھسنے دے گا۔ سنا ہے لوگوں نے تو قربانیوں کے ثبوت اور جعلی ثبوت بھی پیدا کر لئے ہیں۔"

"یہ سب تو ہوگا۔ کیا آپ نے دنیا کے انقلابات کی تاریخ نہیں پڑھی۔ ہر انقلاب کا ایندھن عوام ہوتے ہیں اور جب انقلاب آ جاتا ہے تو ٹینکوں پر وہ لوگ بیٹھ کر شاہی محلوں میں داخل ہوتے ہیں جن کو معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے قتل عام سے کب ہاتھ روکنا ہے اور کب انقلاب کی گاڑی میں سوار ہونا ہے۔"

"تو جلاوطنی میں ہم تو وہ جدوجہد بھی بھول چکے ہیں جو پاکستان میں رہ کر کر سکتے تھے۔ ہماری فلائٹ کے مسافروں کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا ہے۔"

"میں بھی اسی فلیٹ کا مسافر تھا۔"

"مگر تم جوان تھے اور تم تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تم اب ہم میں سے نہیں ہو۔"

"میرے ساتھ اس فلائٹ کے کئی اور مسافر بھی آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ بھی اِدھر اُدھر کوچ کر گئے تھے۔ ان سب کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ اصلی لاہوریوں میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ ہر جگہ

کو لاہور سمجھ کر جڑیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا ہی انتظار حسین نے بھی کیا ہے۔ وہ بھی میرٹھ کی مٹی تھا اور لاہور میں جڑیں چھوڑ کے بیٹھ گیا ہے۔ بھئی یہ لندن ہے، دوسری جنگ عظیم کا اجڑا ہوا لندن جس کے ایک حصے میں آپ کو لا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ تو بزرگو یہ لاہور نہیں ہے نہ پشاور ہے، اپنی جڑیں لپیٹو سمیٹو اور ایک بار پھر سے اپنے اپنے شہر کی طرف کوچ کر جاؤ۔ کچھ سبق میر تقی میر اور غالب سے لو کہ وہ اگر کہیں کوچ کر کے گئے بھی تو واپس لوٹ کے ضرور آئے۔ اب آپ بھی جائیں اور اپنی پارٹی سے وفاداری کو کیش کرائیں۔ میں تو پارٹی کا کارکن نہیں تھا اس لئے میں یہ وفاداری کیش نہیں کرا سکتا۔ آپ سے یہی کہوں گا کہ انقلاب کے فریب کا تماشا بھی دیکھیں۔''

اب جو دیکھا تو چاروں درویش کفنیاں لپیٹ کر چلے گئے تھے۔ زوال کی اس گھڑی میں مجھے بہت صدمہ ہوا کہ تاریک راہوں میں کیسے کیسے لوگ مارے گئے اور ابھی کتنوں کو مرنا ہوگا کہ مارشل لاء کا موسم پاکستان سے کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہی وہ موسم ہے جسے دوام حاصل ہے۔ میں وہاں سے نکلا اور سڑکوں پر سنسان وقت پھیلا ہوا تھا۔ میں اکیلا جا رہا تھا۔ میرا اور سولنگی کا سرکاری فلیٹ بھی اُدھر ہی تھا لیکن میں وہاں نہیں جا سکتا تھا کہ وہاں اندھیروں میں کوئی روح بھٹک رہی ہوگی۔ وہ جیسمین کی ہوگی۔ میں رات بھر اس روح کے ساتھ لیٹ کے نہیں سو سکتا تھا۔ میں نے ایک انڈر گراؤنڈ سٹیشن دیکھا اور اس میں چلا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد ایک ٹرین آئی۔ میں بیٹھ گیا۔ مجھے کہاں جانا تھا، دیپتی کے پاس یا اخبار کے دفتر میں کہ اس کی چابی بھی میرے پاس تھی۔ سٹیشن آتے گئے جاتے گئے۔ اخبار کے دفتر جاتے ہوئے خوف آنے لگا۔ جب سے میں دیپتی کے ساتھ رہنے لگا تھا مجھے اکیلے فلیٹ اور اکیلے کمرے سے خوف آنے لگا تھا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ بمشکل ایک سال ہی رہا تھا۔ جو اب میری نہیں رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزرے ایسے دن نہیں تھے جو مجھے تکلیف دیتے۔ بس وہ وقت شادی کا قرض اتارنے اور اپنا گھر بنانے کے لئے فکرمندی ہی میں اِدھر اُدھر کھسک گیا اور بیٹے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی ضیاء الحق نے ایک رہنما شہید کر دیا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی صرف بھٹو صاحب کی پھانسی نہیں تھی، پاکستان کے مستقبل کی پھانسی تھی۔ میں اب انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ڈبے میں اکیلا مسافر تھا۔ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں۔ کوئی راستہ نہ ملا تو دیپتی کے فلیٹ سے قریب جو سٹیشن آیا، میں اُتر گیا۔ وہ سونے جا چکی تھی۔ میری آہٹ پا کر اُٹھ بیٹھی کہ اس فلیٹ کی چابیاں بھی میرے پاس ہوتی تھیں۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں کچن میں کھانا لے ہی رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ اس نے کہا ''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں اکیلے سونا بھول چکی ہوں۔ تم ایسے نہ جایا کرو۔''

"میں تو آپ کو بتا کر گیا تھا۔"

"ہاں، مگر، یہ بھی بتا جاتے کہ تم لوٹ آؤ گے۔"

"ہاں اب میں جیسی بھی رات ہو، صبح اپنے بستر پر تمہارے ساتھ کیا کروں گا۔"

دیپتی کو میری اور مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ اچانک اس نے مجھے کہا کہ کیوں نہ ہم بھٹو کی پھانسی پر لکھی شاعری کو کوریوگراف کریں۔ کتھک تو ویسے بھی ایسا میڈیم ہے جو ہر قصے کہانی کو ادا کر سکتا ہے۔ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں ہو گا اور اسے ہم بھٹو کی پھانسی کے دن دو تین جگہوں پر لندن اور قریب کے علاقوں میں پرفارم کر سکتے ہیں۔ بھٹو کی پھانسی قریب تھی۔ میں نے اپنی شاعری کو ترتیب دیا تو وہ کافی تھی ایک گھنٹے کی پرفارمنس کے لئے۔ ہم دونوں نے ایک ایک لفظ کے معنی کو حرکت میں تبدیل کیا اور دیپتی نے کمال مہارت سے ہاتھوں اور جسمانی حرکات سے وہ کیفیت ادا کی جو لفظوں کے معنی میں چھپی ہوئی تھی۔ اس ریہرسل میں ہمیں پندرہ سے بیس دن لگے اور جب دیپتی نے محسوس کیا کہ وہ پرفارم کر لے گی تو ہم نے اس کا اعلان کر دیا۔ سپانسر کے ساتھ معاملات طے ہوئے۔ اتفاق کی بات کہ سپانسر پاکستانی نہیں تھا، انڈین تھا جو بڑے بڑے سٹارز کے شوز اور میوزک شوز کی مہارت رکھتا تھا اور اس کی کمپنی کی مالی حیثیت بہت قابل اعتبار تھی۔ اس نے پچاس فیصد ہمیں ایڈوانس ادا کر دیا جو بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ دیپتی اور میں سوچ میں پڑ گئے کہ ہمارے سال کے اخراجات کے لئے وہ کافی تھے۔ وہ پرموٹر یا سپانسر بہت تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے ہماری ریہرسل دیکھنے کے بعد ہال بک کرایا تھا اور ہم سے شو کا معاوضہ طے کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لندن میں پاکستانی، بنگلہ دیشی اور ہندوستانی باشندے سیاسی طور پر آزاد ہیں اور وہ پاکستانی سیاست پر نظر رکھتے ہیں۔ میں جان چکا تھا کہ جو عظیم ہال اس پرفارمنس کے لئے بک ہوا ہے وہ سارا بک ہو چکا ہے اور لندن کے قرب وجوار میں بھی کئی ہال سولڈ آؤٹ ہیں۔ میں تو لندن میں ایک گم نام جلاوطن تھا۔ اب دیپتی نے کیسے یہ سب کیا کہ ہم دونوں ایک ساتھ ایشین ملکوں میں مقبول ہو گئے تھے۔ ہمارے ساتھ جو سازندے ہوا کرتے تھے، ہم نے انہیں بھی تربیت دے کر ساتھ ملا لیا تھا۔ کچھ سازندے جو انڈیا اور پاکستان میں روزگار نہ ملنے پر قسمت آزمائی کے لئے لندن آ گئے تھے، اِدھر اُدھر سے سن سنا کر ہمارے پاس پہنچ گئے۔ دیپتی نے ان کا کام دیکھا اور اپنے ساتھ ان کو کتھک کی زبان کے ساتھ سنگت کرنے کا تجربہ کیا تو وہ اس پر پورا اترے۔ انہیں ہم نے شامل کر لیا تو یہ بڑا آرکسٹرا بھی بن گیا۔ میں اس دنیا کو اب جاننے لگا تھا۔ مجھے یہ "شانتی نکیتن" ایسے لگا کہ میرا دوسرا جنم ہوا ہے۔ یہ "شانتی نکیتن" رابندر ناتھ ٹیگور کا نہیں تھا۔ یہ

دیپتی کا تھا جو کتھک کو اپنی زندگی بنا چکی تھی۔ اسے میں شانتی کا نکیتن تو کہہ ہی سکتا ہوں۔

اچانک دیپتی کے ساتھ رہتے رہتے میں اپنی بیوی کا نام لے لیتا تھا۔ وہ چونک جاتی تھی کہ تم نے کس کا نام لیا۔ میں بات گول کر جاتا تھا مگر وہ تو سمجھ جاتی تھی۔ ہماری یادداشت ہماری محافظ بن جاتی ہے اور ہمیں اپنے ماضی سے دور نہیں ہونے دیتی۔ اب میری زندگی میں یہ جو واقعہ آ گیا تھا اسے میں بے وفائی سے تعبیر نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہیں مجھ سے کوئی بے احتیاطی ہوئی ہے جس نے مجھے اپنے دو بڑے رشتوں سے کاٹ دیا ہے۔ کیا یہ ضیاء الحق کا مارشل لاء ہے یا میری کوئی بھول ہے۔ اس کا تجزیہ کر بھی لیں تو اس کا سہرا ضیاء الحق کے سر پر آتا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہندوستان کے شاعروں کا گھریلو زندگی کا ریکارڈ اتنا برا کیوں ہے۔ سارے شاعر اپنی محبت میں کیوں گرفتار رہے۔ آدھے سے زیادہ اپنی محبت میں شراب پی کر فوت ہو گئے۔ باقی کے آدھے اپنی گھریلو زندگی کے بوجھ سے آزاد ہونے کے چکر میں مارے گئے۔ یہ شاعری کیا کوئی زہر ہے یا کوئی غیر انسانی معجون ہے جو انسانوں کے گھر اجاڑ دیتی ہے۔ میں تو صرف ہندوستانی شاعروں کی حد تک بات کرنے کے لائق ہوں۔ تو ایسا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کی نجی زندگی کیا ہو گی کہ بے خانماں برباد پھرے اور اپنے حاکموں کی طرف دیکھتے رہے۔ غالب کی امراؤ بیگم کا تذکرہ کیا کریں کہ ڈومنی کے ہاتھوں معلوم نہیں کتنی رسوا ہوئیں پھر جو مجاز صاحب نے کیا اپنے ساتھ اور پھر داغ کی والدہ کا قصہ جو شمس الرحمان فاروقی نے اپنے ناول میں مصالحے لگا کر لکھ دیا تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ شاعروں کی نجی زندگی میں عورتوں کے کردار کیسے رہے ہوں گے۔ میں اس روایت کو اپنی زندگی سے جوڑنا چاہتا تھا لیکن کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ کہاں میں اور کہاں شعری روایت۔ لیکن اب نکلا ہوں تو کچھ کھوجنے کا حق تو حاصل ہے مجھے۔ اب جاں نثار اختر نے اپنی صفیہ سے کیسے خط لکھوائے اور پھر فیض صاحب کی بیگم نے دونوں بیٹیوں کو پڑھانے کا ذمہ خود لے لیا۔ فیض صاحب کو سنبھالنے والی ہر شہر میں ایک خاتون موجود تھی۔ یہاں تک کہ لندن میں بھی۔ ناصر کاظمی کی بیگم نے سکول میں ملازمت کر کے بچوں اور ناصر کو پال پوس کے بڑا کر دیا۔ حبیب جالب کی بیگم یہ کام نہ کر سکیں۔ جون ایلیا کے قصے الگ سے ہیں۔ ذرا سی ذہین خاتون نہ سنبھال سکے۔ اس نے بچے سنبھال لئے۔ احمد فراز کو بھی خواتین نے سنبھالا۔ دو بیویاں مشکل سے سنبھال سکے۔ اب میں نے خود پر نگاہ کی تو میں بھی اسی روایت میں آلودہ ثابت ہوا۔ نہ بیوی کو سنبھال سکا نہ بیٹے کو۔ یہ بھی شاعری ہی کا داغ تھا جس کے باعث میں جلاوطن ٹھہرا اور میرے بس میں کچھ بھی نہ رہا۔ میں کس شاعر کو دوش دوں۔

وقت جیسے بھی گزر رہا تھا، اس پانی کی طرح تھا جو نشیب کی طرف خود بخود بغیر کسی رکاوٹ یا تردد کے چلتا رہتا ہے۔ میرے پر وقت ایسے گزرا جیسے معصوموں کا لہو چپ چاپ بہہ جاتا ہے اور معصوموں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اچانک ایک دن لندن میں یہ خبر گونج گئی کہ ضیاء الحق کا سی ون تھرٹی ہوا میں پھٹ گیا ہے۔ دراصل پھٹے تو آم کے کریٹ تھے جو بہاولپور ایئرپورٹ پر چڑھائے گئے تھے کہ آم کی سوغات اس علاقے کا خاص تحفہ ہوتی ہے۔ لندن اُس شام خاموش تھا۔ معمول کے مطابق تھا کہ اس خبر کو ہم تک پہنچنے میں گیارہ سال لگ گئے۔ مجھے یونہی خیال آیا کہ امریکہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان میں پہلی مسلم ملک کی وزیراعظم بنا کر شاید گناہوں کا کفارہ کرنا چاہتا ہے۔ اس شام لندن کے شراب خانوں میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ میں اور دیپتی پاکستانی علاقوں میں نہیں گئے۔ میرا رابطہ اس شام نہ تو جلاوطن انقلابیوں سے ہو سکتا تھا نہ میں کسی پاکستانی ریستوران میں جا سکتا تھا کہ میں اور دیپتی اپنی ریہرسل کر کے نکلے تھے، کچھ شام کے لئے خرید لیں اور ہم جب گراسری لے رہے تھے تو معلوم نہیں کیوں دیپتی نے ایک شیمپین بھی اپنی ٹرالی میں رکھ لی تھی۔ میں نہ خوش تھا نہ ناراض۔ بس پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک کے سفر میں قائداعظم محمد علی جناح کی بصیرت پر غور کر رہا تھا البتہ ''بصیرت'' ان Comas میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہم اپنے فلیٹ پہنچے۔ اب میں دیپتی کے فلیٹ کو اپنا کہہ سکتا تھا۔ جب ہم دونوں کچن میں تھے تو ہماری بات چیت اس واقعے پر نہیں ہوئی۔ بس ہم سوچ رہے تھے کہ آنے والا وقت پاکستان کے لئے کیا ہوگا۔ زخموں کے مندمل ہونے میں کتنا وقت لگے گا اور جو کانٹے وہ چھوڑ گیا ہے اسے نکالنے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے۔ ہم نے مچھلی فرائی کی، آلو کباب بنائے، سلاد بنایا، چکن کو فرائی کیا اور بنی بنائی روٹیاں گرم کر کے ڈنر ٹیبل لگائی کہ اچانک دیپتی نے شیمپین اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ برف کے باؤل میں میرے سامنے رکھ دی کہ آج وہ وقت آیا ہے کہ تم اس لمحے کو تہوار کے طور پر منا سکو اور اس نے شیمپین کھول دی، اپنے پر اور میرے اوپر گرائی مگر میں اس کی خوشی میں شریک تو ہو گیا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جس طرح یہ مشہور قول ہے کہ

"Justice delayed is Justice denied."

ایسے ہی ضیاء الحق کی موت میرے لئے وقت پر انصاف نہیں تھا۔ دیپتی کو خوش دیکھنے کے لئے ہم نے یہ شام اچھی گزارنے کا پورا اہتمام کیا۔

یہاں سے میری زندگی کا ایک اور سفر شروع ہوا کہ اب میں پاکستان جا سکتا تھا لیکن کس کے لئے جاتا۔ وہاں تو ظالم مارشل لاء نے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ دیپتی نے میری ہر طرح کی شاعری جمع کرنا

شروع کر دی۔ جمع کیا کرنی تھی، جو کچھ فقیر کی گدڑی میں تھا وہ تو کچھ زیادہ تھا ہی نہیں۔ توشہ خانے میں تو غالب کے بھی کچھ نہ نکلا۔ بس ایک ''نسخہ غالب'' اور میں تو کیا تھا؟ کیا پدی کا شوربہ۔ لیکن دیپتی نے شوربہ کچھ جمع کر ہی لیا اور جب میں نے کتھک کی شاعری اور اپنی مارشل لاء کی شاعری کو دیکھا تو دوسو صفحے سے زیادہ کی کتاب آسانی سے شائع ہو سکتی تھی۔ یہی دیپتی کا خیال تھا کہ یہ کتاب اب آ جانی چاہئے لیکن اس دوران میں شیکسپیئر سے لے کر عالمی ادب کی کلاسیک تک ہر زبان کے لوگ قصوں اور ڈراموں کا مطالعہ کر لیا خاص طور پر یونانی اساطیر، ہندی اساطیر اور ہر قوم کے رزمیہ قصے جو ان قوموں کی بہادری کی پہچان بن چکے تھے، میرے مطالعے میں آئے تو دیپتی کے ساتھ میں نے مل کے ایک اور اسلوب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ کتھک کی فارم اور میڈیم دنیا کی ہر ایپک اور کہانی کو پیش کرنے کے لئے بہترین استعارہ فراہم کر سکتا تھا۔ دیپتی اور میں نے اب کتھک کو اور شاعری کو استعارے کے طور پر استعمال کرنے کا ہنر سیکھنا شروع کیا۔ تجربہ، علامت، استعارا، سرئیلزم اور اظہاریت یہ وہ سکول تھے جو سامنے آ چکے تھے۔ دنیا کی ایپک اور لوک قصوں کو ہم نے پاکستان اور ہندوستان کے پس منظر میں علامت کے طور پر استعمال کرنے کے لئے ایسے قصے اور ڈرامے تلاش کئے جن کے کردار ان دوملکوں کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو آسانی سے علامت اور استعارے کے طور پر بامعنی بنا سکتے ہوں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہر قوم اور ہر زبان کے ایسے قصوں میں بے وفائی ہوتی ہے، محبت ہوتی ہے، پسپائی ہوتی ہے، بہادری ہوتی ہے، دھوکہ ہوتا ہے، وفاداری ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر انسانی اقدار کی پاسداری ہوتی ہے۔ یہ سب عناصر تقریباً ہر کہانی میں اوپر نیچے شامل ہوتے ہیں۔ اب ہم نے ایسے کردار اور قصے ڈھونڈ لئے جو کتھک میں بروئے جا سکتے تھے۔ ان کا آہنگ تو انقلابی اور جمالیاتی قرار پایا اور اس کی فکر سیاسی اور سماجی کے ساتھ عوامی بصیرت سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر چہ یہ مشکل کام تھا لیکن اسے ہر حال میں کرنا تھا۔

ہم دونوں یہ چاہتے تھے کہ پاکستان اور ہندوستان کے لئے ہم دو تین شو ایسے تیار کر لیں جن کو دیکھنے کے لئے دونوں طرف کے لوگ ذہنی اور جذباتی طور پر تیار ہوں۔ گویا وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا ضروری تھا۔ یہ تجربہ اگر چہ دنیا کے تھیٹرز میں بہت پہلے سے ہو رہا تھا کہ گائیکی، شاعری اور رقص کے ساتھ ڈرامائی ادائیگی شامل ہو کر جو تاثر پیدا کر سکتے ہیں وہ دنیا کے کسی اور فن میں ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہم ان سب کو استعمال کرنے کے لئے اپنی ٹیم بنا چکے تھے۔ اب ہم نے ریہرسل شروع کر دی تھی کہ ایک شام طیفا بٹ میرے اخبار کے مالک کو لے کر ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔ پہلے تو میرے حلیے کو دیکھ کر پہچان نہ پایا کہ میں نے

داڑھی اور بال بڑھا رکھے تھے اور پونی بنائی ہوئی تھی۔ پھر جب وہ پہچان گئے تو گلے شکوے ہوئے کہ میں کہاں جا چکا ہوں۔

اب انہوں نے پورے لاہوری پروٹوکول میں مجھے اپنا پیغام دیا جو یہ تھا کہ بھائی صاحب آپ کے انقلابی ہونے اور آپ کے مارشل لاء کے خلاف قربانی دینے کا حاصل حصول کیا ہے؟ میں نے جواب دیا ''مجھے کچھ حاصل ہی نہیں کرنا کہ یہ سب حادثاتی تھا کہ میں اس فلائٹ سے یہاں آ گیا۔ بصورت دیگر میں دنیا میں ہی نہ ہوتا۔ میں کب کا مٹ چکا ہوتا۔ شاہی قلعے کی دیواروں میں میری چیخیں دفن ہو چکی ہوتیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ ہوتا میری کوئی قبر بھی تھی کہ نہیں۔ میں ایک گمنام شہید ہوتا یا نہ ہوتا۔''

''نہ جی آپ ہمارے مائی باپ ہو جی۔ بی بی صاحبہ کی حکومت آنے والی ہے۔ ادھر میرے ریسٹورنٹ میں ان کا کھانا ہوا تھا۔ میرے پاس تصویر ہے جناب۔ تو آپ سفارش کر دیں گے تو مجھے امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس تو اس کے لئے مشکل ہی نہیں ہے اور کچھ پراپرٹی پڑی ہے اسے شہر کی حدود میں لانے کے لئے تھوڑا جگاڑ چاہیے۔ ہم سیوا کر دیں گے پارٹی فنڈ کے لئے۔'' یہ طیفا بٹ بول رہا تھا۔

اب میں سمجھ گیا کہ بی بی کی حکومت آئی نہیں ہے کہ قربانیوں کا پھل کھانے والے اس کی حکومت کو کرپشن کا تڑکا لگانے کے لئے جوق در جوق پہنچ رہے ہوں گے۔ ایسے کئی طیفا بٹ پاکستان میں قربانیوں کی دکانیں اور دفتر کھول چکے ہوں گے۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ضیاء الحق کے دور ہی کی توسیع تھی کہ اس نے پاکستانی سیاست اور سماج میں کرپشن اور برادری سسٹم کے ساتھ سیاست میں غیر نظریاتی اور مفاد پرستی کے بیج بو دیئے تھے۔ میں نے طیفا بٹ سے کہا ''میں پاکستان جاؤں گا تو ضرور آپ کے لئے کوشش کروں گا۔'' یہ میں نے اس لئے کہہ دیا تھا کہ مجھے معلوم تھا طیفا بٹ کسی منطق یا سیاسی بصیرت پر مبنی کسی بات کو نہیں مانے گا۔

''تو سر جی کب جائیں گے۔ آج ہی ٹکٹ کٹائیں ناں۔ ادھر تو سنا ہے قربانیوں کی لائن لگ گئی ہے۔ آپ کو بھی لائن میں لگنا ہے۔ میں ٹکٹ کٹا دیتا ہوں۔''

اب میں نے بات بنائی کہ مجھے معلوم تھا اس بات کو بہت چالاکی سے طے کرنا ہے۔

''بٹ صاحب! ہم کوئی معمولی جوتیاں کھانے والے ورکر نہیں ہیں۔ شاہی قلعے سے سیدھے فلائٹ میں بیٹھے ہیں اور ادھر بی بی صاحبہ کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم نے اگر لائن میں لگ کے کام کرانے ہوں تو پھر قربانی کیسی؟ چھوڑیں صاحب بس کام بتائیں اور اس کے کاغذات تیار کرائیں۔''

''لو جی میں نہ کہتا تھا اپنا شہزادہ ہے، جیتا ہے، کیا بات ہے، سمجھو کہ کام ہو گیا، اشکے بھئی اپنے کو پورا یقین تھا کہ آپ ہم کو مایوس نہیں کرو گے۔''

''بٹ صاحب بات یہ ہے کہ مجھے تو بی بی کی حکومت سے لینا کچھ نہیں، بس دوستوں کے لئے کچھ مل جائے تو قربانی کا پھل سمجھو مل گیا۔''

''لو جی اپنا تو سمجھو کاروبار سیٹ ہو گیا۔''

اب میرے اخبار کے مالک نے چونچ کھولی:

''او جی میرے اخبار نے بی بی صاحب کی کمپین چلائی اور آپ نے تو ایسا پورے یورپ میں ان کی جے جے کار کرادی اور پھر وہ پاکستان جا سکیں۔''

''لیکن آپ نے بہت مال بھی تو بنایا۔ کیسے اشتہاروں کی بارش ہوئی تھی۔'' میں نے اس کو باور کرادیا کہ آپ نے منافع کمایا تھا اس سے۔

''ہاں جی یہ تو سب آپ کی پلاننگ تھی، گیم تو آپ نے کی تھی۔''

''اب آپ بی بی صاحبہ سے کیا لینا چاہتے ہیں۔''

''او جی ہم تو سیوا کرنے والے لوگ ہیں۔ پاکستان جا کر اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کوئی بلڈنگ سرکاری ریٹ پر مل جائے یا پارٹی کے نام پر کوئی جگہ مل جائے تو اخبار تو پارٹی کا ہوگا۔ باقی کام ہم کر لیں گے۔ آپ ساتھ ہوں گے تو ففٹی ففٹی کے پارٹنر بن جائیں گے اور اس طرح سرکاری اشتہارات اور پارٹی کی خدمات کے عوض ادھر اپنا ٹھہکا شہکا بنا رہے گا۔''

میں بات سمجھ چکا تھا کہ ان کا لمبا پروگرام ہے پاکستان میں مفادات کے ایک نئے کلچر کو متعارف کرانے کا۔ یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ میں شامل ہوتا یا نہ ہوتا مجھے تو شامل نہیں ہونا تھا اس لئے میں نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا ''آپ بے فکر ہو جائیں، پاکستان پہنچ رہا ہوں، بی بی کی حکومت آنے دیں۔ پھر سب حساب کتاب دیکھ لیں گے۔''

''آپ کا نمبر پتہ، کچھ تو دیں ناں۔'' یہ طیفا بٹ تھا۔

''کمال ہے بٹ صاحب نمبرز تو آپ کو مل جائیں گے، باقی میرا پتہ تو آپ کو پرائم منسٹر ہاؤس سے ہی ملے گا۔ میں تو ادھر ہی ملوں گا سب کو۔''

''لو جی میں نہ کہتا تھا اب اپنا تو شہزادہ پہنچ گیا پی ایم ہاؤس۔''

''ہاں سئیں یہ میرے لندن کے نمبرز ہیں اور یہ پاکستان کے۔ آپ رکھ لیں۔ پاکستان کے نمبر ابھی نہیں ہوں گے۔ جب میں پہنچوں گا تو کام کریں گے۔''

''لو جی بہہ جا بہہ جا ہو گئی کہ...... مطلب کہ آپ ڈھونڈ کے ادھر پہنچے ہیں۔''

اب میں نے ان کو باہر کا راستہ ایسے دکھایا۔

''یہ ایک دوست کا اپارٹمنٹ ہے، میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔''

''او ناں جی خدمت تو ہم آپ کی کریں گے، اپنے دوست اور بلکہ دوستوں کو لے کر ریسٹورنٹ آئیں۔ کمال کی کڑاہی مکھن ڈال کے ہاتھ سے بناؤں گا۔ اور آپ نے میرے کھانے تو کھائے ہیں۔ پارٹی ہو جائے، ڈرنکس بھی لگاؤں گا۔ جو آپ آرڈر کریں گے۔''

''کوئی بات نہیں، میں اطلاع کر کے آؤں گا۔''

''اور میرے اخبار کے دفتر میں بھی بہت جگہ ہے پارٹی کرتے ہیں۔ بلائیں سب جلاوطنوں کو۔''

''نہیں وہ تو دور رہتے ہیں، آپ ہی بٹ صاحب کے ہاں آ جائیں تو ایک بار ہی پارٹی کر لیں گے۔''

''ہاں ہاں آپ بھی میرے ریسٹورنٹ آ جائیں، مل کے کر لیں گے۔''

اس کے بعد وہ چلے گئے تو دیپتی جو یہ سب سن رہی تھی، آ گئی اور اس نے میرے گلے لگ کر میری ذہانت کی داد دی کہ خواہشوں کو کبھی روکنا نہیں چاہئے۔ انہیں راستہ دینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کوئی خواہش پوری ہو جائے اور وہ آپ کے حصے میں شمار ہو جائے۔ میں نے جو کیا وہ فوری حکمت کا تقاضا تھا۔ نہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ابھی آئی تھی نہ کوئی اس حکومت کی جدلیات جانتا تھا۔ سب خواہشوں کی بدولت ایک محل تھا جو تعمیر ہو رہا تھا لیکن اس سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ بی بی کی حکومت کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں ایک معمولی شاعر تھا، قربانیوں کی قطار میں لگے ایسے ایسے جیالے ورکروں سے لے کر چاروں صوبوں کے جاگیردار، صنعت کار، جغادری سیاست دان اور صحافت کی دنیا کے ایسے ایسے چاند تھے جن کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا تھا کہ گہن کی تاریخوں میں وہ اپنی پارٹی بدل لیا کرتے تھے۔ ایسے میں میری کیا اوقات ہو سکتی تھی اس لئے مجھے اس وادیٔ پرخار میں قدم ہی نہیں رکھنا تھا۔ ویسے بھی میں نے اپنی زندگی کا رخ ہی بدل لیا تھا۔ یہ دو معصوم کردار تو زندگی میں آتے رہتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں آنے والے سالوں میں کامیابی کی سیڑھیاں میرے بغیر طے کر لیں گے یا تھک کر گر جائیں گے لیکن یہ امکان ضرور تھا کہ یہ زندگی کے کسی

موڑ پر ترقی کے زینے پر کھڑے ہو کر میرا منہ چڑا رہے ہوں گے کہ بھائی تو ہمیں چھوڑ گیا تھا، اب دیکھو ہم نے اپنا راستہ خود تلاش کر لیا۔

میں تو کسی بھی طرح سے پاکستان میں اپنا مستقبل تلاش نہیں کر رہا تھا۔ میرے رشتے تو ختم ہو چکے تھے۔ بہن بھائی اور ماں باپ تھے تو سہی مگر مجھے رو پیٹ بیٹھے تھے۔ میں ان کے پاس جبیں جھاڑ کے چلا بھی جاتا تو ان کے لئے ایک ناکام آدمی تھا۔ وہ میرا اچار ڈالتے۔ اس لئے دیپتی کے ساتھ میں نے اپنے شاعری کے فن کو وابستہ کر لیا تھا۔ اب جو پاکستان اور انڈیا جا کر ہم شو کرنا چاہتے تھے وہ ایک سیکولر اور غیر شخصی اظہار تھا۔ جس میں میرا کوئی تعلق پاکستان سے نہیں بننا چاہئے تھا۔ میں لندن میں رہنے والا ایک شاعر تھا۔ نسبتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو میں ایک بے وطن شاعر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنا وطن گم کر بیٹھا تھا یا وطن نے مجھے گم کر دیا تھا۔ میری جیب میں کسی وطن کا سکہ نہیں تھا لیکن کوئی شناخت تو ہونی چاہئے تھی۔ وہ تو پاکستان ہی کی تھی۔ اس شناخت کے بغیر زندہ رہنا مشکل تھا۔ میں نے پاکستانی پاسپورٹ لے لیا اور پھر دیپتی کے ساتھ مل کے جو پروجیکٹ ہم نے تیار کیا وہ کتھک کے تمام بھید بھاؤ پاکستان کی کہانی میں ہم نے ایسے پروئے کہ ایک ایسی رزمیہ کہانی سامنے آ گئی جو اس وقت کے سیاسی اور عالمی منظرنامے سے مطابقت رکھتی تھی۔ ہم نے تجربہ، علامت، سرئیلزم اور ڈرامائی آرٹ کا سہارا لے کر یہ رزمیہ تیار کیا تاکہ کوئی بات بھی نعرہ نہ بن سکے اور نہ ہی یہ محسوس ہوا کہ ہم سیاسی چورن بیچنے آئے ہیں۔ دیپتی کو بنگال کے سارے اسالیب یاد تھے اور میں نے دیومالائی کہانیوں اور نظموں سے لے کر غلام قوموں کے مزاحمتی کرداروں کا سہارا لے کر ایسا رزمیہ تیار کیا کہ پاکستان کے حالات خود بخود اس استعارے میں ڈھل جائیں۔

دیپتی کے چونکہ ہندوستانی تھیٹر کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لئے میرے پاکستانی شاعر ہونے کو اس نے نمایاں رکھا کہ تھیٹر دیکھنے والوں کے لئے میں یقیناً ایک دلچسپی کا حوالہ بن سکتا تھا۔ یہ شو چار شہروں کے لئے ہم نے بڑے آڈیٹوریم میں کرنے کے لئے رابطے کئے اور دیپتی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ شہر دہلی، بنگلور، کلکتہ اور بمبئی تھے۔ اصل مسئلہ میرے ویزے کا تھا۔ اس کے لئے دیپتی نے اپنے انگلستان میں قیام اور اپنی کمپنی کو بہتر طریقے سے استعمال کیا۔ میں اس کی کمپنی کا ایک ملازم تھا جس کی ساری ذمہ داری کمپنی کی تھی۔ میں اب پاکستانی نہیں تھا، پاکستانی نژاد تھا۔ کبھی کبھی سفارت خانوں میں باذوق لوگ بھی اعلیٰ عہدوں پر آ جاتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی شاعری اور آرٹ کو جاننے والا ویزہ افسر بیٹھا تھا کہ میرا ویزہ لگ گیا۔ اب ہم اپنی ٹیم لے کر جا سکتے تھے۔ ہمارا پہلا شو دہلی میں تھا جس کی اچھی خاصی پبلسٹی

وہاں ہو چکی تھی۔ ناٹک گھر اور ناٹک اکادمی والے خاص طور پر اس پروجیکٹ کے لئے مہنگی سے مہنگی ٹکٹیں رکھنے کے حق میں تھے کہ یہ عوامی اظہار نہیں تھا۔ اس کے لئے جو اخباروں میں خبریں نکلیں یا ریویو سے پہلے کی رائے سامنے آئی اس نے اس شو کو بہت بڑے باذوق اور انٹلیکچوئل طبقے میں اتنا مقبول کر دیا کہ دہلی میں ایک ہفتے کی ایڈوانس بکنگ ہو چکی تھی۔ اس میں سارا کمال دیپتی کے کتھک کا تھا کہ وہ پہلے سے وہاں موجود بھی تھی اور اس کے نقاد بھی موجود تھے۔ اِن شوز کا نام ہم نے رکھا تھا ''کتھا کی کتھا'' یہ عنوان اتنا بامعنی ثابت ہوا کہ شو کے دن بہت پہلے سے لائنیں لگ چکی تھیں۔ دہلی اور تھیٹر کا دستور تھا کہ تھیٹر وقت پر شروع ہو گا۔ دہلی میں سالوں پرانا ''نیشنل سکول آف ڈرامہ'' موجود تھا۔ اس نے ہمارے اس شو کی میزبانی قبول کی تھی جس کی وجہ سے مجھے ویزا ملا تھا کہ یہ سکول ہندوستانی قومی اسمبلی سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہے۔

اب میں کچھ ڈرا ہوا تھا کہ میری پرفارمنس تو شاعری کی تھی اور شاعری کی وہاں کیا حیثیت ہو گی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے کچھ لفظ ہندی کے ضرور ٹانکے تھے لیکن میری شاعری کو سمجھنے والے وہاں سو فیصد لوگ موجود تھے کہ ہر اچھے مصرعے پر داد آ رہی تھی۔ ویسے بھی خاموشی میں اور اچھی موسیقی کے ساتھ جب کوئی مصرعہ آتا تھا اور دیپتی اس کے حساب سے کتھک کا سر لگاتی تھی تو ہال ایک لمحے میں چھک اٹھتا تھا۔ دہلی کے لوگوں کے ذوق نے مجھے اس شام بے حد متاثر کیا۔ وہ میری شاعری میں ذوالفقار علی بھٹو کی آواز سن رہے تھے۔ وہ میری شاعری میں بے نظیر کے پاؤں کی دھمک محسوس کر رہے تھے۔ وہ میری شاعری میں فیض احمد فیض کو محسوس کر رہے تھے۔ پاکستانی عوام کی بے بسی اور جدوجہد کے آثار کو وہ نہ صرف ہر مصرعے میں محسوس کر رہے تھے بلکہ پوری طاقت کو بھی سمجھ رہے تھے۔ میں نے یہ تجربہ کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اب محض شاعر نہیں رہا تھا، ایک پرفارمر بن چکا تھا۔ یہ دہلی تھا اور میں پاکستانی شاعر جسے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ہم نے اسے پبلسٹی میں شامل نہیں کیا تھا تا کہ کوئی سیاسی تنازع کھڑا نہ ہو جائے۔ جب پردہ گرا اور پھر اٹھا تو میں اور دیپتی نے جُھک کے آداب کیا۔ تالیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ محسوس ہوا کہ سیاسی پیغام پہنچ گیا ہے اور پاکستان کے حالات پر دہلی والے افسردہ بھی ہیں اور ان کے ساتھ یکجہتی کا بھی مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب جو بیک سٹیج پر ہم گئے تو تانتا بندھ گیا جسے دیکھو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ تھیٹر کی انتظامیہ نے بہت کوشش کی کہ مجھ تک کوئی نہ آ سکے مگر وہ کیا روکتے، کیسے روکتے۔ دیپتی اور میں تھک کر گرین روم میں بیٹھ گئے۔ کسی نے چائے کا کپ مجھے پکڑا دیا اور میں نے سانس لیا کہ پاکستانی لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص

داخل ہوا۔ پاکستانی لباس سے میرا مطلب وہ لباس تھا جسے ضیاء الحق نے رائج کیا تھا۔ شلوار قمیص اور اوپر واسکٹ اور جیب میں زنجیر والی گھڑی۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا مل لو بھائی موجود ہوں۔

اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے سرکاری کارڈ بھی میرے حوالے کیا جسے میں نے پڑھا تو اس سے معلوم ہوا کہ پاکستان ہائی کمیشن کے کلچرل اتاشی مسٹر فلاں میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں جان گیا کہ ماجرا کیا ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا ''جی فرمائیں۔''

''میں نے آپ کا پروگرام دیکھا ہے اور اس پروگرام کی خاص طور پر آپ کے نام کی وجہ سے پورے پریس میں گونج تھی اور میں سرکاری ڈیوٹی نبھانے آیا تھا۔ مجھے رپورٹ فائل کرنی ہے۔''

''تو آپ نے کیا محسوس کیا۔''

''جو آپ کہنا چاہتے تھے، پوری مہارت سے کہہ گئے ہیں اور دہلی کے لوگوں خاص طور پر رائٹرز اور پڑھے لکھے باشعور طبقے نے اسے پوری تفہیم سے محسوس کیا ہے اور میں بھی سمجھ گیا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر آپ لکھ دیں جو لکھنا ہے۔''

''نہیں میں یہ کہنے نہیں آیا۔ میں نے آپ کے اس پروگرام کو بہت پسند کیا ہے۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم رہا ہوں۔ میں استعارے، علامت اور سرئیلزم کو سمجھتا ہوں۔ آپ کو داد دینے آیا ہوں۔ میں آپ کے متعلق پوری معلومات لے کر آیا تھا۔ انڈیا میں آپ جو بھی شو کریں گے ہائی کمیشن اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔ ہم سرکاری ملازم ضرور ہیں لیکن ہمارا دل بھی ہوتا ہے، ضمیر بھی ہوتا ہے اور دماغ بھی۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ صرف اس بات کا جو میں کہنا چاہتا تھا وہ پاکستان اور ہندوستان کے سوچنے والوں تک پہنچ گیا ہے۔ دلچسپی اور مجھے اندازہ تھا کہ ہم جن ناظرین تک جا رہے ہیں وہ عام لوگ نہیں ہوں گے۔ وہ ان فنون کو جاننے والے ہوں گے۔ ویسے بھی ہندوستان میں تھیٹر کی ایک پرانی روایت بہت مضبوطی سے چلی آ رہی تھی۔ اب میں نے ان صاحب کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا ''میں آپ کے ساتھ پورے ہندوستان میں سرکاری طور پر سفر کروں گا کہ یہ میرے فرائض میں شامل ہے اور مجھے خوشی ہے کہ پہلی بار مجھے یہ سرکاری فرض سونپا گیا ہے ورنہ تو ہم دفتر میں مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ ویسے ہندوستان

میں صفائی زیادہ ہے، مکھیاں بھی مارنے کو نہیں ملتیں۔''

اب میں سمجھا کہ آنے والے پروگراموں میں بھی یہ صاحب میری نگرانی پر تعینات ہوں گے۔ اگلے روز اخباروں کو دیکھا تو محسوس ہوا ہندوستان کے ہر انگریزی اخبار میں تھیٹر پر تبصرہ کرنے والے صحافی الگ سے موجود ہوتے ہیں اور انہوں نے بہت بڑھ چڑھ کر اس کی تعریف میں لکھا تھا۔ یہ ضیاء الحق سے ان کی نفرت کا اظہار تھا یا بھٹو صاحب کی مقبولیت تھی یا ہمارا کوئی فن کارانہ اظہار تھا البتہ دیپتی نے اس کا تمام تر کریڈٹ مجھے دے دیا کہ اگر میں پاکستانی شاعر نہ ہوتا اور میرا ایک ماضی نہ ہوتا تو یہاں کے پریس اور نقادوں کو متوجہ کرنا ناممکن تھا کہ کتھک تماشا تو سارا سال چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ جو پاکستانی شاعری نے اس کتھا کو سو طرح کی کتھاؤں میں بدل دیا ہے یہ ہم دونوں کا ملاپ تھا۔

ہم بنگلور گئے۔ وہاں کا تھیٹر ہال دہلی سے بہت بڑا تھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا۔ سنا یہ بھی کہ سارے ٹکٹ کئی دن پہلے بک چکے تھے۔ اس بات سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ شہر تعلیم، تہذیب، تجارت اور تمدن میں پورے ہندوستان کا چہرہ سمجھا جاتا تھا۔ میں نے ایسے ناظرین نہ دیکھے نہ کبھی دیکھ سکوں گا۔ اتنی مہنگی ٹکٹ کی ایک ایک پائی وہ وصول کرنا چاہتے تھے اس لئے مکمل خاموشی میں انہوں نے صرف ان جگہوں پر تالیوں سے داد دی جو ہمیں معلوم تھا کہ داد کی صحیح جگہ ہے۔ میں شاعری کی ادائیگی بے حد درست اور واضح اردو میں کرتا تھا۔ جس کا بہت اثر سننے والوں پر پڑتا تھا۔ یہ اردو زبان کی تاثیر تھی جس کا فائدہ مجھے مل رہا تھا۔ نہ میں کبھی سٹیج اداکار رہا تھا نہ میں کوئی صداکار تھا۔ محض ایک پرفارمر ہی کہا جاسکتا ہے جو اپنی شاعری کی ادائیگی میں جانتا تھا کہ کہاں رکنا ہے اور کتنی دیر رکنا ہے اور کب کس ردھم میں مصرعہ بڑھانا ہے۔ اب یہ فن بھی کوئی آسان تو تھا نہیں اور پھر اس کی بنیاد پر دیپتی نے کتھک کے بھید بھاؤ ترتیب دے رکھے تھے۔ یہ سارا کام اس آرکسٹرائزیشن کا تھا جو تین شعبے مل کر ڈیزائن کر رہے تھے رقص، موسیقی اور شاعری۔ دنیا کے تھیٹر میں یہ تین عناصر تو بنیاد بنتے ہیں، اس کے بعد ڈرامہ، ادائیگی اور اداکاری کی دنیا کا کھیل آتا ہے۔ بنگلور میں ہمارے لئے بہت اعلیٰ ہوٹل میں رہائش کا انتظام تھا اور اگلے روز سوال جواب کا ایک پروگرام تھا جس میں تمام انٹی لیکچوئل، ڈرامے کے لوگ اور صحافی شریک تھے۔ یہاں سب سے زیادہ سوال ظاہر ہے مجھ پر ہوئے اور مجھے معلوم تھا مجھ پر پاکستانی ہائی کمیشن نے نظر رکھی ہوئی ہے۔ ہر صحافی اور نقاد ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف، فوج کے خلاف اور پاکستان کے قیام کے تجربے کے خلاف مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہاں میرے لئے منافقت کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے سچ

بھی بولنا تھا اور خود کو بھی بچانا تھا۔ باریک تار پر چلنے کا عمل تھا۔ ایسے ایسے چبھتے ہوئے سوال آئے کہ میں ان کی کسک کو اپنے اندر جذب کر گیا۔ کبھی کبھی میں نے سوال ان کی طرف پلٹا دیا۔ کبھی میں نے صرف سوال کا جواب سوال میں دیا۔ کبھی میں نے محض ایک دو لفظ بول کے سوال روک دیا۔ وہ سب جان چکے تھے کہ میرے اندر جو باتیں ہیں وہ مجھے بولنے پر مجبور کر رہی ہیں لیکن میں بول نہیں سکتا۔ سب سے بڑا دفاع تو یہ تھا کہ مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا تھا۔ مطلب نکالنا آپ کا کام ہے۔ بس یہ نسخہ کام کر گیا۔ اب میں کلکتہ کے لئے سوچ رہا تھا کہ وہ تو تھیٹر اور دانش کا علاقہ ہے۔ وہاں لوگ کیسے اس پرفارمنس کو لیں گے۔ اب دیپتی کو جو طاقت اس کے اپنے ملک میں مل رہی تھی، تو وہ بے حد خوش تھی کہ میں اسے کیسے ملا اور کیسے ہم قریب آئے۔ یہ سب وہ لمحے تھے جو ہم جینا چاہ رہے تھے مگر جینے کے لئے سے بہت مختصر لگ رہا تھا۔ ہم دونوں یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر دشمن نہ ہوتا تو ہم کیسے اپنا کام کر سکتے تھے۔ ایک دشمن بلکہ مضبوط دشمن کا ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے، کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔ جب تک اس کا دشمن بڑا نہ ہو۔ دعا دینی چاہئے دشمن کو جو ہمیں بڑا بنا دیتا ہے۔ قدر کرنی چاہئے دشمن کی کہ جو ہمیں بڑا بنا دیتا ہے۔ سارے رزمیے بڑے دشمنوں کی وجہ سے بڑے بنے ہیں۔ دیپتی سے میں نے کہا ''ہمیں خود کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے نئے دشمن تخلیق کرنے پڑیں گے۔ ہمیں زندگی چاہئے تو دشمن تلاش کرنے پڑیں گے چاہے وہ دشمن تاریخ سے تلاش کریں یا وہ محض خیالوں سے تخلیق کریں، کرنے تو ہوں گے۔ دنیا نے تاریخ سے دشمن تلاش کئے ہیں اور تاریخ ایک ایسا کنواں ہے جس کی گونج ہی کافی ہوتی ہے کسی بھی فنونِ لطیفہ کے اظہار کے لئے۔''

اب ہمارا اگلا پڑاؤ بمبئی تھا۔ بمبئی 1988ء...... میرے لئے بمبئی کوئی انوکھی بستی نہیں تھا کہ میں اردو فکشن میں بمبئی کا جغرافیہ اور سماجی ماحول دیکھ چکا تھا۔ منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، کیفی اعظمی، میرا جی، علی سردار جعفری سب کو پڑھتے ہوئے بمبئی میرے اندر جیتا جاگتا سامنے آجاتا تھا۔ آج میں بمبئی پہنچا تو میں نے دیپتی سے کہا ہمارا قیام تو بڑے ہوٹل میں ہے مگر مجھے کچھ جگہیں دیکھنی ہیں، جوہو باندرہ، اندھیری، چوپاٹی اور حاجی علی کی درگاہ...... یہ بچے کا ایسا مطالبہ تھا جسے ماما فوراً پورا کر دیتی ہے۔ میرے لئے دیپتی ماما بھی تھی اور میری محبت بھی تھی اور میری دوست بھی تھی۔ ہم نے بھرپور دن گزارا اور ایک دن ہم نے ہوٹل میں آرام کیا اور میں نے دیپتی سے پوچھا ''کیا میں صرف تمہارے تھیٹر کا ایک کردار ہوں یا تمہاری زندگی کا کردار۔''

اس نے مجھے دیکھا اور جواب نہیں دیا۔ بس میرے گلے لگ کر میری سانسوں میں اپنی سانسلیں

شامل کرلیں۔ مجھے جواب مل گیا تھا۔

یہاں ہمیں نہیں پتہ تھا ہمارے شو کو کیسی پذیرائی ملے گی کہ ہم نے دو دنوں سے اخبار ہی نہیں دیکھے تھے۔ شو کے دن ہماری تیاری بہت ضروری تھی۔ آڈیٹوریم میں ریہرسل صبح سے دوپہر تک جاری رہی اور پھر ہم نے شام کے شو تک اپنے حواس سنبھالے۔ مجھے بمبئی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، نہ کچھ سنا تھا۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں کو جانتا تھا مگر وہ مجھے کیوں جانتے ہوں گے۔ اتنا معلوم تھا کہ تھیٹر وہاں روزانہ کی بنیاد پر ہر شام کو مخصوص تھیٹر ہالز میں دکھایا جاتا ہے اور اس کے مخصوص ناظرین ہیں۔ اسی طرح بعض جگہوں پر دعوت ناموں کے ساتھ رقص اور موسیقی کے پروگرام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اب چونکہ ہمارے شو کی انڈیا میں تشہیر ہو چکی تھی اور تبصرے بھی شائع ہو چکے تھے، اس لئے امید تھی کہ اس تجربے کو یہاں پذیرائی ضرور ملے گی۔ اتنا معلوم تھا کہ پورا شو بک چکا ہے بلکہ بہت دن پہلے سے بکنگ بند کی جا چکی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک اور شو بھی اگلے روز ہم نے پرفارم کرنے کا معاہدہ کرلیا تھا۔

دو گھنٹے پہلے ہم آڈیٹوریم میں تھے۔ یہ پہلا شو تھا۔ ہمارے میوزیشنز بہت پروفیشنل تھے اور ہندوستان میں پہلے بھی پرفارم کر چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ باذوق خاندانوں کی دلچسپی کن پہلوؤں میں ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے محض اپنی آواز اور شاعری کے لحن پر ہی توجہ رکھنی تھی اور جب کوئی بھی شاعر اپنی شاعری پڑھتا ہے تو اسے ناظرین ہی اپنی داد سے سکھا دیتے ہیں کہ اسے کس طرح پڑھنا چاہئے۔ سو میں اس مرحلے سے کب کا گزر چکا تھا۔ اب ہم سب نے کتھک کے ساتھ ہر شے کو ردھم کر دیا تو پھر بھی بے چینی تھی کہ یہ بمبئی ہے۔ فلمی دنیا کا شہر ہے۔ مصنوعی اور ملمع سازی کی کائنات ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں پیسہ بولتا ہو وہاں انسانیت خاموش ہو جاتی ہے۔ وہاں روح کی آواز دب جایا کرتی ہے۔ میں کیا دیپتی بھی ڈری ہوئی تھی کہ یہ تجربہ یہاں کیا گل کھلائے گا؟

وقت پر ہال بھر چکا تھا۔ دستور تھا کہ عین وقت پر گھنٹیاں بج جاتی تھیں۔ دروازے بند کر دیئے جاتے تھے، پردہ اٹھا دیا جاتا تھا۔ یہاں بھی دیکھنے والے دو وجہ سے آئے تھے۔ دیپتی کے کلاسیکی کتھک رقص میں شامل کہانی کے ڈرامائی موڑ اور رقص کی باریکیاں اور میری شاعری میں شامل مزاحمت کا خروش جس میں قوموں کے زوال کی آہٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ اس وقت کے بمبئی کے طرزِ احساس میں گدگدی پیدا کرنے کے لئے یہ باتیں کافی تھیں۔ اب ہمارے میوزیشنز نے پہلے تو سماں باندھا، جیسا کہ رواج ہے کہ موسیقی سماں کو پیدا کرتی ہے۔ دیکھنے والوں کو تیار کرتی ہے کہ وہ آنے والے جادو کو سمجھنے کے لئے تیار ہو

جائیں۔ موسیقی کے اس حصے نے ایسا سماں باندھا کہ اگر کسی کو چھینک بھی آ رہی ہو تو وہ اسے ایسے دبائے کہ سانس بھی رک جائے تو مہنگا سودا نہیں۔ ایسے میں ناظرین کو ایک دوسرے کی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں دیپتی اٹھی، اس نے ایک قدم اٹھایا۔ ایڑی کو زمین پر ٹکایا، لوگوں کی سانس اندر کی اندر، باہر کی باہر رہ گئی۔ تب اس نے ایڑی کو حرکت دیئے بغیر جسم کو حرکت دی۔ ایڑی وہیں رہی مگر وہ کہیں اور تھی۔ اس کمال کے بعد میری آواز گونجی مگر ستار ساتھ میں میری مدد کو آیا۔ پھر دیپتی کا کمال شروع ہوا۔ کہانی شروع ہوگئی۔ تالیوں نے بتایا کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور دیپتی کہاں ہے۔ درحقیقت میری ساری طاقت دیپتی کے پاؤں پر تھی۔ دیپتی کہتی تھی اس کی ساری طاقت میری شاعری میں تھی۔ اس امتزاج کا استعمال قدرتی طور پر موزوں ہوا یا فنونِ لطیفہ میں اس طرح کے امتزاج ہوتے رہتے ہیں۔ پوری کہانی ہم دونوں بیان کر رہے تھے اور کہانی کے اندر کی کہانی بھی سب محسوس کر رہے تھے۔

جب پردہ گر گیا تو تالیوں کی گونج نے تھیٹر ہال کو اپنے اندر چھپا لیا۔ پھر جو پردہ ہٹا اور ہم سب ناظرین کے سامنے پیش ہوئے تو تالیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا یا میرے مولا یہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کا کمال ہے یا دنیا میں ہونے والے ظلم کے خلاف ان تالیوں کا احتجاج ہے۔ پردہ دوبارہ اٹھا اور سٹیج پر ہم نے اپنے دیکھنے والوں کو جھک کر آداب کیا تو پھر پورے ہال میں سب نے کھڑے ہو کر داد دی اور جب ہم بیک سٹیج میک اپ اور لباس تبدیل کرنے والے حصے میں آئے تو گارڈ کو دھکیلتے ہوئے ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ بلیک اور مہرون رنگوں کی بہت قیمتی ساڑھے میں بہت خوبصورت اور کسی بڑے گھرانے کی لگ رہی تھی۔ بڑے ادب سے معذرت کے ساتھ کہنے لگی ''میں نے تھوڑی سی زیادتی کی ہے۔ یہ وقت آپ کی پرائیویسی کا ہے۔ مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ چند لمحے اگر مل جاتے تو۔''

''ہاں ہاں آپ کو دیپتی سے ملنا ہے یا مجھ سے۔''

''آپ سے جی۔''

''جی تو بیٹھیں۔'' ایک سٹول پر وہ بیٹھ گئی۔ نین نقش ابھرتے ہوئے شوخ تھے۔ میں بھی سامنے بیٹھ گیا۔ دیپتی ساتھ کے گرین روم میں تھی۔ میں نے ہی بات شروع کی:

''آپ کہاں سے ہیں؟ اور آپ کو شو پسند آیا؟''

''جی میں آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ کبھی میں بھی شاعری کرتی تھی۔ اب تو زمانہ ہوا بھول گئی ہوں۔ کالج اور یونیورسٹی میں لڑکوں سے مقابلہ ہوا کرتا تھا۔''

''آپ کا تعارف......پلیز......آپ؟''

''میں نے ماسٹرز کیا تھا انٹرنیشنل ریلیشنز میں۔ میرے والد آئی سی ایس آفیسر تھے لیکن جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں تو میں طوائف ہوں۔ I mean prostitute۔''

میں فوری طور پر سنبھل نہ پایا کہ ماجرا کیا ہے اور مجھ سے کیوں ملنے آئی ہیں۔

''آپ لگتی نہیں کہ طوائف ہوں گی۔''

''حیران ہو گئے ناں۔ ایسے ہی میں بھی حیران ہوئی تھی جب ایک خوبصورت لڑکے نے مجھے یونیورسٹی میں محبت کی رامائن پڑھائی تھی۔ میں نے پڑھ لی تھی۔ بس ماری گئی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ مجھ پر ترس نہ کھانا۔ میں بمبئی کو انگلیوں پر نچاتی ہوں۔ اپنی پسند اور مرضی سے مرد کا انتخاب کرتی ہوں۔ تمہارے منٹو والی طوائف سوگندھی نہیں ہوں جسے ایک سیٹھ تھوک کے چلا جاتا ہے۔''

اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ مجھ سے کیوں ملنے آئی ہے۔ میں بھی ایسا شاعر ہوں جو بہادری سے ظلم کے خلاف مزاحمتی شاعری کر رہا ہے اور یہ بھی اپنے جسم کے ذریعے پوری سوسائٹی کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے۔

''تو آپ کس طرح طوائف بنیں۔ I mean prostitute۔''

''طوائف بننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ شلوار، لہنگا، پشواز، ساڑھی یا کچھ بھی جسم سے نیچے اتار دو اور پھر جو بھی کرو گے اس کے بعد کیا ہوگا؟ خود جان لو۔''

''نہیں۔ میرا مطلب تھا؟ اتنا پڑھ لکھ کر......اس طرف کیسے آئیں؟''

''مجھے پتہ تھا یہ پوچھو گے۔ مگر یہ بتاؤ بہت پڑھی ہوئی عورت کیا اپنی مرضی سے مرد کے ساتھ نہیں سو سکتی۔''

''نہیں، وہ سو سکتی ہے۔ مگر پیشہ......''

''تم شاعر لوگ بھی ناں۔ بس خیالوں میں عورت کے ساتھ سوتے سوتے آدھے نامرد ہو چکے ہوتے ہو۔''

''ہاں تو پھر بتاؤ......پیشہ کیسے بنا لیا۔''

''جس طرح ہر مرد دنیا کی تمام عورتوں کے ساتھ سیکس کرنا چاہتا ہے اسی طرح ہر عورت طوائف ہوتی ہے۔ موقع ملنے کی بات ہے یا قیمت لگنے کی بات ہے۔''

''قیمت عورت لگاتی ہے یا مرد۔''

''میرے جیسی عورتیں اپنی قیمت خود لگاتی ہیں۔ منٹو کی ''ہتک'' والی سوگندھی کی قیمت سیٹھ لگاتے ہیں۔ یہ جو پارلیمنٹ کی ممبر خواتین ہیں، یہ جو بالی وڈ کی سپر سٹارز ہیں، یہ جو فیشن کی دنیا کی مونالیزائیں ہیں، یہ جو ہائی فائی سوسائٹی کی بیویاں اور بیٹیاں ہیں یہ سب اپنی قیمتیں لگواتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کے گاہک میرے پاس آ کر ساری کہانی سنا جاتے ہیں۔ یہ جو بیگمات اور دنیا کو انگلیوں پر نچانے والی سیلی بریٹیز ہیں ان کی قیمتیں ڈالر کے ریٹ کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں۔ یہ اپنے جسم کا مینو کارڈ بدلتی رہتی ہیں۔''

''مثلاً۔''

''مثلاً کے لئے تیار ہو؟''

''ہاں تیار ہوں۔''

''پورا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

''ہو جانے دو۔''

''تو سنو! دو مینو کارڈ دکھاتی ہوں۔ الکحو لک، نان الکحو لک۔''

''الکحو لک دکھا دو۔''

''ناں ناں ناں۔ اس کے ریٹ کم ہوتے ہیں۔ سمجھو۔ جو بالکل ٹن ہو کے آتے ہیں انہیں کیا پتہ لگتا ہے آگا کیا ہے پیچھا کیا ہے۔ ہاں مگر ظالم کے بچے فارغ ہونے میں دقت کرتے ہیں۔''

''تو پھر ان کے ریٹ تو زیادہ ہونے چاہئیں۔''

''ایسی عورتیں اتنی چالاک ہوتی ہیں کہ ایسے مردوں کو منہ کے بل گرانا ان کے دائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے مگر نان الکحو لک تو کبھی کبھی ٹائم کا بہت نقصان کرتا ہے۔ بہت چالاک کوا ہوتا ہے۔''

''تو پھر کیا ریٹ لسٹ بنے گی۔''

''ارے ریٹ ہر رنڈی اور ہر پی ایچ ڈی پاس یا ہزار ایکڑ کے بنگلے کی طوائف کا الگ الگ ہوتا ہے۔''

''مگر ہر جسم کے حصے کے لئے جو الگ الگ ریٹ ہے وہ نہ بتاؤ مگر مینو کارڈ میں کس کس حصے کو ریٹ لسٹ میں لکھا جا سکتا ہے۔ مرد ہوا اتنا تو پتہ ہو گا۔''

''میں ان کے ریٹ نہیں پوچھوں گا۔سوال وہی ہے کہ آپ نے یہ پیشہ کیوں اپنایا۔''

''ارے ابھی اور کیا بتاؤں۔عورت کو کوئی بہکاتا ہے،اغواء کرتا ہے یا فریب دیتا ہے اور بس پھر عورت امراؤ جان ادا بن جاتی ہے۔ویسے غور سے سنو اگر امراؤ جان کو بچپن میں اغواء نہ کیا جاتا اور میری عمر میں فریب دے کر طوائف بنایا جاتا تو معاملہ آسانی سے نمٹ جاتا تھا۔وہ آپ کی طرح کا ناول نگار تھا، خوامخواہ بچی کے جذبات سے کھیل کے ناول مقبول کرالیا۔''

''کیا مطلب۔ناول مقبول کرالیا۔''

''شاعر صاحب! آپ کیا جانو طوائف کو اور اس کے کوٹھے کو۔جسم کو اور جذبات کو۔بس شاعری کرو۔جیسی ساحر لدھیانوی نے کی۔جیسی مجاز نے کی۔جیسی فیض نے کی۔ان سے پوچھا کبھی تم نے عورت کو دیکھا۔ننگا۔پورا ننگا۔کوئی جواب نہیں دے گا کہ سب اپنا ننگا پن بھی دنیا سے چھپاتے رہے۔سب نے پردے ڈالنے کا کام کیا۔میں آپ کو اپنی Breast دکھاتی ہوں کہ میرے نپل کو چوسنے کے لئے نوجوان پاگل ہوجاتے ہیں۔''

اس نے ساڑھی کا پلو سرکایا اور بلاؤز کے نیچے سے اپنی چھاتی نکال لی۔دودھیا رنگ کی چھاتی پر شہد کے رنگ کا ہالہ بنا ہوا تھا اور ایک نپل تھا۔میں گھبرایا نہیں۔اس نے کہا:

''نوجوانوں کو میری یہ چھاتی پاگل کر دیتی ہے۔تو میں نے اپنے مینو کارڈ میں اس کا ریٹ اپنی مرضی سے درج کرلیا ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ میں کچھ زیادہ اس کے ساتھ گھل مل چکا تھا جبکہ مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔دیپتی ایک بار دیکھ گئی تھی۔وہ جانتی تھی کہ اس طرح کی بھولی بھٹکی روحیں بمبئی میں آجاتی ہیں۔میں اس کے ساتھ اب اکیلے میں بات کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا کہ دیپتی بالآخر آگئی۔وہ اٹھی اور ہاتھ جوڑ کے آداب کہا۔

''دیپتی جی میں آپ دونوں کو کل کھانے پر بلانا چاہتی ہوں۔انکار کیا تو سمجھوں گی آپ کو میرے پیشے سے نفرت ہے۔''

''آداب۔آپ سے تعارف تو ہوا نہیں۔آپ کون......؟''

''ہمارا کوئی نام نہیں ہوتا۔جس نام سے کوئی پکارلے وہ نام چپک جاتا ہے۔''

''میں ابھی ملا ہوں۔اور یہ بتاتی ہیں۔''

''نہیں آپ کیوں بتائیں گے۔ ہم بتاتے ہیں۔ ہماری زبان آپ سن رہی ہیں۔ نہ ہم دِلی کے، نہ رام پور کے، نہ لکھنؤ کے نہ حیدرآباد کے، پھر بھی مرزا غالب کو گالب نہیں بولتے۔ مجاز کو مجاج نہیں بولتے۔''

''بہت شستہ اردو بولتی ہیں، کہاں سے ہیں؟''

''بتا دیا تو آپ ہمارے ساتھ جا نہ پائیں گی۔ مگر ہم تو آپ کو لے کر جائیں گے۔ آپ کو ہمارے پیشے سے نفرت ہوگی ہم سے نہیں۔''

''کیا پیشہ ہے آپ کا؟''

''میں Prostitute ہوں۔''

''مجھے تو کسی بھی پیشے سے نفرت نہیں ہے۔ یہ تو ہر انسان کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔''

''اپنا نہیں دیپتی جی، وقت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وقت یا سمے ہمارا فیصلہ کرتا ہے۔ سب سمے کا پھیر ہے۔ خیر تو بات پہ آتے ہیں۔ ہم کو آپ اور صاحب کی شاعری بہت پسند آئی ہے۔ کل ہمارا دھندہ بند رہے گا۔ دوپہر کا کھانا آپ ہمارے گھر پر کریں گے۔ گھر، تو گھر ہوتا ہے۔ بھلے طوائف خانہ کیوں نہ ہو۔ سانس تو ہم لوگوں کو اُدھر ہی لینا ہوتا ہے۔''

''سنا ہے اُدھر بہت اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔''

''وہ اور طرح کے لوگ صرف ہم عورتیں ہوتی ہیں۔ مرد لوگ صرف ہماری ڈیوٹی دیتے ہیں۔''

''ہاں ادھر مارا ماری چلتی ہے۔ سنا ہے No Go Area ہوتا ہے۔ اور اُدھر کا سردار ہوتا ہے۔ جس کی اجازت سے کوئی آسکتا ہے۔''

''اُدھر کا سردار میں ہی ہوں۔ آپ کو پورا پروٹوکول ملے گا۔ اسی لئے تو آپ کو میں کلا کی ایک اور شکل دکھانا چاہتی ہوں۔ آپ کتھک کرتی ہیں، کمال کرتی ہیں۔ بھارت نائٹم بھی کرتی ہوں گی۔ میں آپ کو صرف جسموں کا ناچ دکھاؤں گی، وہ جسم جو دن رات صرف جسم ہی ہوتے ہیں۔ کیا آپ آئیں گی؟''

''ارے اب تو آنا ہوگا۔''

''ہاں ہم دونوں آئیں گے۔'' میری سانس خشک ہو چکی تھی کہ اچانک میری روح بحال ہوگئی۔

''تو ہم بھیجیں گے آپ کے ہوٹل اپنے لوگوں کو۔ وہ لے کر آئیں گے۔ ہم کو معلوم ہے آپ کا ہوٹل کہاں ہے۔ تو میں پکا سمجھوں۔''

''دیکھو تمہارا جو بھی نام ہو۔ کلاکار کا وعدہ ہے، آئیں گے۔''

''ویسے میرا نام رانی ہے۔ جھانسی کی رانی نہیں۔ باپ رے وہ بہت بڑی عورت تھی۔ ہم تو رانی ہیں رانی کیتکی والی۔ وہ کہانی پڑھی تھی کبھی۔''

''ہاں میں نے رانی کیتکی کی کہانی پڑھی ہے۔''

''تو بولیں کل آپ دوپہر کے کھانے پر آرہے ہیں۔''

میں نے دیپتی کو اور دیپتی نے مجھے دیکھا اور ہم نے ہاں کردی۔ وہ رانی تھی یا کون تھی، مجھے تو حیران کر گئی۔ ہم ہوٹل آئے اور پھر دوپہر سے ذرا پہلے اطلاع ملی کہ ہمیں کوئی لینے آیا ہے اور ہم معمولی سی تیاری کے ساتھ، مطلب دیپتی نے پنی سوتی ساڑھی پہنی اور میں نے لمبا کرتا اور پاجامہ کہ یہی انڈیا میں مردانہ لباس مناسب ہوتا ہے۔ اب جو ہم بمبئی کے مختلف علاقوں سے گزرے تو یہ میرے لئے ایک تجربہ تھا کہ میں بمبئی کو نہیں جانتا تھا۔ جو سمندر کے کٹے پھٹے ساحل کے آس پاس آباد تھا...... جب ہم ایک کھلی گلی میں پہنچے تو دونوں طرف بالکونیوں سے ہماری گاڑی پر سرخ گلاب کی پتیاں ڈالی جارہی تھیں اور دونوں طرف لڑکیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ اس روز اس بازار میں عام تعطیل تھی۔ دونوں طرف گاہکوں کے لئے ٹریفک بند رکھی گئی تھی۔ میرے لئے یہ علاقہ اور یہ تجربہ بے حد انوکھا تھا۔ مجھے گاڑی میں بیٹھے ہوئے دیپتی نے بتایا کہ وہ یہ علاقہ جانتی ہے اور کلکتہ میں بھی ایسے علاقے ہیں اور یہ جو استقبال ہو رہا ہے تو یہ جو ہماری میزبان رانی کیتکی ہے یہ اس سارے علاقے کو کنٹرول کرتی ہوگی۔

گاڑی ایک بے حد کلاسیکی پارسی طرز تعمیر کی عمارت جسے مینشن کہا جاسکتا ہے، میں داخل ہوئی۔ ہم دونوں سوچ رہے تھے کہ ہم نے یہ دعوت کیوں قبول کی اور یہی پہلا سوال دیپتی نے بیٹھتے ہی کیا۔ وہاں موجود ایک جیسی ساڑھیوں میں موگرے کے پھول بالوں میں سجائے لڑکیوں نے سلامی دی...... سب نے ویل کم ڈانس کیا اور جب ہم بیٹھ گئے تو دیپتی کے سوال کا جواب رانی صاحبہ نے دیا ''آپ کے فن کی بہت عزت ہے۔ ہمارے فن کی عزت ہو ہی نہیں سکتی۔ سوچا تھوڑی عزت آپ سے ہم کو مل جائے تو یہ لڑکیاں اپنے اندر روح میں شانتی حاصل کرلیں گی۔ دنیا جہان کی دھتکاری ہوئی اور روندی کچلی ہوئی یہ لڑکیاں اگر آج فن کاروں کے ساتھ بیٹھ کر دو باتیں سیکھ لیں گی تو میری جو ناری سدھار کی کوشش ہے کچھ سپھل ہو سکتی ہے۔''

ہمارے اردگرد بے شمار مختلف عمروں کی لڑکیاں اور عورتیں جمع ہو چکی تھیں۔ ان کے ناک نقش،

لباس ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ رانی نے بتایا کہ یہ پورا ہندوستان آپ کے سامنے ہے۔ ہندوستان کے تمام صوبوں کی اور زبانوں کی اور ثقافتوں کی یہاں نمائندگی موجود ہے۔ چاہو تو پہچان سکتی ہو۔ رانی نے دیپتی سے کہا دیپتی نے فوراً اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ یہاں تو میزورام، آسام، گوہاٹی، کلکتہ، لکھنؤ، پنجاب، راجستھان، دہلی اور ساؤتھ کے علاقوں کے نین نقش موجود ہیں۔ میں نے دیپتی سے پوچھا ''اتنی جلدی آپ نے کیسے پہچان لیا۔''

''جو کلکتہ میں پلا بڑھا ہو وہ پورے ہندوستان کے جغرافیے سے واقف ہوگا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پورے ہندوستان کا پانی آ کر گرتا ہے۔'' دیپتی اب سمجھ چکی تھی کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ دیپتی نے سوال کیا ''یہ ناری سدھار کی بات کیا ہے؟''

''دھیرے چلو۔ سمے کا کوئی بیوپار اِدھر آج نہیں ہوگا۔ یوں تو روز ادھر سمے کا مول تول ہوتا ہے مگر آج نہیں ہوگا۔''

''ہاں تو آپ نے ہماری عزت بڑھائی۔ ادھر آ کر خوشی اور دکھ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔''

''ادھر بھی یہ دونوں ہی ہمارے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کا سر پھٹ جاتا ہے کسی کسٹمر کے کارن، کبھی کسی کو کوئی بیوڑا دانت سے کاٹ لیتا ہے۔ یہ مارا ماری چلتا ہے اور کبھی کسی کا بچہ بھی ہو جاتا ہے تو لڈو بانٹے جاتے ہیں۔ بڑا جھنجھٹ ہے ادھر کا۔ میں ہی اب سنبھال رہی ہوں۔ یہ میری اسٹیٹ ہے۔ ادھر کی میں رانی ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے یہ ناری سدھار؟''

''ہاں میں کوئی نیلسن منڈیلا کچھ نہیں ہوں نہ مدر ٹریسا ہوں، نہ میں فلورنس نائیٹنگیل ہوں، ارے بابا میں تو طوائف ہوں۔ I mean prostitute۔''

ہاں پہلے ویلکم ڈرنک تو لیں۔

ہمارے لئے دو ایک ایسی ساڑھیوں میں سترہ سترہ سال کی لڑکیاں ٹرے میں سجائے دو گلاس جن کے اوپر کنول کا پھول تیر رہا تھا، لے کر آئیں۔ ہم نے لے لیا اور وہ پھول ہٹا کر ڈرنک لیا۔ یہ ناریل پانی اور دو تین پھلوں کا ملاپ تھا۔ اچھا تھا۔ اب میں نے بات پالی تھی۔ تو اب میں نے پوچھا ''آپ کی کہانی کیا ہے۔ اگر وہ کھل جائے تو پورے ہندوستان کی لڑکیوں کی کہانی بھی کھل جائے گی اور ہمیں نئی امراؤ

جان سمجھ میں آجائے گی۔"

"It is a studid story۔"

"ہاں تو وہ کہانی ہی تو چلی آتی ہے۔اسے کون روکے گا۔"

"میں نے روک دی ہے اور اسی لئے آپ کو بلایا ہے کہ آپ دیکھ سکیں۔ایک کتھا کہانی آپ کہتی ہیں اور دوسری کتھا ہمارے جسموں پر گزرتی ہے۔"

"تو جو گزری بتادو۔یہاں تو ہر لڑکی کی ایک جیسی کہانی ہوگی۔"

"پہلے میری کہانی سن لو، بے ذائقہ ہے۔سکول میں تھی، دو چٹیاں بناتی تھی۔یوں سمجھو امراؤ جان کی امیرن تھی۔ماں کو باپ نے طلاق دے دی۔اس نے دوسری شادی کر لی اور کہیں چلی گئی۔باپ امیر آدمی تھا۔ہوسٹلوں میں پڑھتے پڑھتے ماسٹرز کر لیا۔رشتہ کسی سے نہ بن سکا۔بنا تو ایک مردود تھیٹر کے اداکار سے کہ شکل کا اچھا تھا۔اس نے کہانی سنادی کہ اسے ایک بڑے فلم ڈائریکٹر نے ہیرو بنانے کا وعدہ کیا ہے۔وہ بمبئی جا رہا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ مجھے وہ مینا کماری بنا دے گا۔ماں کے زیورات باپ نے مجھے دے رکھے تھے۔وہ ساتھ لئے اور ٹرین پکڑ لی۔جواب کسی کو دینا نہیں تھا۔بمبئی پہنچے۔پہلی رات ہوٹل میں اس نے سہاگ رات منالی اور اگلی شام مجھے لے کر ایسے ہی کسی علاقے میں پہنچا اور پھر وہ مجھے کوٹھے دارنی کے حوالے کر کے چلا گیا۔جسے وہ اپنی خالہ بتاتا تھا۔بات ختم۔ایک اور امراؤ جان دنیا میں آگئی۔"

"میں سمجھ رہی تھی کہ یہ جوان لڑکیاں ہیں، یہ بمبئی کیوں آئی ہیں؟ بمبئی کی فلم انڈسٹری نے ان کے گھر بھی برباد کئے جو فلم کی ہیروئنیں بن گئیں اور ان کے گھر بھی برباد کئے جو فلم لائن میں نہ آسکیں۔" دیپتی نے جواب دیا۔

"نہیں سب کے گھر برباد نہیں ہوئے۔بہت سو کے گھر آباد ہوئے۔ان میں سے ستر فیصد کے گھر ان کی وجہ سے چل رہے ہیں۔سب کے بہن بھائی اپنے اپنے شہروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔کسی کو نہیں معلوم بہن کہاں کام کرتی ہے۔بس اتنا پتہ ہے بمبئی میں ملازمت کرتی ہے۔تو کیا جھوٹ ہے۔ملازمت ہی تو کر رہی ہیں۔"

"اب ذرا ناری سدھار کا فلسفہ بھی بتادیں۔"

"پہلے میں آپ کو دکھانا چاہتی ہوں کہ ان میں سے مینا کماریاں کون سی ہیں جو وہ خواب لے کر آتی ہیں۔مدھو بالائیں کون سی ہیں۔نرگسیں کون سی ہیں۔شرمیلا ٹیگوریں کون سی ہیں اور سادھنائیں کون

کون ہیں۔"

اس کے یہ کہنے کے بعد تین چار گروہوں میں لڑکیاں بٹ گئیں اور پھر رانی کیتکی نے بتایا کہ ایسی لڑکیوں کی بھی خاصی تعداد ہے جو اپنے شوہروں کے ہاتھوں ماریں کھانے کے بعد ادھر آ گئیں اور ایسی بھی لڑکیاں ہیں جن کو مائیں یا باپ چھوڑ گئے کہ مرنے سے بچ جائیں گی۔ اب ناری سدھار کے حوالے سے ہم نے پوچھا تو رانی کیتکی نے بتایا:

"میں نے اس مقام تک پہنچنے میں کئی سیاست کے کھلاڑیوں کے بستر گرم کیے۔ کئی انڈر ورلڈ کے ٹھاکروں کے آگے گھٹنے ٹیکے تب جا کر ادھر کی رانی بنی۔ اور اب میں نے ناری سدھار کا اندولن کر رکھا ہے۔ دس سال بعد ادھر کوئی جسم بیچنے کے لئے موجود نہیں ہوگی۔ ادھر کا تیج انڈسٹری بن رہی ہے۔ جو ناری جو جانتی ہے وہ اپنا کام سیکھ رہی ہے اور ایک ایک کر کے سب انڈسٹری میں چلی جائیں گی اور جو نئی لڑکیاں آ رہی ہیں وہ بھی اُدھر جائیں گی۔ پاپڑ بنانے سے کاغذ کی پلیٹ بنانے تک کی انڈسٹری موجود ہے۔ خالی فوڈ انڈسٹری اتنی بڑی ہے کہ میری لڑکیاں دن رات کام کریں تب بھی پورے بمبئی کا کھانا پورا نہیں ہوسکتا۔"

اب میری باری تھی پوچھنے کی۔ "کیا ان میں سے کسی کو اس پیشے سے محبت نہیں ہے؟"

اس پر سناٹا چھا گیا اور پھر رانی نے اشارہ کیا کہ کوئی بھی اس کا جواب دے سکتی ہے۔ ایک نے جواب دیا کہ جس کام کی بنیاد نفرت پر قائم ہو اس سے محبت کیسے ہوسکتی ہے۔ جب مجھ سے میری مرضی مانگی جائے گی تو مجھے جسم بیچنے کی آزادی ہوگی لیکن ادھر ایسا نہیں ہے۔ صرف ہماری رانی نے یہ آزادی حاصل کی ہے۔ اس لئے وہ ہمیں بھی آزاد کرانا چاہتی ہیں۔

اب میری باری تھی بات پوچھنے کی۔

"اگر اس علاقے سے جسم فروشی کا کاروبار ختم ہو جائے گا تو باقی کی بمبئی کی صفائی کیسے ہوگی؟"

"بمبئی کی صفائی نہیں ہوسکتی۔ یہاں سستی شراب عام ہے۔ دن بھر کی مشقت کے بعد جسم ہلکا کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے اور اگر اس کے بعد عورت دستیاب نہ ہو تو مردوں، لڑکوں اور ہیجڑوں پر ان سب مردوں نے حملہ آور ہونا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شہر کے بیچوں بیچ گندے پانی کے نکاس کے لئے بدروئیں بنائی جاتی ہیں۔ باقی بات آپ خود سمجھ لیں۔"

"یہ تو سمجھ میں آتی ہے بات تو پھر ہندوستان کی ناری کیسے اپنے جسم کا فیصلہ کرے گی۔"

"فیصلے کے لئے راستہ ہم دکھا چکے ہیں۔ راستہ دیکھنے کے لئے پورے ہندوستان سے عورتیں

میرے پاس آتی ہیں۔ سب دیکھ جاتی ہیں۔ جیسے آج آپ دونوں میرے مہمان ہیں۔ اب یونیورسٹی کھول دی ہے تو تعلیم تو عام ہوگی۔''

دپتی اور میں نے اسے بہت اہم تجربہ سمجھا۔ اس کے بعد ہمارے لئے دعوت سجائی گئی۔ تو مجھے میرامن کی ''باغ و بہار'' کے پہلے درویش کی وہ شہر کے دروازے پر لٹکے صندوق کی زخمی محبوبہ یاد آ گئی جس نے درویش کو حکم دے کر اس جمال زادے (حرامزادے) کے اعزاز میں دعوت سجائی تھی جس نے اسے زخمی کیا تھا۔ اس دعوت میں کیا کچھ نہیں تھا۔ تو وہی سب کچھ رانی کیتکی نے ہمارے لئے سجا دیا تھا۔ ہماری خدمت پر مامور باندیاں وہ لڑکیاں تھیں جن کی کہانیاں ہم سن چکے تھے۔ بمبئی کے بھنڈی بازار کے چنیدہ کھانوں کے علاوہ باندرہ، چوپاٹی اور جوہو سے لے کر اندھیری تک کے باورچیوں کو کھنگال لیا تھا۔ یہ سب اس لئے تھا کہ اس علاقے کے طوائف خانوں میں رہنے والی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت کی بحالی کا کچھ تو خیال کیا جائے۔ ہمارے لئے یہ سب کیوں ہوا؟ اس پر میں سوچ رہا تھا کہ خود رانی صاحبہ نے اعلان کیا کہ اب مہمانوں کے لئے ہندوستانی رقص ہوگا۔ بالی وڈ کی فلموں نے رقص کی جو تباہی کی ہے اس سے ہٹ کر ہوگا اور پھر کتھک، بھارت ناٹیئم، کلاسیکی، علاقائی اور بنگالی اسالیب کے سارے رقص دکھائے گئے اور وہ سب انہی لڑکیوں نے پرفارم کئے جو وہاں کسی نہ کسی ظلم کے نتیجے میں لائی گئی تھیں۔

اس فن کو دیکھ کر دپتی نے کہا ''تم سب اپنی اپنی جگہ کلاکار ہو۔ سکول کیوں نہیں کھول لیتیں۔ بچیوں کو یہ فن سکھاؤ۔''

''یہی تو ہم کر رہی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کوئی اپنی لڑکیوں کو سیکھنے کے لئے ہمارے سکول میں کیوں بھیجے گا۔ وہ وقت گئے جب لکھنؤ کے نواب اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو آداب اور شاعری سکھانے کے لئے بالاخانوں پر بھیجا کرتے تھے۔ ان طوائفوں کی عزت ہوتی تھی۔ ہم تو گندی نالی کے کیڑے ہیں۔ شرفاء کے دامن آلودہ ہو سکتے ہیں ہماری ایک چھینٹ سے۔ یہ الگ بات کہ وہ شرفاء اپنی گندگی اِدھر پھینکنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔'' رانی اب اپنے تجربے بتانے لگی تھیں۔

''دپتی جی اور شاعر صاحب! آپ نے کلا کو دیکھا ہے، کلا کے تیر کو نہیں دیکھا۔ یہ جو فن ہوتا ہے ناں یہی فن کار کا ازلی دشمن ہوتا ہے۔ پوچھو کیوں؟''

''کیوں'' اگرچہ مجھے معلوم تھا۔

''سارے شاعر اپنے فن کے ہاتھوں بھوکے مرے، سمیت مرزا غالب کے۔ گالب نہیں بولا

میں نے۔ ارے دو گھونٹ شراب کے لئے دو پہر سے ہرکارے کے ہاتھ پروانہ لکھ کر دوڑاتے تھے۔ جواب آتا تھا نہیں آتا تھا۔ خود لکھا ہے خطوں میں...... اب دیکھو ان لڑکیوں کو۔ ساری کی ساری نہ سہی نوے فیصد کو فنونِ لطیفہ نے لوٹ کے برباد کیا ہے۔''

''وہ کیسے؟ مطلب؟ موسیقی، شاعری، رقص، اداکاری وغیرہ۔''

''ہاں جی، ان لڑکیوں نے اپنے خوابوں سے مار کھائی ہے۔ یہ لڑکی کامنی ہے، اسے رقص کرنا آتا ہے۔ محلے کا لڑکا اسے بمبئی فلموں میں چانس دلوانے کے لئے لایا اور کوٹھے پر بیچ گیا۔ یہ پدمنی ہے، اسے اداکاری کا شوق تھا، اسے اس کا اپنا کزن سبز باغ دکھا کے اِدھر بھاؤ تاؤ کر گیا۔ یہ سلوچنی ہے، اسے گانے کا شوق ہے۔ اب بھی سنو تو لگے گا لتا جی گا رہی ہیں۔ اسے اس کا اپنا موسیقی کا استاد بھگا کے لے آیا اور پیسے بنا کے پتلی گلی سے نکل گیا۔ یہ ویسے تو سیتا دیوی ہے لیکن نام رکھا ہے نین تارا، اسے اس کا بوائے فرینڈ شاعرہ بنانے کے لئے اِدھر ساحر لدھیانوی کے چرنوں میں بٹھانے کے لئے لایا تھا۔ آخر کو بیچ باچ کے نکل گیا۔ اب بولو، فنون لطیفہ نے کتنے ہندوستانیوں کے گھر برباد کئے اور کتنے ہوں گے؟''

یہ بات اتنی بڑی تھی کہ میں سوچنے لگا پاکستان میں مارشل لاء نے فنونِ لطیفہ کو تباہ کیا تو یہاں فنونِ لطیفہ نے ہندوستان کے گھرانوں کو تباہ کیا۔ ایک طوائف اور جسم فروش نے اپنے ماسٹرز کی ڈگری کا کتنا اچھا استعمال کیا، یہ میں دیکھ رہا تھا۔

اب وہاں سے رخصت تو ہو گئے مگر آدمی جہاں سے چلا جاتا ہے۔ دراصل وہیں رہتا ہے۔ کوئی کہیں جاتا نہیں ہے۔ ہم دونوں...... دیپتی اور میں جہاں سے گئے دراصل وہیں رہ گئے۔ آدمی خود کو ٹکڑوں میں چھوڑے جاتا ہے۔ آدمی کا فلسفہ صرف اس کا خالق ہی جان سکتا ہے۔ آدمی تو بس سیلاب کی زد میں آیا ہوا گھر ہے یا کچھ بھی ہے تو اس کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ کہاں جائے گا، کیا شکل اختیار کرے گا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں ابھی تک رانی کے مینشن میں تھا۔ کلکتہ سے ہوتے ہوئے ہم واپس لندن آ چکے تھے اور دیپتی اور میں نے سوچا تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ انڈیا سے شائع ہو گا تو رائلٹی اچھی ملے گی۔ ہم دونوں کے پاس کئی پبلشرز کے رابطے تھے۔ ہندوستان میں ان پروگراموں کی وجہ سے کام آسان ہو گیا اور جو بھی میں نے چاہا وہ حاصل ہو گیا۔

لندن ہی میں میری شاعری کا مجموعہ شائع ہو کے آ گیا۔ اس میں وہ کلام زیادہ تھا جو پاکستان میں ضیاء الحق کے مارشل لاء کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس کتاب میں پاکستان کے لئے ایک

دلچسپی بغیر سنسر کے اشاعت پڑھنے والوں کے لئے موجود تھی۔ اس کتاب کو دبئی اور کئی اور راستوں سے کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے بڑی تعداد میں آرڈرز مل چکے تھے۔ پاکستان میں شدید قسم کا سنسر تھا۔ ادبی پرچے، کتابیں، اخبار، رسالے سب بری طرح سنسر ہو رہے تھے۔ ایسے میں اس شعری مجموعے کی خبریں نکل چکی تھیں۔ پاکستان میں ہر اس خبر کا چرچا ہو رہا تھا جس کا تعلق جمہوریت، آزادی، بھٹو صاحب کی پھانسی اور ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف ہوتا تھا۔

ایسے میں میرے اس شعری مجموعے کی خبریں نکلیں تو لاہور سے گوئٹے انسٹیٹیوٹ سے دیپتی کو ایک پروگرام کے لئے دعوت ملی کہ گوئٹے انسٹیٹیوٹ ہمارے پروگرام کے لئے لاہور میں میزبانی کے لئے تیار ہے۔ میں نے جب یہ سنا تو میرے اندر لاہور انگڑائی لے کر جاگا۔ لکشمی چوک میں صبح کے پانچ بجے میں اور میرے ریڈیو پاکستان لاہور کے پروڈیوسر ساتھی ساری رات سٹوڈیو میں کیا سنتے رہے۔ سائیں مرنا، استاد امانت علی خان، استاد نزاکت سلامت، استاد طفیل نیازی، استاد برکت علی خان اور جو بھی خزانہ ریڈیو پاکستان لاہور کے سرد خانوں میں رکھا تھا وہ سب ہم اس یخ بستہ رات میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے سنتے رہے۔ نیند کا جھونکا آتا تو ایک دوسرے کی گود میں جھول جاتے اور پھر کوئی تان سہارا دیتی تو اٹھ بیٹھتے۔ ایسے میں صبح کی اذانیں گونجیں تو اب سٹوڈیو سے نکلے تو سیدھے رائل پارک اور لکشمی چوک پہنچے۔ وہاں صرف ایک کھانے پینے کا تندور آخری دموں پر موجود تھا۔ یہ ''شاہی مرغ چھولے'' کی دکان تھی۔ ہم نے سوال دراز کیا تو وہاں موجود تندورچی نے کہا اس وقت لگی روٹیاں تو صرف قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ میں اللہ والوں کا اس وقت انتظار کیا کرتا ہوں۔ اکثر فجر کی نماز کے بعد دو چار نمازی آجاتے ہیں۔ یہ تندور صرف ان کا انتظار کیا کرتا ہے۔ آج آپ کی قسمت کہ وہ نمازی اپنی نماز اور سجدے کو طول دے بیٹھے ہیں۔ اب جو تندور سے روٹیاں نور حضور کے سمے باہر آئیں تو چہرہ دمک رہا تھا۔ میں نے پہلی بار ''شاہی مرغ چنے'' کھائے تو وہ ذائقہ تالو سے لگائے پھر تا رہا ہوں۔ اب جو بلاوا آیا تو میں نے دیپتی سے کہا ''مجھے میرا لاہور دکھا دو۔''

''لاہور تو تمہارا ہے، تم مجھے دکھاؤ گے۔''

''نہیں وہ مجھ سے روٹھ گیا ہے، تم اسے مناؤ گی۔''

''جو روٹھ جائے اسے خود منایا جاتا ہے۔''

''ہاں میں ہی منانے کی کوشش کروں گا۔ تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔''

اور پھر ہم نے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی دعوت قبول کر لی اور اپنا وہی پروگرام جو انڈیا میں کئی شہروں میں ہم نے دکھایا تھا، اسے لاہور کے لئے مناسب خیال کیا کہ دونوں ملکوں کے سوچنے والے دانش مند رائٹرز، پینٹرز، طلباء، وکلاء، اساتذہ، سڑک چھاپ شاعر اور مضافات سے آئے ہوئے کسان سب کے سب ایک طرح سوچتے اور سمجھتے تھے۔ اب دپیتی کے ذریعے میں جرمن گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے اپنے شہر جا رہا تھا۔ اندر سے شرمندہ تھا جیسے میں اپنے شہر کے قابل نہیں رہا یا شہر پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ اگرچہ شہر ہی نے مجھے میری مرضی کے خلاف سرحد پار سے باہر پھینک دیا تھا پھر بھی میں شہر سے آنکھ چرا رہا تھا جیسے میں نے شہر کا غبن کیا ہو یا شہر سے بے وفائی کی ہو۔

گوئٹے انسٹیٹیوٹ پاکستان میں سنسر سے آزاد تھا بلکہ امریکن سینٹر اور برٹش کونسل بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں آزاد اور خود مختار تھے بلکہ قانون کے مطابق ان کی عمارتیں اپنے اپنے ملکوں کا درجہ رکھتی تھیں اس لئے جو پروگرام وہاں ہوتے تھے اس کی ذمہ داری ان اداروں پر ہوتی تھی کہ وہاں آنے والوں کو ممبرشپ کے ذریعے ایک شناخت حاصل تھی۔ یہ آنے والے یا تو اساتذہ، ادیب، شاعر، طالب علم اور معاشرے کے سیکولر اور اعلیٰ سوچ کے حامل افراد ہوتے تھے اس لئے کہ برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے یہ ادارے کسی بھی سیاسی وابستگی سے ہٹ کر ادب شاعری، فنونِ لطیفہ اور انسانی حقوق کی پاسداری کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ اس کا مجھے علم بھی تھا اور میں جب لاہور میں شاعری کے حوالے سے پہچانا جانے لگا تھا تو امریکن سینٹر میں اپنے سینئر دوستوں کے ساتھ ایک دو مرتبہ فلمیں دیکھنے گیا تھا۔ برٹش کونسل کی لائبریری سے کتابیں لے کر آتا تھا اور گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی تو دو چار کتابیں اب بھی میرے اس گھر میں کسی کونے میں پڑی ہوں گی جو کبھی میری بیوی کا گھر تھا۔ اب تو بیوی نہ رہی تو وہ کتابیں کہاں دھری ہوں گی۔

پاکستان میں کون سی حکومت تھی، کس کی حکومت تھی، اگرچہ معلوم تھا لیکن میں یہ سب بھولنا چاہتا تھا کہ مجھے پتہ تھا۔ پاکستان میں آنے والی آدھی صدی تک ضیاء الحق ہی کی حکومت رہے گی۔ چہرے اوپر نیچے اور داغدار ہوتے رہیں گے اور ان کو داغدار کون کرتا رہے گا یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پورا نظام جن کی مٹھی میں آ چکا تھا وہ بھلا کیسے جمہوری حکومتوں کو حقیقی دودھ پر پلنے دیں گے۔ وہ تو اپنے فیڈر میں اپنی مرضی کے دودھ پر ان کو پالیں گے اور جب چاہیں گے ان سے اپنے حق میں فیصلے کرا لیں گے۔ میں نہ تو کوئی سیاسی تجزیہ نگار تھا نہ کوئی عالمی واقعات کا ماہر تھا۔ بس جو بھی تھا محض خیال اور قیاس پر بھروسے کی وجہ سے تھا۔ اب میرے لئے پاکستان وہی تھا جسے چھوڑ کے آیا تھا۔ وہی شاموں کا سناٹا، وہی سڑکوں پر منہ سونگھ

کر تھانے بھرنے کا کلچر تھا۔ میں تو دیپتی کے ساتھ جا رہا تھا جو ہندو مذہب سے تھی۔ اسے ایئر پورٹ پر شراب لے جانے کی اجازت تھی کہ اس کا پاسپورٹ برٹش تھا اور وہ خود انڈین تھی۔ یہ تجربہ بھی ہونا تھا۔ دیپتی نے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کیساتھ سب معاملات طے کر لئے تھے۔ جرمن ایمبیسی بھی ہمارے لئے موجود تھی۔ دیپتی نے پروگرام کا جو معاوضہ طے کیا تھا وہ ہمیں ملنا تھا اور ہمارا قیام اور سکیورٹی ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ذمہ تھی جسے میں جانتا تو تھا لیکن وہاں رہنے کا تجربہ نہیں تھا۔ دیپتی کو میں نے بتا دیا تھا کہ جب تم شراب کی بوتلیں ایئر پورٹ پر کسٹم کو دکھاؤ گی تو ان کی رال ٹپکے گی۔ قانونی طور پر وہ تمہیں روک تو نہیں سکیں گے لیکن تنگ کرنے کے لئے ان کے پاس بے شمار ضابطے ہوتے ہیں۔ اس لئے دو بوتلیں ان کے لئے الگ سے رکھ لو تا کہ وہاں وہ کوئی تماشا نہ کر سکیں۔ وہی ہوا کہ جب دیپتی نے کسٹم والوں کو بتایا کہ وہ لاہور میں سات دن رہنے کے لئے آئی ہے اس لئے اپنی ڈرنک ساتھ لے کر آئی ہے، اپنے فائیو سٹار ہوٹل اور جرمن ایمبیسی کا حوالہ بھی دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جرمن ایمبیسی سے ہمارے لئے پروٹوکول افسر وہاں اندر آ چکا تھا۔ اس دوران اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ اگرچہ وہ پلے کارڈ لئے کھڑا تھا، ہم نے توجہ نہ دی کہ ہمیں اس کی توقع نہ تھی۔

اب اس نے اپنا تعارف کرایا اور اپنا کارڈ اس نے کسٹم کے آدمی کو دکھایا تو کسٹم والے کو اپنا نظام کھٹائی میں پڑتا نظر آیا تو اس نے کچھ جلوہ دکھانے کی کوشش کی۔ اس لئے کی کہ جرمن ایمبیسی کا افسر پاکستانی تھا اس لئے اس نے صرف ایک جملہ بولا صاحب! آپ ایک طرف ہو جائیں ہمارا روز کا کام ہے۔ اس پر میں سامنے آیا۔ دیکھو یہ ہمارے میزبان ہیں۔ یہ الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ شراب کی بوتلیں ہم لے کر جائیں گے اور تمہارا انعام دو بوتلیں اس بیگ میں ہیں۔ لے لو۔ نہیں تو ان سے بھی جاؤ گے۔ میں لاہور سے ہی ہوں۔ اس پر اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ ان دو بوتلوں کا لفافہ لے کر جیسے اپنا چہرہ چھپانے لگا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے نکل گیا۔ میں اس اشارے کو سمجھتا تھا کہ بڑے افسروں پر نظر جانے سے پہلے ہی معاملہ نمٹ جائے۔ ضیاء الحق کے جانے کے بعد یہ تبدیلی آ چکی تھی اور ایئر پورٹ کے محکموں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ ان کا کام پھر سے چلنے لگا تھا۔ میرے لئے یہ تجربہ ضروری تھا کہ میں ایک اور پاکستان سے گیا تھا اور ایک اور پاکستان میں داخل ہو رہا تھا۔ کتنے پاکستان بنیں گے۔ مشرقی پاکستان کے جدا ہونے کے بعد ایک اور پاکستان۔ ابھی اور کتنے پاکستان دیکھنے ہوں گے۔ اللہ دیکھ لو۔ پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے تو اللہ نہ کرے ہوں مگر ہم نے پاکستان کو ہر زمانے میں ایک الگ پاکستان کا روپ دے دیا ہے۔ اس سے پاکستان کے

ٹکڑے کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب بے شمار پاکستان ایک پاکستان میں ہم نے پیدا کر دیئے ہیں۔ امیروں کا پاکستان الگ، غریبوں کا پاکستان الگ، ملازم پیشوں کا پاکستان الگ، انتہاپسندوں کا پاکستان الگ، مولویوں کا پاکستان الگ، سرکاری محکموں کے بڑے افسروں کا پاکستان الگ، جن کے بچے امریکہ میں پڑھنے جاتے ہیں اور واپس آ کر کسی بزنس فیملی کی لڑکی سے شادی کر کے بزنس کرنے لگتے ہیں، پڑھائی گئی بھاڑ میں...... اسی طرح ایک پاکستان شروع سے ان کا تھا جو پاکستان کی سرحدوں کے محافظ رہے ہیں۔ ان کو سلام کہ سرحدوں کو رہنا چاہیئے۔ سرحدوں کی حفاظت سے انہوں نے پراپرٹی ڈیلنگ کا ایسا ہنر سیکھا کہ اب زیادہ توجہ اپنی پراپرٹی پر مرکوز کرنے میں مگن رہتے ہیں۔

پاکستان کے ٹکڑے اس طرح ہوئے ہیں۔ زمین کے ٹکڑے نہیں ہوئے۔ آسمان کے ٹکڑے ہوئے ہیں۔ اب ٹوٹا ٹوٹا آسمان ہر طبقہ اپنے سر پر لئے پھرتا ہے۔ کبھی سر پر آسمان کا ٹکڑا سرک جاتا ہے تو بے اماں ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی زمین پر پاؤں رکھ چکا تھا، در و دیوار اجنبی تھے، کس کی حکومت تھی، میرے لئے بے معنی تھا۔ نہ آسمان وہ تھا نہ زمین، آب و ہوا میں جیسے اجنبیت کی باس رچی ہوئی تھی۔ میں نے کسی کو فون نہیں کرنا تھا۔ جو دو چار فون نمبر میرے پاس تھے اب وہ دوست بھی کہاں رہے تھے۔ بیوی طلاق کے بعد شادی کر چکی تھی۔ مجھے اپنے بیٹے کی تلاش بھی نہیں تھی کہ وہ تو مجھے جانتا ہی نہیں ہو گا اور گیارہ بارہ سال گزرنے پر وہ کیسے مجھے پہچانے گا۔ میرے دل میں کہیں بھی اس سے ملنے کی گدگدی نہیں تھی۔ وجہ شاید میرا احساس جرم تھا کہ میں نے اسے کیا دیا۔ میں اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ باپ جسے عمر قیدی کی سزا ہو جائے وہ اپنے نوزائیدہ بیٹے کو کیا دے سکتا ہے۔ اسے تو دور ہی رہنا چاہیئے اور میرا سایہ تک اس پر نہیں پڑنا چاہیئے۔

ہم ہوٹل میں آ چکے تھے۔ دیپتی اور مجھے سوئیٹ دیا گیا تھا۔ ہم نے اپنی بار سجائی اور ہر طرح کی اس میں سہولتیں ہوٹل والوں نے فراہم کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کسی نے ملنے آنا ہے یا نہیں۔ دیپتی کے لئے لاہور شہر اجنبی تھا۔ نہ اس کے والد نہ اس کی ماں یہاں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ کلکتہ کی بنگالن تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ چونکہ یہ میرا شہر رہا ہے تو میں اس شہر میں اپنے دوستوں کو یہاں بلاؤں۔ پاک ٹی ہاؤس موجود تھا۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا کہ اس سے رشتہ ایسا تو نہیں تھا جیسا انتظار حسین، انور سجاد، سہیل احمد خان، ظہیر کاشمیری، منیر نیازی یا ناصر کاظمی کا تھا۔ میں دراصل خود سے چھپ رہا تھا۔ یہاں ہم آئے تھے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے پروگرام کی وجہ سے۔ یہاں میں بحیثیت شاعر تو نہیں آیا تھا اس لئے میں کھلے بندوں سڑک

پر چلتے ہوئے پرانی انارکلی کے عبدالرحمان ہوٹل میں کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں آ کر اپنی جلاوطنی کی روداد نہیں سنا سکتا تھا۔ کافی ہاؤس میں عبداللہ ملک اور کے کے عزیز کی میز پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں تو تھا ہی نہیں اس لئے میرا وجود لاہور کے لئے موجود نہیں تھا۔ ویسے بھی میں لاہور سے گم نام ہی نکلا تھا۔ کسی اخبار کی سیاسی جماعت، کسی ادبی نظریے، کسی ترقی پسند حریت پسند گروہ نے آواز نہیں اٹھائی تھی۔ اس لئے کہ میں شاہی قلعے کی کال کوٹھڑی سے رات کے اندھیرے میں جہاز میں بٹھایا گیا تھا۔ زمانہ ہی ایسا تھا کہ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے آج اگر میں لاہور کی مال روڈ پر نکل کے پاک ٹی ہاؤس کو جھانکتا تو ہو سکتا تھا وہاں اُلو بول رہے ہوتے اور میں کوئی حریت کی علامت تو تھا نہیں کہ مجھے دیکھ کر سہمے ہوئے شہر کے ترقی پسند جاگ اُٹھتے۔ اس لئے میں نے ہوٹل میں دیپتی کے ساتھ اپنے پروگرام کو بہتر پرفارم کرنے کے لئے کئی طرح سے گفتگو کی۔ لاہوریوں کے مزاج سے واقف تھا۔ سب سے زیادہ دیپتی میرے شہر میں تھی تو میں اسے اپنے اور قریب کرنا چاہتا تھا۔ وہ میزبان تھی اور میں کسی بھی طرح سے اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا ضرور کہ تم اپنے شہر میں اجنبی کیوں ہو؟

ہاں میں اپنے شہر میں اجنبی ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ آدمی خود کو اداسی میں لپیٹ لیتا ہے جو اسے روحانی طور پر Allianate کر دیتی ہے اور مجھے یہ سب چاہئے تاکہ میں لکھ سکوں۔ دیپتی اسے سمجھ چکی تھی۔ سو ہم نے ہوٹل میں میں ہی اپنا قیام بنایا۔ دیپتی کو میں نے بتایا کہ کون لوگ ہمارا پروگرام دیکھنے آئیں گے کہ ضیاء الحق کا مارشل لاء ختم تو ہو چکا تھا مگر موجود تھا اور گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر نے بتا دیا تھا کہ لاہور میں تھیٹر کی روایت کمزور سی رہی ہے مگر یہاں اس طرح کے پروگرام کے لئے ہم نے ٹکٹ نہیں متعارف کرائے۔ ایک تو یہ ادارہ منافع کمانے کے لئے نہیں ہے، دوسرا یہاں ٹکٹ لینے والے دو چار لوگوں کے لئے ہم دیکھنے کے شائقین کو محروم نہیں رکھ سکتے۔ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جو لوگ یہ پروگرام دیکھیں گے وہ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ممبر اور لائبریری کے رکن ہوں گے۔ اس کے علاوہ مختلف کونسل خانوں کے افسر اور سرکاری محکموں کے اہل کار ہوں گے جو ہمارے پیغام کو جانتے ہوں گے۔ اب ساری بات ہماری پرفارمنس کی تھی۔ ہمارے سازندے آ چکے تھے۔ پورا اسکرپٹ ہمیں زبانی یاد تھا اور دیپتی کے کتھک کے ساتھ کہانی پوری طرح گھلی ملی ہوئی تھی۔ کہانی لاہور کے شاہی قلعے سے شروع ہوتی تھی اور حسن ناصر کے ساتھ بھگت سنگھ کو جوڑتی تھی۔ یوں برطانوی تسلط کا تسلسل پاکستان بننے کے بعد بھی موجود تھا۔ یہ بات ثابت ہو جاتی تھی۔ ہمارے سازندے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ پردہ ابھی

نہیں اٹھا تھا۔ ہم سب وقت کے مطابق اپنے اپنے مقام پر تھے کہ ہمیں معلوم ہوا کسی سرکاری محکمے کے افسروں نے ایکسائز ڈیوٹی کے حوالے سے چھاپہ مارا ہے اور وہ ہر آنے والے کی جیبیں ٹٹول رہے ہیں کہ کہیں وہ ٹکٹ لے کر تو داخل نہیں ہوئے کیونکہ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کاروباری ادارہ نہیں تھا۔ سب شرکاء دعوت نامے لے کر آئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا ان کی بدمعاشی تھی۔ وہ کچھ رشوت یا بھتہ لینا چاہتے تھے کیونکہ اس پروگرام کی بہت تشہیر ہو چکی تھی اور میری شاعری کی کتاب کا افتتاح بھی اسی پرفارمنس کے بعد ہونا تھا۔ اس کتاب کے ٹائٹل اور اس کی تشہیر کئی دنوں سے چل رہی تھی اور وہ اسی پروگرام کا حصہ تھا۔ کتاب انڈیا سے شائع ہو کر آ چکی تھی۔ گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں اس موقع پر ''بک سائننگ'' کی تقریب بھی ہونی تھی۔

سرکاری محکمے کی مداخلت کی وجہ سے یہ پروگرام کچھ تاخیر سے ہوا۔ چونکہ یہ جرمنی کا ادارہ ہے تو اس لئے بہت جلدی ان کی چھٹی ہو گئی۔ پروگرام شروع ہوا تو مجھے محسوس ہوا ہال مکمل طور پر کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ سیڑھیوں پر بھی لوگ موجود تھے۔ ہمیں یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ دعوت نامے مزید شائع کرنے پڑے تھے کیونکہ ہر طرف سے اس کے حصول کے لئے سفارشیں آ رہی تھیں۔

اس کی وجہ صرف ایک تھی کہ شدید اور حبس کے مارشل لاء کے بعد لوگوں کو اس کے ذریعے تازہ ہوا کی امید محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ باہر کے میڈیا کی بازگشت سے لاہور کے ترقی پسند صحافی اور کالم نگار مکمل معلومات رکھتے تھے اس لئے لاہور کی فضا میں گویا انہیں انقلاب کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اپنے فکری اور ذہنی کیتھارسس کا انہیں یہ اچھا موقع محسوس ہوا۔ دپتی نے لاہور کے حوالے سے جو بھی کتھا ہم نے سوچی تھی اس پر کتھک کے بعض انوکھے اور مشکل زاویے بھی دپتی نے تخلیق کئے تھے۔ مثلاً حسن ناصر اور بھگت سنگھ کی شہادتوں کو جس زاویے سے پرفارم کیا وہ تو دیکھنے والوں کے لئے بے حد جذباتی اور فن کی معراج کو تشکیل دے رہا تھا۔ دپتی کے پاؤں اور جسم کے تمام اعضاء الگ الگ اپنے ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ میری شاعری کی آرکسٹرائزیشن کتھک کے ساتھ لوچ پیدا کر رہی تھی۔ دونوں الگ الگ نہیں تھے، ایک دوسرے کا حصہ بن کر محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا اندازہ دیکھنے والوں کی تالیوں اور والہانہ داد سے محسوس ہوا۔ مارشل لاء کے گیارہ سالوں کا زہر اس ایک شام میں ہم نے چوس لیا تھا۔ ہمارے سازندوں نے اپنے فن کے ارتقاء کو چھو لیا تھا۔ اس کی مثال ہمارا طبلہ نواز تھا جس نے شاہی قلعے کے سناٹے اور بھگت سنگھ کی پھانسی کے وقت کو طبلے سے تخلیق کیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا یہ منظر ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ مارشل لاء کے خلاف عوامی مظاہروں اور ان پر چلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ کو طبلے نے ایسے مجسم کر دیا کہ

سب کی رگوں میں خون سرگوشیاں کرنے لگا تھا۔ اس طرح ایک منظر کوڑے لگانے کا تھا جو صحافیوں اور دانشوروں کو سٹیڈیم میں لگائے گئے تھے جن میں ایک معذور صحافی بھی شامل تھا۔ جب میری شاعری کا بیان اس مقام پر آیا تو دیپتی نے اپنے جسم کو اس طرح کتھک کے حوالے کیا جیسے اسے کوڑے لگ رہے ہوں اور کتھک کے فن کو بھی اس نے بچالیا تھا۔ اس کے اندر لاہور اور پاکستان کی شاموں اور گھروں میں خوف کے گیارہ سالوں کو میں نے اپنی شاعری میں جس طرح تخلیق کیا تھا اور ادب کے ساتھ فنونِ لطیفہ کو کیسے زنجیریں پہنائی گئی تھیں۔ وہ شاعری میں تو آسانی سے لایا جاسکتا تھا لیکن کتھک میں اس کو جذب کرنا یہ دیپتی کا کمال تھا۔ میری شاعری کے ایک ایک لفظ پر وہ بحث کر کے سیکھتی تھی اور پھر وہ اس کے معنی کو اپنے فن کے ذریعے اُجاگر کرنے کا جتن کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک نازک جسم تھا لیکن اس جسم کو وہ سو سو طرح سے روپ دینا جانتی تھی۔ میرے لفظ اور اُن کا مفہوم گویا اُس کی ہڈیوں میں گودا بن کے بسرام کرتا تھا۔ ظالم نے ناظرین کے دل، دماغ، آنکھیں اور روح کو اپنی مٹھی میں قابو کرلیا تھا۔ یہ تجربہ لاہور کے ذہین اور اعلیٰ دماغ طبقے کے لئے بے حد ضروری بھی تھا اور اُن کے تجسس کو نئی راہیں بھی دکھا سکتا تھا۔ جو خواہش دیکھنے والوں کو اس آڈیٹوریم میں لے کر آئی تھی وہ مارشل لاؤں کے دیئے ہوئے زخموں پر نوحہ گری کے ساتھ اپنی طاقت کو مزاحمت کے لئے استعمال کرنے کے نئے سے نئے میڈیم کی تلاش تھی۔ اس مقصد میں یہ شام کامیاب ثابت ہوئی۔ شاعری، موسیقی اور ڈانس کے میڈیم ایک جگہ استعمال ہو رہے تھے۔ سٹیج کی لائٹنگ اور ساؤنڈ کے لئے گوئٹے انسٹیٹیوٹ نے جرمنی سے ماہرین کو بلایا ہوا تھا جو اتفاق سے اس وقت کسی پروجیکٹ پر انڈیا میں کام کر رہے تھے۔ ان کا تکنیکی اور تخلیقی تجربہ شیکسپیئر، سال بیلو، بریخت، سیموئل بیکٹ اور وکٹر ہیوگو کے تھیٹر سے تعلق رکھتا تھا اس لئے وہ معانی کی تہہ تک جا کر اسے لائٹ اور ساؤنڈ کے ذریعے دیکھنے والوں کے احساس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ پاکستان میں وہ سہولتیں تو موجود نہیں تھیں جو انڈیا کے تھیٹر تک پہنچ چکی تھیں پھر بھی انہوں نے اپنے ساتھ کچھ ایسا بنیادی تکنیکی سامان رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی معجزہ دکھا سکتے تھے۔ یہ تجربہ دیکھنے والوں نے محسوس کیا۔ اس شو میں وقفہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ نہ لندن میں ایسا ہوا، نہ انڈیا میں ہم نے ایسا ہونے دیا اور نہ ہی لاہور کے اس شو میں ایسا سوچا گیا تھا اور دیکھنے والوں کو جو پروگرام دیا گیا اس میں یہ اطلاع تھی کہ یہ پروگرام ایک دفعہ شروع ہو کر ختم ہوگا۔ اس کا نتیجہ ہمیں معلوم تھا کہ دیکھنے والوں کی توجہ اور بیانیے کا تسلسل ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے۔ یہی ہوا کہ جونہی یہ پروگرام شروع ہوا، اسے تھیٹر کے کھیل کی طرح سب نے قبول کرلیا۔ گویا وہ سٹیج کے جادو میں گم

ہو گئے۔ ہر شخص خود کو اس تھیٹر پرفارمنس کا حصہ سمجھنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ وہ سب ہمارے اندر سانس لینے لگے تھے۔ پورا آڈیٹوریم ایک روح ایک جان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا علم اور احساس مجھے کئی دنوں بعد تک ہوتا رہا تھا۔ میں خود ایک ایسے شاعر میں تبدیل ہو چکا تھا جو اپنے ہر لفظ میں دھڑک رہا تھا۔ کئی بار ادائیگی میں میری آواز رُندھ جاتی تھی۔ میں رکتا تھا کہ میں رونا چاہتا تھا مگر سکرپٹ میں رونا شامل نہیں تھا۔ جب میں رکتا تھا اور پھر رواں ہوتا تھا تو لوگ خود اس کیفیت میں آ چکے ہوتے تھے اور تالیاں بجانا بھول جاتے تھے کہ وہ میری طرح ہو جاتے تھے اور پھر دپتی میری آواز کے ساتھ جسم کو شامل کر رہی تھی۔ تو جب میری آواز بھرا جاتی تو اس کے پاؤں بھی بھرا جاتے اور اسی حساب سے وہ پھر سے رواں ہوتے۔ یہ عجیب وغریب جذبات اور جزئیات کا کھیل تھا جس کا اظہار صرف اُس وقت اور اُس جگہ ہی ہو سکتا تھا۔ پرفارمنس کے سمے ہم سب سٹیج پر ایک ہو جاتے تھے اس لئے ہمیں پتہ چل جاتا تھا کہ جسم کیا کام کر رہا ہے اور ناظرین اُسے کس طرح وصول کر رہے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا لاہور کے اس پروگرام میں مجھے جاننے والے بھی ہوں گے۔ اس لئے کہ میں ایک ابھرتا ہوا شاعر ضرور تھا لیکن اُڑتے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ میں پاک ٹی ہاؤس میں نو وارد تھا بلکہ آتے جاتے، بیٹھتے اٹھتے سال دو سال معمولی بات ہوتی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس میں قدم جڑیں پکڑتے تھے کوئی نو دس سالوں میں۔ یہ جملہ انتظار حسین کا ہے اس لئے کہ یہ وہ فضا تھی جہاں کسی کو سمجھنے اور پہچاننے میں کئی حوالے درکار ہوتے تھے۔ ایک تو ادبی رسائل، دوسرے راتوں کا رتجگا کہ کون ناصر کاظمی کے ساتھ جاگا، کون انتظار حسین کو گھر چھوڑ کے آیا، سند ملتی تھی ان لوگوں سے۔ اس لئے میری تو کوئی اوقات ہی نہیں تھی اس لئے میں کسی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ میرے پرستار قسم کے لوگ اِدھر آئے ہوں گے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا جلاوطنی کے قصے لوک داستانوں میں بدلے ہوں گے کہ نہیں۔ ان گیارہ بارہ سالوں میں کون شاعر آئے ہوں گے۔ کس طرح کے لکھنے والوں نے جستجو کی ہوگی اور کتنے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی خبر رکھتے ہوں گے۔ میں یہاں دپتی کے فن کے قدردانوں کے حوالے سے موجود تھا۔ کوئی میرے لئے یقیناً نہیں آیا تھا۔ سب تک انڈیا سے شہرت یہاں پہنچی تھی اور یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ادیب، شاعر، فن کار اپنی کم مائیگی اور اپنی حسرتوں کا تماشا ہمسایہ ملک کی طرف جھانک کے کیا کرتے تھے۔ زخم اور بھی گہرے ہو جایا کرتے تھے۔ اگر دپتی کی تھیٹر کمپنی لندن سے نہ ہوتی تو اسے کبھی بھی یہاں پرفارمنس کی اجازت نہ ملتی۔

اب جب ہماری پرفارمنس کو ہال میں موجود مکمل سپردگی کے ساتھ محسوس کیا گیا تھا تو اس کی خبر تو

ہم سب کو سٹیج پر ہو چکی تھی۔ داد کے لمحے ہوا کرتے ہیں۔ داد بس ان لمحوں میں اُٹھتی ہے یا نہیں اُٹھتی۔ سو ہمیں سٹیج پر ہی احساس ہو چکا تھا کہ ایک ایک لفظ دیکھنے والوں کی ترجمانی کرر ہا تھا۔ پردہ گرا اور پھر اٹھا تو دیپتی مجھے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے سامنے لائی۔ ہم نے جھک کے سب کی محبت کا جواب دیا۔ تالیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں اور لوگ ہال سے جانے کو تیار نہیں تھے۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب کسی بے حد جذباتی اور گھمبیر تاثر کی حامل فلم کا انجام اچانک غیر متوقع طریقے سے سکرین پر آجاتا تھا تو دیکھنے والے فلم ختم ہونے کے بعد بھی اپنی سیٹوں سے اٹھ نہیں پاتے تھے اور اپنے کیتھارسس کے بعد کچھ وقت اپنے جذبات کے دریا کی واپسی کے لئے ضرور گزارتے تھے۔ یہاں بھی وہی کیفیت سامنے تھی۔ جب اس طرح کی کیفیت ذرا مدھم پڑی تو لوگ باہر کی جانب نکلے اور اس جگہ پر جہاں میری کتابوں کا سٹال لگا ہوا تھا، جمع ہونا شروع ہوئے۔ کتاب کا ٹائٹل اور طباعت انڈیا کے اشاعت گھر سے ہوا تھا اس لئے اس میں ایک انفرادیت تھی۔ کسی پینٹر نے کتاب کا ٹائٹل بنایا تھا جو مارشل لاء کے ضابطوں، کوڑوں، پھانسیوں اور حبس کے ماحول کو محسوس کرا رہا تھا۔ بس کتاب نے توجہ حاصل کر لی تھی۔ جب میں کرسی پر آ کر بیٹھا اور میرے پیچھے دیپتی کھڑی ہوگئی تو یہاں قطار بنانے کا تو رواج ہوتا نہیں تھا، بس جو کتاب سامنے آئی، میں دستخط کرتا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس میں میری شاعری کا جادو کم ہے اور دیپتی کے کتھک کے مختلف زاویوں کا اثر زیادہ ہے۔ لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے اور میں دستخط کئے جا رہا تھا۔ اگرچہ اس کام کا یہ وقت ہم نے غلط منتخب کیا تھا۔ عام طور پر کھیل کے ختم ہونے کے بعد کوئی رُکتا نہیں ہے اور کتاب کا لانچ الگ سے ایک واقعہ ہوا کرتا ہے لیکن یہاں معاملہ یہ تھا کہ ہمیں اگلے روز لندن واپس جانا تھا اور گوئٹے انسٹیٹیوٹ نے یہ ذمہ داری بس کل تک کی لی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کون کتاب پر دستخط لے رہا ہے، کون کس عمر اور حلیے کا ہے، بس میں دستخط کرتا رہا۔ آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک کتاب سامنے آئی تو آواز بھی آئی، میں آپ کی کلاس فیلو تھی ایم اے میں۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، پہچاننے کی کوشش کی۔ میرا نام صائمہ ہے۔ وہ میں کلاس میں برقعہ پہنتی تھی اور سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھتی تھی۔ آپ نے ایک بار مجھے لائبریری میں دیکھ لیا تھا، نقاب الٹا ہوا تھا، اب دیکھ لیں میں اب کیسی ہوں۔ میں نے دستخط کرنے سے پہلے اس کا نام لکھا اور مسکرا دیا۔ وہ خوشی سے دہری ہوگئی اور پھر کسی اور کتاب نے اس کی جگہ لے لی۔ ایسے ہی ایک اور آدمی بولا میں آپ کا ہمسایہ تھا، آپ جہاں سے سبزی لیتے تھے، میں بھی لیتا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ میں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں، نام میرا بشارت ہے۔ میں نے نام لکھ کر دستخط کر دیئے۔ ایسے ہی دو تین اور لوگوں

نے بھی اپنے نام بتائے۔ وہ اس لئے کہ کتاب پر آٹو گراف نام کے ساتھ ہوں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ رائٹر نے یہ کتاب اسے خود پیش کی ہے۔ اس طرح کتاب کا رتبہ بڑھ جاتا ہے۔ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کا رتبہ بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ اب میں آوازوں کو سنتے ہی نام لکھ لیتا تھا۔ اس طرح جس نے کتاب خرید کی ہوئی تھی اسے اس کی پوری قیمت میرے دستخط سے وصول ہو جاتی تھی۔

آہستہ آہستہ کتابوں پر دستخطوں کا سلسلہ ختم ہونے لگا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں نے دیکھا دیپتی وہاں میرے ساتھ تھی۔ گوئٹے انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر وہاں تھے۔ ان کا عملہ بھی تھا اور یہ اب رات ہونے کے بعد کا کوئی وقت تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا کہ ایک لڑکا میری کتاب لے کر میرے سامنے آیا۔ اس کی عمر گیارہ سال کے آس پاس ہو سکتی تھی مگر مجھے اس کا اندازہ اس وقت نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ایک لڑکا کتاب لے کر آیا اور میں سوچ رہا تھا اس لڑکے کو میری شاعری میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی دکھائی نہیں دیا تو میں نے پوچھا ''بیٹا آپ کا نام؟''

اس نے نام بتایا جس میں میرا نام بھی شامل تھا تو میں نے اسے دیکھا، دیکھتا رہ گیا۔ جسے میں پالنے میں چھوڑ گیا تھا، یہ تو وہی تھا، وہی نقش، وہی سب کچھ۔ میں نے پوچھا ''ممی پاپا کے ساتھ آئے ہو؟''

اس نے اشارہ کیا وہ میرے ممی پاپا کھڑے ہیں۔ میں نے دور دیکھا۔ برآمدے کے آخر میں دو جسم کھڑے تھے۔ بس اتنا اندازہ لگا سکا کہ وہ وہی تھی جو میری بیوی تھی اور اب وہ اپنے خاوند آرمی افسر کے ساتھ تھی جو اس کا کزن تھا اور اسے پسند کرتا تھا۔ میں نے لڑکے کو دیکھا جو اب میرا بیٹا نہیں رہا تھا۔ میں اسے پیار کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا۔ اس کے ہاتھوں کو چھوا بس کتاب دیتے ہوئے۔ گویا اسے اپنا سب کچھ دے دیا اور اس ایک لمحے میں میرا سب کچھ چھن گیا۔ اچانک دیپتی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جب کھولیں تو وہ لڑکا اپنے ممی پاپا کے پاس جا چکا تھا۔ دیپتی نے سب جان لیا تھا۔ اس نے مجھے اُٹھایا اور کہا وہ گاڑی ہے۔ ہم بیٹھ گئے۔ مال روڈ کی روشنیاں آگے پیچھے تھیں اور میں لاہور کے شاہی قلعے میں ایک پھر داخل ہو رہا تھا۔ اب کی بار معلوم نہیں تھا زندہ نکلوں گا کہ نہیں۔

....
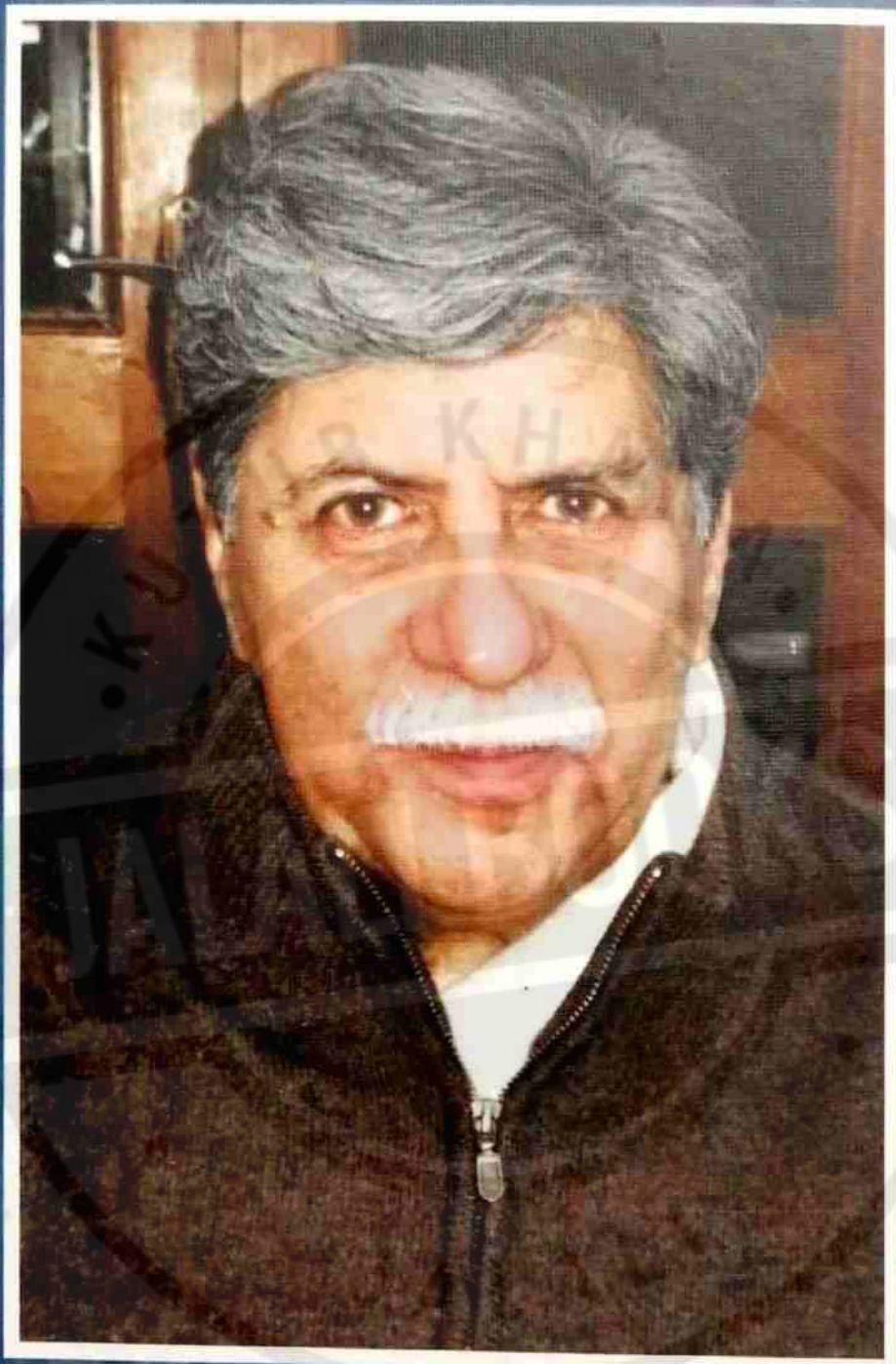
Rs. 1400.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3478-6
ISBN-13: 978-969-35-3478-8
9 789693 534788

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور